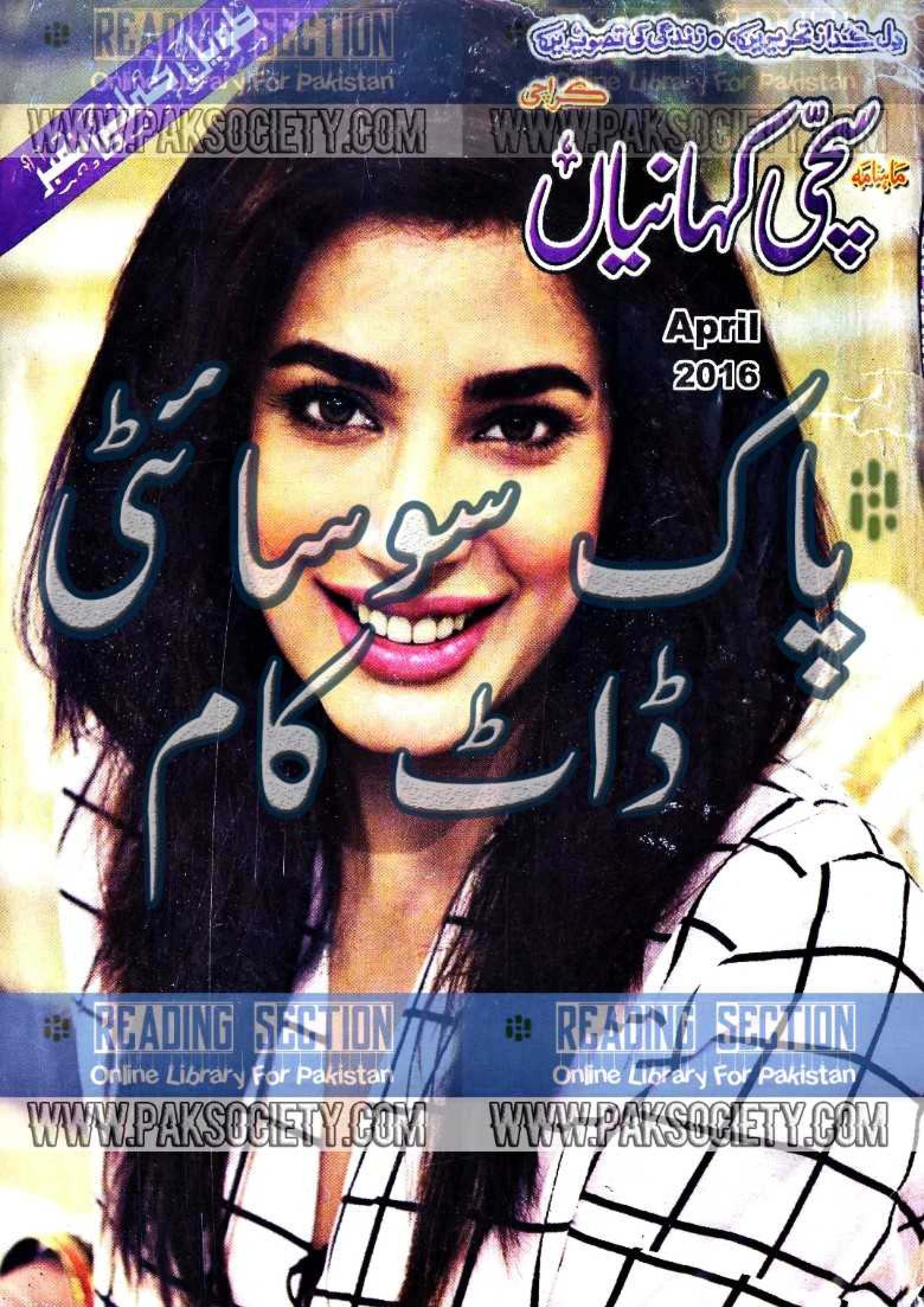

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں
کراچی
ماہنامہ
سچی کہانیاں
April
2016

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

منیجر مارکیٹنگ
021-35893121

منیجر سرکولیشن
0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✵ جلد: 33 ـ شمارہ: 04 ✵ اپریل: 2016ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔



فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی



...رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

دُنیا میں کس جگہ

سچّی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچّی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچّائیوں کو برتتے' دیکھتے' محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچّی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچّی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچّی کہانیاں" میں آپ بیتیاں' جگ بیتیاں' اعترافات' جرم و سزا کی کہانیاں' ناقابلِ یقین کہانیاں' دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچّی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

تبدیلی

خان صاحب نے تبدیلی کا نعرہ لگایا اور لوگ جوق در جوق ان کے ساتھ چل پڑے...... کیونکہ ہر شخص تبدیلی چاہتا تھا' ہر پاکستانی ملک میں جاری فرسودہ نظام میں تبدیلی دیکھنے کا خواہاں تھا...... یوں خان صاحب کا قافلہ بڑھتا چلا گیا...... دور دراز علاقوں سے لوگ خان صاحب کی ایک آواز پر لبیک کہتے آگے بڑھنے لگے...... دوسری سیاسی جماعتوں کے لیے بھی تبدیلی کا یہ نعرہ خطرے کی گھنٹی ثابت ہوا...... خان صاحب ویسے بھی ہردلعزیز شخصیت کے مالک ہیں پھر تبدیلی کے نعرے نے ان کا سیاسی قد بہت اونچا کر دیا...... مگر جلد ہی لوگوں کو ان ناچتے گاتے' ہلڑ بازی کرتے جلسوں میں جا کر اندازہ ہو گیا کہ جس تبدیلی کے خواہش مند خان صاحب یا ان کی پارٹی ہے وہ درست نہیں۔ اکثریت کا یہ ماننا ہے کہ سیاست میں سنجیدگی ضروری ہے۔ سیاست دان کا بھی سنجیدہ اور بردبار ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سیاست اور سیاست دان ہی دنیا کے سامنے پاکستان کا مثبت چہرہ لانے کے ذمہ دار ہیں۔ لہٰذا کھیل تماشے سیاست میں ناقابلِ قبول ٹھہرے۔ تبدیلی ضرور آنی چاہیے مگر مثبت تبدیلی۔ منشور خان صاحب کی پارٹی کا تھا مگر تبدیلی آ گئی ن لیگ میں...... وہ لوگ جو خان صاحب کی طرزِ سیاست سے نالاں تھے ن لیگ میں آنے والی تبدیلی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ تبدیلی بھی ایسی جس نے دورِ جہالت کے تمام بُت توڑ ڈالے۔ وہ بُت جو لوگوں نے اپنے ذہنوں میں بھی بنا رکھے تھے وہ بھی پاش پاش ہو گئے۔ سربراہِ وقت نے اپنے جانشین کے طور پر اپنے بیٹے کو نہیں بلکہ بیٹی کو منتخب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مریم نواز وزیراعظم پاکستان کی جانشین ثابت ہوں گی۔ اس کو کہتے ہیں تبدیلی جو صرف نعرے کی حد تک محدود نہ ہوں بلکہ عملی طور پر بھی ثابت ہوں۔ میں بطور پاکستانی عورت نواز شریف صاحب کی اس نوازش کا خیر مقدم کرتی ہوں۔

ہم مائیں' ہم بہنیں' ہم بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

کیسے ہیں آپ! کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ ہم سب ملیں۔ اکٹھے ہوں۔ محفلیں سجائیں۔ رس بھری باتیں کریں۔ ساون جیسی امیدوں کی ناؤ کو زات کے سمندر میں اتار دیں اور بس آپ ہوں اور ہم ہوں۔ کہنے کو بہت کچھ ہے مگر...... صرف کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ لفظ لفظ جمع کر کے احوال کی ابتداء کر رہا ہوں مگر...... یہ لفظ سمٹتے ہی نہیں۔ ہر لفظ تھوڑی دیر بعد تتلی کی صورت ورق سے آزاد ہو کر اڑنے لگتا ہے۔ بہار کی جستجو میں میں اپنے الفاظ اڑنے دیتا ہوں۔ کاش کہ میں کھنڈروں کی اس زمین پر محبت کی آبادیاں آباد کر سکوں۔ میری خواہش ہے کہ سب انسان آپس میں انسان بن کر رہیں۔ جب ہم انسان بن کر رہیں گے تب ہی تو امن کا قیام بھی ممکن ہوگا۔ اور ساتھیو! جب امن کا قیام ممکن ہوگا تب ہی تو ہم اکٹھا ہوں گے۔ محفلیں سجائیں گے۔ رس بھری باتیں کریں گے اور ہماری امیدوں کے ساون محبت کرنے والوں کی مقدس ہتھیلیاں بھگو دیں گے۔ میں نے تو اپنے دل کی باتیں کر دی ہیں۔ کیا آپ لوگ بھی میری اس امید کے لیے یقین بنیں گے...... آیئے ساتھیو! محبت کی لو سے ماتھے روشن کرتے، تتلیوں کے رنگوں کو آنکھوں میں بسائے احوال کی ابتداء کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں سب سے پہلے ہمارے احوال کے مہمان کون ہیں۔

✉: کراچی سے مومینہ بتول رضا ہماری سب سے پہلی مہمان ہیں۔ لکھتی ہیں۔ کچھ مصروفیاتِ زندگی نے رابطہ کرنے میں سستی دکھائی اور تقریباً دو ماہ سے حاضرِ محفل نہ ہو سکی مگر مطالعہ ضرور جاری ہے۔ کاش تمہاری محبت خود سے بول رہی ہے۔ کہانیوں کا معیار اور بہتر ہو رہا ہے۔ احوالی محفل بھی اچھی جا رہی ہے تمام دوستوں کو سلام محبت۔ اس مرتبہ بھی تبصرے جاندار ہیں۔ جنوری فروری کے دونوں شمارے بہت اچھے لگے اور دل سے تمہارے لیے دعا نکلی۔ اس مرتبہ ایڈیسن صاحب کی ایک خبر اور بازی لے گئی کیونکہ یہ آج کل ہمارے معاشرے کی زندہ حقیقت ہے...... کاش...... ایم یعقوب صاحب کی 'آستین کے سانپ' نے کوئی تاثر نہ چھوڑا نہ ہی نعمان اسحاق صاحب کی 'بادبان' نے متاثر کیا۔ باقی کاوشیں اچھی

رہیں اور جناب آپ کی کاوش زہرِ عشق بھی۔ محویت قائم کردیتی ہے۔ اچھے جارہے ہو کاشی۔ گر بُرا نہ مانو تو۔ عرض ہے کہ 'لائف بوائے والا سلسلہ' اب کچھ بور کرنے لگا ہے۔

☆: اچھی بہن! سلامت رہیے۔ آپ کی تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ باقی دیگر تجاویز کے لیے عرض یہ ہے کہ کچھ پروفیشنل چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ سو......

✉: گاؤں سیداں کمال۔ راولپنڈی سے یہ پہلی آمد ہے۔ طالیہ داؤد کی۔ لکھتی ہیں۔ میرا نام طالیہ داؤد ہے میں گاؤں سیداں کمال میں رہتی ہوں۔ مجھے کہانیاں پہلے بہت اچھی لگتی تھیں میں پڑھتی تھی۔ لیکن پھر جو کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ کہانی میں نے پہلی بار آپ کے ڈائجسٹ میں لکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میری کہانی پسند آئے گی اور ضرور شائع ہوگی۔ میں نہم کلاس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ اب میرے امتحان ہونے والے ہیں۔

☆: اچھی گڑیا! خوش آمدید! کہانی پڑھ کر رائے دیں گے۔ احوال میں ضرور شرکت کرو۔ یہ رابطوں کی کہکشاں ہے۔

✉: کراچی سے نسیم سحر نے ہمیں یاد کیا ہے۔ لکھتی ہیں۔ اب عرض یہ کرنا ہے اگر کوئی آپ کو کہانی بھیجتا ہے اور اگر وہ قابلِ اشاعت ہے تو آپ شائع کردیں اور اگر نہیں ہے تو پھر فون کرنے پر بتادیں کہ نہیں چھپ سکتی تاکہ انتظار کی اذیت ختم ہوجائے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ مختلف موضوع پہ لکھوں لیکن آپ لوگ حوصلہ افزائی ہی نہیں کرتے۔ عورت کو صرف یہ مسئلہ نہیں ہے کہ اس کو ماموں یا چچا کے بیٹے نے پسند نہیں کیا۔ عورت کو بے شمار مسائل ہیں اور ہمیں ان کو اجاگر کرنا چاہیے اور یہ کام آپ لوگ بہت بہتر کرسکتے ہیں۔ خیر مزید کہانیاں بھیج رہی ہوں امید کرتی ہوں آپ کو پسند آئیں گی۔

☆: اچھی بہن! ہم نے سچی کہانیاں کے علاوہ دوشیزہ میں بھی آپ کو شائع کیا۔ اگر ہم حوصلہ افزائی نہ کرتے تو پھر یہ نئے رائٹرز کی کھیپ کیوں نظر آرہی ہوتی۔ احوال سے دوری آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی مثال ہوجاتی ہے۔ ہمیشہ فون پر آپ کو سراہا ہے حوصلہ افزائی کی ہے مگر آپ کا گلہ...... جلد کہانیاں اشاعت کے مراحل طے کریں گی۔

✉: ڈیرہ غازی خان سے ہماری بہت اچھی بہن ارم خان عرض گزار ہیں۔ آپ کا بے حد شکریہ کہ میری کہانی کو ایوارڈ یافتہ کہانیوں میں شامل کیا مجھے تو یقین ہی نہیں ہورہا تھا کہ میری کہانی یہ مقام حاصل کرسکتی ہے۔ بھیا جی بے حد شکریہ۔ اب آتی ہوں شمارے کی طرف۔ رسالہ ملتے ہی اپنے من پسند سلسلے احوال کی طرف دوڑ لگائی ہر ماہ کی طرح اس بار بھی کچھ نئے لوگوں کو احوال میں شامل پایا۔ خوش آمدید۔ اب ذکر ہوجائے ان پیارے پیارے بہن بھائیوں کا جنھوں نے مجھے یاد رکھا۔ منزل خان آپ کے مشورے پر ہم عمل نہ کریں کیسے ہوسکتا ہے۔ عظمیٰ شکور بہنوں کو تھینکس نہیں کہتے۔ سونیا خان، اچھی بھابی صائمہ مجید، بھائی سید ملازم حسین شیرازی، مجید احمد جائی، راشد لطیف، ڈاکٹر خادم

حسین کھیڑا۔ اچھے بہن بھائیو میرے تبصرے کو پسند کرنے کے لیے اور مجھے یاد رکھنے کے لیے بے حد شکریہ۔ جس طرح مجھے آپ سب یاد رکھتے ہیں اسی طرح دعاؤں میں بھی رکھا کریں۔ ایم یعقوب بھائی میں ٹھیک ہوں اور ہر ماہ سچی کہانیاں میں حاضر ہوتی ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔ اللہ پاک آپ کو اچھی صحت نوازے آمین۔ کہانیوں میں 'یہ دوستی ہے' ڈراپ سین' ناسور' فاطمہ گل' قسمت کے کھیل نرالے ہیں' کوئی خوشیاں لادے' روایات کی دلدل' آپ اپنے دام میں' قاتل' تلاش' بلند بخت' ذرا سی غلطی' ایک چھوٹی سی نیکی' ازالہ' وہ کون تھی' پڑھی زبردست۔ بھیا جی بے حد شکریہ آپ نے میری دوسری کہانی کو بھی سچی کہانیاں میں جگہ دی ایک بار پھر بے حد شکریہ۔ حبیب الرحمن بھائی معذرت کیوں؟ بھائی بہنوں سے معذرت کر کے بہنوں کو شرمندہ نہیں کرتے۔ اللہ پاک آپ کو بہت جلد رہائی دے گا انشاء اللہ۔ وہ بڑا ہی رحم کرنے والا ہے اس کے بندے کے مانگنے میں دیر ہے اس کے عطا کرنے میں نہیں۔ پراسرار کہانیوں میں سترہواں مسافر، مجھے معاف کر دو' روم نمبر 607' بھوک' عرشی کون تھی' ہانڈی' سرخ لیموں' تمہارے ساتھ ساتھ' دوسری دنیا کا عشق' اچھی کہانیاں تھی جن کے نام نہیں لکھ سکی ان تمام سے معذرت۔ اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

☆: پیاری ارم! مارچ کے شمارے میں اپنی کہانی دیکھ کر یقیناً تم خوش ہوگئی ہوگی۔ تبصرے کا شکریہ۔ بیٹا تم سب کی محبت پرچے کو چار چاند لگاتی ہیں۔ خوش رہو، خوشیاں بانٹتی رہو۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن سیمیں غزالہ نیہاں کی۔ لکھتی ہیں۔ میری کہانی 'کنیز' شائع کرنے اور ایوارڈ کے لیے منتخب کرنے کا بہت شکریہ۔ پچھلے دو مہینوں سے بہت مصروفیت رہی۔ خاندان میں شادیاں۔ نئے مہمانوں کی آمد اور جرمنی سے آئے ہوئے بیٹے بہو کی مہمان داری سے اتنا وقت نہیں ملا کہ سنجیدگی سے ''سچی کہانیاں'' کا مطالعہ کر سکتی۔ بس جلدی جلدی میں پڑھ لیا۔ اب سب تقریبات ختم ہوئی اور مہمانوں کے جانے کے بعد فروری کا شمارہ تفصیل سے پڑھنے کے بعد آپ کو خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت، بیماروں کے لیے دعائے شفا اور جن کو خوشی نصیب ہوئی ان کو مبارک باد کے بعد سب سے پہلے منزہ سہام مرزا کا ''اسمارٹ فون'' پڑھا واقعی سچ کہا منزہ نے۔ اس کے بعد اسماء اعوان صاحبہ لائف بوائے شیمپو سے رشتوں ناتوں کی دھول صاف کرتی نظر آتی ہیں۔ جیسے لائف بوائے شیمپو سے بال دھل کر صاف ستھرے سلکی اور شائن نظر آتے ہیں اسی طرح آپس میں جڑے رشتے بھی صاف شفاف اور پرخلوص کر کے دکھا رہی ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ محمد سلیم اختر کی 'یہ دوستی ہے' بہت اچھی لگی۔ اقبال بانو صاحبہ کا 'ڈراپ سین' بہترین کہانی تھی۔ رئیسہ خالد صاحبہ کی 'ایک چھوٹی سی نیکی' نے بھی بڑا متاثر کیا۔ اسی طرح ممتاز احمد صاحب کا 'ازالہ' بھی بہت اچھا لگا۔ ثنا کنول کی 'ذرا سی غلطی' نے بھی متاثر کیا۔ باقی سب کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ 'سچی کہانیاں' میں اچھی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔ 'ہم شکل' اور 'زہر عشق' پر ہم جیسے طفل مکتب

سانحہ ارتحال

ہمارے بہت عزیز لکھاری اور شاعر ساتھی عبدالعزیز جی آ کی والدہ گزشتہ ماہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں عبدالعزیز جی آ کے ساتھ ہے۔اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

تبصرہ کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ تو خود اپنی مثال آپ ہیں۔ آخر وہ ایم اے راحت اور کاشی چوہان جیسے بڑے ادیبوں کے قلم کی کاوش ہے۔

☆: پیاری بہن! کہانیاں جلد شائع ہوں گی ۔ مہمان داری سے بڑی ذمہ داری اور کیا ہوگی بھلا۔ایوارڈ آپ کا حق تھا۔

✉: ہماری ساتھی لکھاری کرن شبیر کراچی سے ایک عرصے بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ سلام سر! امید کرتی ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ بہت عرصے بعد احوال میں احوالی بن کے آئی ہوں۔خوش آمدید نہیں کہیں گے۔لیکن ایک قاری کی حیثیت سے ہمیشہ ساتھ ہوں۔سرورق ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔احوال سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے اسماء اعوان کے لیے 'لائف بوائے' ایوارڈ تو بنتا ہے۔سلیم اختر صاحب کا تحفۂ خاص واقعی اس شمارے کا شاہ کار تھی۔'ناسور' 'ڈراپ سین' عمدہ رہیں۔'فاطمہ گل' میرے کشمیر کی ننھی شہزادی پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ثمینہ فیاض فرسودہ معاشرے کی روایات کی عکاسی کرتی نظر آئیں۔ایم یعقوب، ضرغام محمود اچھے انداز میں آئے، ایم اے راحت سر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔جس کہانی کو پڑھ کے ایک پل دل کی دھڑکن رک سی گئی وہ تھی ایڈیسن ادریس کی 'ایک خبر' اور 'ارم ناز، فوزیہ، حنا بشریٰ ہمیشہ کی طرح خوب سے خوب تر رہے۔ بھارت میں بلیک لسٹ، محمود شام زبردست، مقصود احمد بلوچ، شانی خامان، نوشابہ صدیقی، ثناء کنول، رئیسہ خالد، الماس فاطمہ تمام لوگوں کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔زہرِ عشق پہلی قسط سے جو سحر میں جکڑا اس کی گرفت اب تک مضبوط ہے۔ جاوید راہی بیک وقت خوف تجسس سے بھری کہانی لے کر حاضر ہوئے۔نعمان اسحاق 'بادبان' کے ساتھ تشریف لائے اس پر تبصرہ ادھار۔ بابا جی خلق خدا کے جیسے کام آرہے ہیں اس کا اجر انھیں دعاؤں میں ملے گا۔ خدا ہمیشہ انھیں تندرست رکھے آمین۔ہم جیسے بہت سے نوآموز لکھاریوں کے لیے 'سچی کہانیاں' ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔

☆: پیاری کرن! گڑیا ویلکم بیک ٹو۔اب تم آ گئی ہو تو بس اب آمد مستقل بناؤ اور انشاء اللہ کہانیاں بھی جلد اشاعت پذیر ہوں گی۔

✉: جہانیاں منڈی ضلع وہاڑی سے پہلی پہلی آمد ہے ایم عاصم بوٹا صاحب کی ۔ لکھتے ہیں۔جناب میں تقریباً عرصہ 10 سال سے میں اپنے قلم کو حرکت دے رہا ہوں۔ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کا تعارف، تعریفی انداز میں بہت سارے دوستوں سے ہو چکا تھا۔ بہت سارے

دوستوں نے اس میں لکھنے کی رائے سے بھی نوازا تھا۔ خاص کر جناب محترم رفعت محمود صاحب نے 'سچی کہانیاں' میں لکھنے کا بھرپور انداز میں کہا ہے۔ ایک شام میں دن بھر کی مصروفیات کے بعد جہانیاں منڈی سے ماہ جنوری کا پرچہ خریدا جیسے ہی مطالعہ کے لیے ورق گردانی کی تو بہت سارے چہروں کو اپنی جان پہچان والے پایا۔ کاشی چوہان صاحب اس بار ایک لیٹر کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ امید ہے میری اس کوشش کو ردی کی ٹوکری کی نظر کر کے حوصلہ شکنی نہیں کرو گے۔ زندگی نے وفا کی تو بہت جلد ایک کاوش لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔

☆: پیارے بھائی بوٹا عاصم! خوش آمدید۔ آپ کا تعارف تو ہو گیا۔ اب ذرا دیکھیں آپ کی تحریر میں کتنا دم ہے۔ انتظار رہے گا۔

✉: سرگودھا سے ہمارے بہت ممتاز لکھاری ممتاز احمد شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ مارچ کا شمارہ پُراسرار نمبر موصول ہوا اس بار ٹائٹل بہت ہی دلنشین اور جاذب نظر تھا۔ اداریہ میں منزہ بہنا نے ''الفاظ کھو گئے'' کے عنوان سے مرحومہ فاطمہ ثریا بجیا کو خراج عقیدت کے ساتھ اُن سے وابستہ اپنی بے پناہ محبتوں کا ذکر کیا۔ احوال میں کاشی بھائی نے بھی اُن کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ ماشاء اللہ سچی کہانیاں دن بدن خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یار کاشی ایک بات تو بتائیں پُراسرار نمبر پڑھ کر مجھے تو اب یہ محسوس ہونے لگا ہے کہیں آپ میں کسی جن کی روح تو نہیں آ گئی؟ اتنا کام اور پھر دن بدن احوال میں دوستوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ پاک آپ کو نظر بد سے ہمیشہ بچائے۔ آمین۔ احوال سب دوستوں، بہن بھائیوں کے خوب صورت خطوط اور تبصروں سے جگمگا رہا تھا۔ سب سے پہلے میں تہہ دل سے انتہائی ممنون و مشکور ہوں۔ اُن تمام بھائیوں اور بہنوں کا جنھوں نے میرے خطوط اور کہانی کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ کنول عمران خان شادی کی سال گرہ مبارک ہو۔ زرینہ جو نیجو، سنبل بہن، نازیہ بتول رضا بہت بہت شکریہ خیر مبارک۔ بہت ہی پیاری بہن اُم ادل احوال میں آپ کا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ محترم حبیب الرحمن، محترم ملازم حسین شیرازی صاحب آپ سب کی دعاؤں میں شامل ہیں۔ ہماری قابل صد احترام بہن محترمہ پروفیسر صفیہ سلطانہ ایک عرصے کے بعد تشریف لائیں۔ آپ کا خوب صورت اشعار سے مزین خط احوال کی زینت بنا آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ عمارہ ناز کو احوال میں خوش آمدید آپ کا بے حد شکریہ جو آپ میری کہانیاں سب سے پہلے اور شوق سے پڑھتی ہیں۔ لائف بوائے کمرشل کہانی حسب معمول زبردست رہی۔ محترم سلیم اختر کی کہانی ''سترہواں مسافر'' کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ حنا بشریٰ کی ''مجھے معاف کر دو'' پُراسرار نمبر کی واقعی خاص اور لاجواب کہانی تھی۔ روم نمبر 607، گم شدہ چہرہ، بھوک، عرشی کون تھی، ہانڈی، سرخ لیموں، دوسری دنیا کا آخری عشق، بہترین کہانیاں تھیں۔ علی حسنین تابش

مبارک باد

ہمارے دیرینہ رفیق ہر دل عزیز' سدا بہار لکھاری محمد سلیم اختر صاحب کی چھوٹی بیٹی جویریہ سلیم کی شادی خانہ آبادی گزشتہ ماہ 18 مارچ کو انجام پائی۔ ادارہ اس پُرمسرت موقع پر سلیم اختر اور ان کے اہلِ خانہ کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

''سنپولیے'' نازیہ بتول رضا ''تمہارے ساتھ ساتھ'' فرح انیس کی ''آٹھ کہانیاں اِک کردار، نزہت ناز کی اِک پل میں سب کچھ' تحسین جونیجو کی 'مہاتناگ' اچھی کہانیاں تھیں۔ کیسا یہ راز، ہماری ادھوری کہانی، سب کچھ تیرا ہے، وہ بڑھیا کون تھی؟ نجات، بیٹا دے یا...... مایا، چھل پیری، حلوہ کھاؤں گی، پراسراریت سے بھری عمدہ کہانیاں تھیں۔ بادبان ابھی نہیں پڑھ سکا۔ جاوید راہی کی ''منی باجی'' ایک عبرت انگیز کہانی تھی۔ ہائیڈ پارک میں خضر حیات، مسز نگہت غفار، ریاض حسین تبسم، فرح انیس اور صائمہ بشیر کے انتخاب بہت بہترین اور لاجواب تھے۔ محمد قاسم خان بلوچ، علی حسنین تابش اور روبینہ ناز روبی کی شاعری بہت شاندار تھی دل میں اُتر گئی۔ شائلہ اختر اور حنا لطیف کے لطیفے مزے کے تھے۔ آخر میں سب دوستوں کو خلوص بھرا سلام اب اجازت چاہوں گا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو......

☆: اچھے بھیا! تبصرے کا، اتنے مزیدار تبصرے کا شکریہ...... امید ہے آپ ان نقطوں کی زبان سمجھ گئے ہوں گے۔ اگلی بار معافی نہیں ملے گی۔

✉: کمالیہ سے یہ آمد ہے ہماری نئی شاعرہ بہن، عمارہ ناز کی لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے نہ صرف میری غزل اور خط کو سچی کہانیاں کے قیمتی صفحات پر جگہ دی بلکہ خوش آمدید اور ویلکم کیا تو اب انشاء اللہ میں بھی اپنا فرض اور وعدہ نبھاؤں گی اور ہر ماہ حاضری لگواتی رہا کروں گی۔ ماہ مارچ کا پُراسرار نمبر چار تاریخ کو خریدا۔ سچی بات یہ ہے کہ پُراسرار جنوں بھوتوں اور جادو ٹونے کی کہانیاں پڑھ کر بہت ڈر لگتا ہے تو آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر پڑھنا شروع کیا ہے۔ ابھی تک چند ایک کہانیاں ہی پڑھ پائی ہوں۔ سب سے پہلے ممتاز احمد صاحب کی لکھی ہوئی کہانی حسد کی آگ پڑھی جو کہ بہت ہی سبق اور نصیحت آموز تھی۔ نازیہ بتول رضا صاحبہ کی لکھی ہوئی کہانی تمہارے ساتھ ساتھ پڑھی۔ بہت خوب بڑی شاندار کہانی لکھی انھوں نے۔ انکل محمد سلیم اختر کی لکھی کہانی سترہواں مسافر بہت لاجواب، بہترین کہانی تھی۔ علی حسنین تابش صاحب کی لکھی کہانی سنپولیے بہت اچھی کاوش تھی۔ پسند آئی۔ فرح انیس کی لکھی کہانی آٹھ کہانیاں اک کردار۔ نزہت ناز کی لکھی کہانی ایک پل میں سب کچھ اور ارم خان کی کہانی سب کچھ تیرا ہے بہت شاندار کہانیاں تھیں۔ تحسین جونیجو کی مہاتناگ بھی اچھی کہانی تھی۔ بس ابھی تک اتنا ہی پڑھ پائی ہوں۔ ہائیڈ پارک میں محمد قاسم خان بلوچ، علی حسنین تابش کی غزلیں بہت زبردست تھیں۔ پسند آئیں۔ روبینہ ناز روبی کی نظم حوا کی بیٹی بہت عمدہ کلام تھا دل میں اتر گیا۔ محمد قاسم خان بلوچ صاحب

آپ کو میری غزل پسند آئی آپ کی شکر گزار ہوں۔ آخر میں سب احوالیوں کی خدمت میں درجہ بدرجہ سلام اور آداب۔

☆: عمارہ! بیٹا آپ نے اپنا وعدہ نبھایا ہم بھی اپنا وعدہ نبھائیں گے۔ تبصرہ مختصر مگر اچھا تھا۔ آپ کی شاعری بہتر ہے۔ امید ہے کل کا بڑا نام ہماری بہن کا ہی ہوگا۔

✉: یہ احوال میں پہلی بار آمد ہے ہمارے بہت محترم شاعر خالد یوسفی صاحب کی۔ عرض کرتے ہیں۔ عزیزم کاشی چوہان جیتے رہو۔ میرا تعلق سرگودھا شہر سے ہے میں بنیادی طور پر شاعر ہوں اور شاعری سے بہت لگاؤ ہے اور اسی حوالے سے اللہ پاک نے مجھے بہت عزت دی ہے۔ ممتاز احمد کی معرفت ماہنامہ سچی کہانیاں متعارف ہوا اور جب ممتاز صاحب نے بتایا کہ کاشی چوہان بہت نامور شاعر ہیں اور ان کا مجموعہ کلام ''اور تم'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے تو آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور بے اختیار آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ فوراً کاغذ قلم سنبھالا اور چند سطریں آپ کی نظر کر رہا ہوں۔ بلاشبہ سچی کہانیاں کو ایک معیاری ڈائجسٹ پایا اور ہر لحاظ سے یہ ایک بہترین معلوماتی جریدہ ہے، جس میں خوب صورت کہانیوں کے ساتھ اچھی شاعری بھی ہے۔ اپنی ایک غزل خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ وقتاً فوقتاً حاضری ہوتی رہے گی۔ اب اجازت چاہوں گا۔

☆: محترم بھیا! آپ کی آمد سے دل کو جو خوشی ملی اس کا احوال ان صفحات پر بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بس اپنی شفقت اسی طرح برقرار رکھیے گا۔

✉: لاہور سے یہ نامہ ہے ہماری بہت پیاری لکھاری بہن حنا بشریٰ کا۔ لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے اتنا زبردست رسالہ شائع کرنے پر مبارکباد۔ سرورق شاندار تھا۔ تبصرے سب کے شاندار تھے۔ احوال کی رونق یونہی بڑھتی رہے۔ آمین۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے چھوٹی سی بات کروں گی۔ کاشی بھیا یہ آپ کا دیا ہوا حوصلہ ہے کہ بھائی ملازم حسین اور بھائی حبیب الرحمن ان حالات میں بھی لکھ رہے۔ جاندار تبصرہ کرتے ہیں۔ اللہ ان دونوں کے حال پر اپنا رحم فرمائے اور ان پر اپنا فضل فرمائے۔ باقی بھیا آپ کو آپ کی نیک نیتی کا اجر اللہ پاک ضرور عطا فرمائے گا۔ بھائی حبیب الرحمن کا خط پڑھ کر احساس ہو رہا تھا کہ کاشی بھیا کی محبت اور خلوص نے انھیں نئی زندگی دی ہے۔ اب شمارے پر تبصرہ ہو جائے ستر ہواں مسافر بہترین تحریر تھی۔ بھوک، روم نمبر 607، گم شدہ چہرہ، عرشی کون تھی؟، سرخ لیموں، تمہارے ساتھ ساتھ، دوسری دنیا کا آخری عشق، آٹھ کہانیاں اک کردار پُراسرار نمبر کی رونق بڑھا رہی تھیں۔ نزہت ناز کی تحریر اک پل میں سب کچھ۔ مہاناناگ، آدم خور زبردست تھیں۔ ارسہ سحر چوہان کی تحریر کیسا یہ راز ہے؟ کشاف اقبال کی ہماری اُدھوری کہانی بھی اچھی کوششیں تھیں۔ مختصر تحریروں پر بھی بہت محنت کی گئی۔ بہت خوب تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ بادبان بھی خوب صورت تحریر ہے۔ زہر عشق کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ویلڈن کاشی بھیا۔ جاوید راہی صاحب کی منی باجی اور ممتاز احمد صاحب کی حسد کی

خواتین کی محبوب قلم کار

'رفعت سراج' کا تازہ ترین شاہکار 'دامِ دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔
معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں۔

''ایمن'' ایک ایسی بہو کی کہانی، جسے دو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ہر لمحہ ساس، سسر کے طنز اور تشنوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

تازہ ترین قسط سے کچھ لائنیں

اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھیلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیے ہم پر۔'' فردوس کی بڑبڑاہٹ زہر کی کڑواہٹ کے برابر تھی۔

''ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔'' حامد حسین نے لقمہ دیا۔

''پ...... پندرہ لاکھ......'' فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بندوق تانے کھڑا ہو اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

''ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟'' وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

''آسرا رکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمن کی پشت پر تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمن کو پاؤں اٹھانا دوبھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ جسے رب العالمین کہتے ہیں۔ جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔ جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔''

آج کے جدید دور میں بھی ایسے کردار ہر دوسرے گھر میں موجود ہیں۔ رفعت سراج عام بات کو خاص بنانا جانتی ہیں۔

'دامِ دل' ہر ماہ دوشیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

آگ بھی بے مثال تھیں۔ دونوں ہمیشہ اچھے لکھتے ہیں۔ بلکہ ہم آپ دونوں سے سیکھتے بھی ہیں۔ آخر میں ایک بات کہ سدرہ انور علی کا خوب صورت تبصرہ موجود تھا مگر پراسرار نمبر کے لیے ان کی کہانی کیوں غائب تھی؟ اجازت سے پہلے تمام احوالیوں کے لیے بہت سی دعائیں۔ سب کو سلام اور بہت پیار۔

☆: بہت اچھی حنا! تبصرہ بہت شاندار رہا۔ بالکل تمہاری کہانیوں کی طرح۔ بس بیٹا ہمیں ہر ماہ یاد کرلیا کرو۔ احوال میں سب احوالی ایک دوسرے کے خوشی اور غم کے شریک ہوا کرتے ہیں۔

✉: بڈالی سے ہمارے قاری ساتھی نعیم اللہ بڑے دنوں بعد احوال میں حاضر ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ چند ماہ بعد احوال میں شرکت کرر ہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق تو پراسرار کے عین مطابق بہترین لگا۔ پھر اشتہارات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے منزہ سہام کے اداریہ پر پہنچے۔ ''الفاظ کھو گئے'' بہت خوب لکھا۔ اس کے بعد کہانیوں کی باری آئی تمام لکھاریوں نے خوب لکھا۔ 'سترہواں مسافر' محمد سلیم اختر۔ 'مجھے معاف کردو' حنا بشریٰ۔ روم نمبر 607، نفیسہ سعید۔ 'گم شدہ چہرہ' شانی خامان۔ 'بھوک' رضوانہ پرنس۔ 'عرشی کون تھی؟' نازیہ ملک۔ 'باندی' شائستہ انور۔ ٹاپ کی کہانیاں تھیں۔ ان کی تعریف کے لیے الفاظ کم ہیں بہت خوب زبردست۔ ایک تصویر ایک کہانی، دانیال شمسی۔ بہترین سلسلہ ہے۔ کاشی چوہان کا ناول زہر عشق اور ایم اے راحت کا ناول 'ہم شکل' بہترین جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی کہانیاں پڑھی نہیں ہیں۔ امید ہے بہتر نہیں بہترین ہوں گی۔ کیونکہ بہترین کہانیاں سچی کہانیاں میں ہی ہوتی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ماہ نامہ سچی کہانیاں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: پیارے نعیم! ہماری بھی اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس طرح تم نے اس بار خوب صورت تبصرہ لکھا تمہیں بہت اچھا لکھنا بھی آجائے۔ خوش رہو۔ امید کے ساتھ۔

✉: احوال میں یہ شرکت ہے ہماری آپا مسز نوید ہاشمی کی کراچی سے۔ لکھتی ہیں۔ میرے دوستوں اور ساتھیوں کیسے ہیں آپ لوگ۔ منزہ سہام نے اسمارٹ فون پر بہت خوب صورت لکھا۔ کاشی چوہان کے احوال میں قدم رکھا تو ایسا محسوس کرتی ہوں کہ کہیں سے گھوم پھر لو مگر اپنے گھر کا جو مزہ ہوتا ہی سکون اپنوں کی محبت وہ کاشی چوہان کے احوال میں نظر آتی ہے یہ سب آپ کی محبت کا ثبوت ہے۔ میں سچی کہانیاں بھی پڑھتی ہوں اور دوشیزہ بھی۔ مگر احوال میں ماشاء اللہ تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ سنبل کیسی ہو، سدرہ انور علی آپ سب کو خوب صورت خطابات سے نوازتی ہو میری گڑیا میں بھی آپ کو ایک خطاب دینا چاہتی ہوں۔ ہماری (لاڈلی گڑیا) جو ہم سب کی چہیتی ہے۔ ذہین محبت کرنے والی لاڈلی گڑیا پسند آیا اپنا خطاب۔ اسماء اعوان لائف بوائے کو کامیاب بناتی جارہی ہیں۔ شانی خامان کے والد کے لیے دعا گو ہوں۔ خدا ان کو صحت عطا فرمائے۔ نسیم سکینہ صدف کے غم میں ہم برابر شریک ہیں۔ سب دوستوں کا شکریہ جنھوں نے ہمیں مبارکباد پیش کی۔ یعقوب احمدانی

اب طبیعت کیسی ہے؟ سونیا اور سدرہ آپ نے یاد کیا۔ ہم حاضر۔ مجید احمد جائی بھائی اب طبیعت کیسی ہے۔ محمد سلیم اختر اپنی دوستی بہت خوب صورتی سے تحریر کر رہے ہیں۔ اقبال بانو ڈراپ سین میں اپنا گھر بچانے کی ترکیب بتا رہی ہیں۔ ناسور میں نسرین غرور اور گھمنڈ کو نیچا دکھا رہی ہیں۔ فاطمہ گل جو بہادر بیٹی کی کہانی ہے پسند آئی۔ نازیہ بتول سوتن کو سہیلی بنا رہی ہیں اور زندگی آسان کر رہی ہیں۔ منعم اصغر نے اپنی چاچی کی محبت اور غم کو بہت خوب صورتی سے تحریر کیا۔ ثمینہ فیاض وٹے سٹے کی رسم پر کہانی پیش کی۔ محمد قاسم خان بددعا سے ڈراتے ہوئے نظر آئے۔ ضرغام محمود نے ایک مجبور دوشیزہ کی کہانی بہت خوبصورتی سے پیش کی۔ ایم یعقوب دوست نما دشمن سے ہوشیار کراتے نظر آئے۔ ایم اے راحت کی ہم شکل، کاشی چوہان' زہرِ عشق' ڈائجسٹ کا دل ہے دل نہ ہو تو جسم میں کچھ نہیں رہتا۔ ایڈیسن معاشرے کی سچائی پیش کر رہے ہیں۔ ارم ناز معاشرے کی اقدار کو بھسم کرتی تحریر لائیں۔ فوزیہ احسان رانا آپ کی تحریر پسند آئی، ہڈحرام' احسان فراموش کی کہانی' حنا بشریٰ نے بیٹیوں پر غرور، بیٹی پر افسوس کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا۔ مقصود احمد بلوچ لالچ نے بھائی کی جان لے لی۔ تحریر پیش کی، شانی خاماں اچھی تحریر تھی۔ نوشابہ، ثنا کنول، رئیسہ خالد، الماس فاطمہ کی حکایتیں پسند آئیں۔ نعمان اسحاق پہلا حصہ چھا گیا۔ ممتاز احمد پلیٹ فارم پر ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت کہانی لا رہے ہیں۔ ہائیڈ پارک میں کنول جی، انیس الرحمن چھا گئے، ترنیم کش میں ایم افضل، اشفاق شاہین، روبینہ شاہین پسند آئے۔ اب اجازت پُراسرار نمبر میرے ہاتھ میں ہے۔ مزے لے لے کر تھوڑا ڈر کر انجوائے کر کے املی کی طرح پڑھوں گی۔ اجازت۔

☆: پیاری آپا! مزیدار کھٹا میٹھا تبصرہ دل لے گیا۔ خوش رہیے۔ آپ کی محبتوں کے مان ہمیں مہمیز کرتے ہیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسے محبت کرنے والے ہمارے اپنے ہیں۔

✉: اسلام آباد سے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور صاحبہ کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کیسے ہیں آپ! خود تو آپ مسکرا رہے ہیں اور ہماری موت کا سامان کیے ہیں۔ اور نہیں تو کیا۔ پُراسرار کہانیاں پڑھ پڑھ کر کسی روز ہم بھی پُراسرار کہانی بن جائیں گے۔ مارچ کا شمارہ خوفناک کھوپڑیوں، جنات پریاں لیے حاضر ہوا۔ اُف! کانپتے ہاتھوں سے جیسے ہی کھولتے ہیں تو روح جیسے فنا ہو رہی ہے۔ چلیں جی کہانی خوفناک ہے مان لیتے ہیں۔ اس پر طرّہ کہ خوفناک تصویریں۔ یااللہ آنکھیں بند کر کے پڑھیں کیا۔ فاطمہ ثریا بجیا کی موت واقعی ایک بہت بڑا صدمہ تھی۔ منزہ سہام کی اُن سے محبت اُن کے لفظوں سے جھلک رہی تھی۔ آگے بڑھتے ہیں تو احوالیوں کی محفل جمی ہے۔ ہر کوئی سچی کہانیاں سے محبت میں سبقت لے جانے کو ہے۔ واہ!! جی خوش ہو گیا۔ اُف!! آ گیا وہ مرحلہ...... ہاں جی...... خوف ناک کہانیاں اور میں اکیلی جان۔ بہت سا حوصلہ جمع کر کے پڑھنا جو شروع کیا تو اسلام آباد کی ہلکی ہلکی سردی میں بھی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پیشانی کو بھگونے لگیں۔ محمد سلیم اختر صاحب پنڈی ایبٹ آباد کا سفر بھی اتنا طویل نہ لگا جو آج محسوس ہوا۔

ستر ہواں مسافر...... موت کے سائے میں لکھی گئی یہ کہانی لحہ بہ لحہ اپنی طرف متوجہ کرتی رہی اور اینڈ موت پر کیا گیا۔ ہمیں تو لگا کہ جیسے وہ قبرستان ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ حنا بشریٰ مجھے معاف کردو۔ قسم سے آپ ہمیں واقعی معاف کردیں۔ نہ ڈرایا کریں اتنی خوفناک کہانی لکھ کر۔ اُس بے چاری کو ڈاکٹر بنا کر مار ڈالا...... کس قدر دکھی کہانی تھی۔ ابھی پچھلی کہانی کا دکھ آنکھوں سے بہہ رہا تھا کہ گمشدہ چہرہ ہوش اڑانے کو آ گیا۔ شانی خامان کے قلم سے تحریر کردہ یہ روح فرسا قصہ روح دہلا دینے کو کافی تھا۔ میرے ہی جیسی تھی بے چاری، پرانی یادوں سے محبت کرنے والی مگر بدلے میں عمر بھر کی اذیتیں ملیں۔ نادیہ ملک کمال جی...... آپ کی اسٹوری نمبر لے گئی۔ مطلب ایک روح کے ساتھ رہتی رہیں۔ یا اللہ! کہاں جائیں ہم۔ ڈر سے کیسے چھپیں ہم، مارے دے رہا ہے یہ خوف۔ شائستہ انور ''ہانڈی'' لیے تشریف لائیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ جن بہت زبردست قسم کے عاشق ہوتے ہیں۔ مطلب قبر میں ہی ساتھ اتر گئے۔ اللہ اکبر۔ علی حسنین تابش کی تحریر کردہ کہانی سنپولیے بھی توجہ کا مرکز رہی۔ مطلب لوگوں کے دلوں میں اس قدر حسد اور نفرت پائی جاتی ہے کہ وہ انسانی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ حد ہے حد...... بس جی مزید ہمت نہیں تھی کہانیاں پڑھنے کی۔ سو ہائیڈ پارک چلے ہم۔ دو تین لمبے سانس لینے کے بعد طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو نظروں کے سامنے رنگ رنگ کی تحریریں موجود تھیں۔ ارے...... یہاں میں بھی...... اوہ تھینکس ایڈیٹر صاحب! آپ بہت اچھے سے ہو۔ چند غم زدہ شعر پڑھے اور اپنی پُرمسرت زندگی میں مصروف ہو گئے ہم۔ لیں جی!! اب ملیں گے گرمیوں میں۔ اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیے گا۔ دعائیں بہت ساری۔

☆: ارے عظمیٰ جی! آپ کے ہاں پورا سال ساون رہا اور ہم کراچی والوں نے تو فروری میں بھی لُو کے مزے لے لیے۔ ہمارے ہاں موسمِ گرما ہی مستقل ٹھہر گیا ہے۔ جانے سورج راجہ کو ہم سے اتنا پیار کیوں ہے۔ تبصرہ زبردست رہا آپ کا۔

✉: بورڑی شریف، خیر پور ناتھن شاہ سے ہماری پیاری لکھاری بہن تحسین جونیجو عرض کرتی ہیں۔ اب کی بار اپنے محبوب پرچے کا شدت سے انتظار رہا کہ میری بھی تحریر اس کا حصہ بننے جا رہی تھی۔ اس عنایت پر بے حد ممنون ہوں۔ کاشی بھیا! یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی تو ہوتی ہیں جو جینے کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ اداریہ 'الفاظ کھو گئے' ادب کی دنیا کا معتبر نام فاطمہ ثریا بجیا اب ہم میں نہیں بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ سید ملازم حسین صاحب کے احوال نامے نے محفل کی رونق میں اضافہ کیا۔ بہت خوب۔ حبیب الرحمن صاحب، عمارہ ناز جی محفل احوال کا حصہ بننے پر خوش آمدید۔ سدرہ انور علی میری شہزادی تمہاری دعا سے میں اب الحمد اللہ بالکل ٹھیک ہوں۔ بس تم اپنا خیال رکھا کرو جانی۔ اللہ پاک تمھیں سلامت رکھے۔ اچھی صحت کے ساتھ۔ آمین۔ منعم اصغر، سدرہ انور علی، سونیا خان اور صائمہ مجید بھابی تبصرہ پسند کرنے پر بے حد مشکور ہوں۔ مور شاہد حسین بھائی اور اشفاق شاہین بھائی کہاں ہیں آپ؟ حاضری لگوایئے۔ کاشی بھیا

آپ کو 4 اپریل، یکم مئی سال گرہ بہت بہت مبارک ہو۔ کہانیوں میں سرخ لیموں، یوسف لغاری بھائی، 'وہ بڑھیا کون تھی، حجاب فاطمہ آپی، حسد کی آگ، ممتاز احمد بھائی، بھوک، رضوانہ پرنس آنٹی، دوسری دنیا کا عشق، منعم اصغر بھائی، کیسا یہ راز ہے، ارسہ سحر چوہان، اور آدم خور ملک صفدر اعوان صاحب کی بہترین کہانیاں رہیں۔ اب اجازت خدا حافظ۔

☆: اچھی تحسین! خدا تمھیں خوش رکھے۔ لو قینچی کب اُدھار رکھتی ہے۔ بس ہمیشہ اس طرح شاملِ احوال رہو۔

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری آنٹی نفیسہ فضل لکھتی ہیں۔ آپ سب کی بے انتہا کاوشوں سے وقت سے پہلے بہترین ڈائجسٹ ہمیں مل جاتا ہے۔ جزاک اللہ۔ من موہنی سی گڑیا منزہ کو عقیدت بھرا اسلام۔ آپ نے اس پرچے کو چار چاند لگادیے ہیں۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف ستر ہواں مسافر بھائی محمد سلیم اختر ایک بہترین لکھاری ہیں۔ زبردست کہانی ہے مگر یہ سمجھ نہ آیا کہ جب شیدا ویگن میں اکیلا تھا روحوں کے ساتھ تو یہ اسٹوری کیسے پتا چلی؟ دوسری کہانی مجھے معاف کردو، حنا بشریٰ تم نے تو دل دکھی کردیا۔ نفیسہ سعید روم نمبر 607، یہ شاید ہماری نئی ساتھی ہیں دلچسپ تحریر ہے، گم شدہ چہرہ شانی خاںان، عرشی کون تھی، نادیہ ملک، ہانڈی ،شائستہ انور، سرخ لیموں، محمد یوسف لغاری، سنپولیے، علی حسنین تابش زبردست تحریریں ہیں۔ آج کل یہی سب ہو رہا ہے۔ تمہارے ساتھ ساتھ نازیہ بتول رضا یہ سب ممکن ہے دوسری دنیا کا آخری عشق منعم اصغر یہ سب ممکنات ہیں مجھے بھی ایسی بہت سی اسٹوریز معلوم ہیں۔ ایک پل میں سب کچھ نزہت ناز یہ سچ ہے۔ مہاناناگ تحسین جو نیجو زبردست کہانی لائی ہیں۔ آدم خور صفدر عباس اعوان کہانی پڑھنے سے متلی ہو رہی تھی۔ رک رک کر پوری کر ہی لی۔ ہماری ادھوری کہانی کشاف اقبال تم نے تو دل ہی دکھادیا یہ حقیقت سے بھرپور کہانی رلاگئی مجھے...... نجات ارمان فاطمہ الماس 'بیٹا دے یا مایا' سیما عروج صدیقی، 'پچھل پیری' بشیر احمد بھٹی، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، الفاظ کھو گئے منزہ سہام کی طرف سے فاطمہ ثریا بجیا کو بہترین خراج تحسین اور ایم اے راحت صاحب کی 'ہم شکل' بہترین ناول جو کہ اختتام پذیر ہے دلچسپ ہے اور کاشی بیٹا زہرِ عشق بہت دلچسپ ہوگیا ہے۔ ارے ہاں سفرنامہ مجھے ہمیشہ پسند رہا ہے اور یہ بادبان زبردست ہے۔ مگر نعمان اسحاق جب مزہ آنے لگتا ہے کہانی میں تو قسط ختم ہوجاتی ہے۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی ہیں مجموعی طور پر پراسرار نمبر بہت شاندار ہے۔

☆: اچھی آنٹی! تبصرہ زبردست رہا۔ حج کی روداد انشاء اللہ اس بار خصوصی طور پر شائع کریں گے۔

✉: احوال میں یہ حاضری ہے ہماری آفت کی پڑیا۔ سدرہ انور بلوچ کی جھنگ صدر سے۔ عرض کرتی ہیں۔ مارچ کا پراسرار نمبر ملا ٹائٹل ٹھیک لگا۔ اداریہ منزہ سہام آنٹی کا 'الفاظ کھو گئے' بوجھل

دل کے ساتھ پڑھا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ فاطمہ ثریا بجیا کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے آمین۔ احوال میں آپی زرینہ جونیجو، ملکہ احوال تحسین جونیجو، سید ملازم حسین، صفدر عباس اعوان، منزل خان، صفیہ سلطانہ مغل، مسز نوید ہاشمی، صائمہ مجید، مجید احمد جائی کے خطوط پسند آئے۔ اس کے علاوہ باقی سب نے بھی اچھا لکھا۔ لائف بوائے میں اسماء اعوان نے بہت خوب لکھا۔ انکل محمد سلیم اختر کی سترہواں مسافر' حنا بشریٰ کی 'مجھے معاف کردو' روم نمبر 607' گم شدہ چہرہ' شانی خامان' رضوانہ پرنس کی تحریر' بھوک' نادیہ ملک 'عرشی کون تھی؟' ہانڈی' شائستہ انور' محمد یوسف لغاری کی 'سرخ لیموں' علی حسنین تابش کی سنپولیے' نازیہ بتول رضا کی ساتھ ساتھ منعم اصغر، دوسری دنیا کا آخری عشق، فرح انیس، آٹھ کہانیاں اک کردار، نزہت ناز، اک پل میں سب کچھ، ملک صفدر عباس اعوان کی آدم خور، ارسہ سحر چوہان' یہ کیسا راز ہے؟' ارم خان کی سب کچھ تیرا ہے، سیدہ حجاب فاطمہ، وہ بڑھیا کون تھی؟' الماس فاطمہ ارمان، نجات، سیما عروج، بیٹا دے یا مایا، بشیر احمد بھٹی کی پچھلی پیری، انکل جاوید راہی کی منی باجی، یہ تمام تحریریں بہت ہی دلچسپ وسبق آموز لگیں۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو کی مہاننا ناگ، بہت خوب صورت تحریر لگی۔ ویلڈن ملکہ۔ زہر عشق قسط 13 بہت پسند آئی۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں سبھی کے انتخابات پسند آئے۔ اب اجازت! سانسوں کا تسلسل اسی طرح قائم رہا تو پھر ہوگی ملاقات تب تک اپنا بہت سارے والا خیال رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔

☆: پیاری گڑیا! تمہارے خط آتا ہے تو جانے کیوں اطمینان سا ہو جاتا ہے کہ ہم سے محبت کرنے والے ہمارے بہت آس پاس ہیں۔ جیو گڑیا تبصرہ شاندار رہا۔

✉: چک نمبر 58 شمالی، سرگودھا سے ہمارے پیارے بھائی، فیصل ندیم بھٹی عرض کرتے ہیں۔ مارچ 2016ء کا پراسرار نمبر، میرے سامنے ہے ٹائٹل میں لڑکی کی نشیلی آنکھیں دیکھتے ہی ان میں گم ہوگیا۔ مگر جب لڑکی کے ہاتھ کی طرف دیکھا تو اُف ہم تو ڈر ہی گئے یہ بھوت بھی نہ بس۔ اگلے صفحے پر جام شیریں پیتے ہوئے۔ اپریل سے کپڑے دھوئے۔ اور پھر منزہ سہام صاحبہ کے اداریے' الفاظ کھو گئے' پڑھ کر جی بوجھل ہوگیا۔ احوال میں نئے آنے والے دوستوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جن میں قاسم بلوچ، عثمان بلوچ، عمارہ ناز ٹوبہ ٹیک سنگھ سے احتشام احسان اور ساجدہ لطف اللہ، امید ہے کہ ہر ماہ احوال میں آپ سے ملاقات ہوا کرے گی۔ غزالہ نزہت ناظم ویلکم بیک۔ ممتاز احمد، مسز نوید ہاشمی، راشد لطیف، سونیا خان، باجی صائمہ مجید اور مجید احمد جائی کے تبصرے شاندار تھے۔ کنزہ ملک ملتان سے احوال میں شامل ہونے پر خوش آمدید اور تبصرہ بہت شاندار تھا اور اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر ہو جائے۔ سترہواں مسافر، سلیم اختر کی پراسراریت سے بھرپور کہانی ہے۔ حنا بشریٰ کی مجھے معاف کردو، کہانی عبرتناک ہے۔ رضوانہ پرنس کی 'بھوک' حیران کن کہانی ہے۔ نادیہ ملک 'عرشی کون تھی' عرشی کا دو سال موت کے بعد واپس دنیا میں آنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایم اے راحت کا 'ہم شکل' بہترین سلسلے کی کڑی ہے۔ سیدہ حجاب فاطمہ 'وہ بڑھیا کون تھی؟' قابل تعریف ہے۔ ممتاز

احمد کی 'حسد کی آگ' بہترین کہانی ہے۔ کاشی بھیا۔ آج کل مصروفیت تو بے انتہا ہے کیوں کہ مارچ کے آخر میں یونیورسٹی کا امتحان ہے تو اس کی تیاری میں مصروف ہوں۔ امتحان کی تیاری کی وجہ سے صرف اتنا ہی شمارہ پڑھ سکا۔ اب اجازت۔

☆: پیارے سے فیصل بھیا! امتحان کی کامیابی کی پیشگی مبارک باد قبول کرو۔ ہم نے تمھیں دعا دی ہے۔ اللہ ضروری ہماری سنے گا۔ بس تھوڑی سی فراغت نکال کر پرچے پر ضرور تبصرہ لکھنا۔

⊠: شاہد سلیم، حسن ابدال سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ آپ کی محفل میں شریک ہونے کی سعادت کر رہا ہوں۔ میرا اپنی کا آپریشن ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ سے رابطہ قائم نہ رکھ سکا۔ معذرت۔ ماہ مارچ 2016ء کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا ہے جسے پڑھ کر بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ ماشاء اللہ سبھی احباب کی تحریریں بیسٹ تھیں۔ کہانیاں تمام دوستوں کی بہت پسند آئیں۔ سلسلے وار کہانیاں بھی بہترین جا رہی ہیں۔ اب انشاء اللہ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ حاضری دوں گا۔

☆: پیارے شاہد! تمہاری بیماری کا سن کر دلی رنج ہوا۔ خدا تمھیں جلد شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ انشاء اللہ کہانیاں پڑھ کر جلد رائے دیں گے۔ ارے ہاں...... یہ تو بتاؤ تم ہمیشہ خط کے ساتھ NIC کی کاپی اور تصویر کیوں بھیجتے ہو۔ بھیا یہ ہمارا احوال ہے کوئی تھانہ تو نہیں......

⊠: یہ آمد ہے شمسہ قمر کی کراچی سے۔ عرض گزار ہیں۔ دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفل میں حاضر ہوں۔ یہ دوری مجھے کھل تو رہی تھی۔ لیکن کچھ مصروفیت ایسی تھی کہ قلم اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ چلیں دیر آید درست آید۔ پہلے تو سرورق کے بارے میں کہنا چاہوں گی کہ پراسرار نمبر کی مناسبت سے Beauty And Beast والی بات ہے۔ حسینہ بہت زبردست لگ رہی ہے۔ منزہ سہام صاحبہ بجا طور پر بجیا کی وفات پر ملول ہیں وہ ایک عہد تھیں جو تمام ہوا۔ لائف بوائے کی کہانی اچھی تھی ویسے سچی کہانیاں ایک گلدستے کی مانند ہے جس میں ہر لکھاری تقریباً اچھا لگتا ہے اور پھولوں کی طرح ان کی تحریریں بھی مہکتی ہیں۔ حنا بشریٰ کی معاف کردو اچھی تحریر تھیں۔ کاشی صاحب کے احوال کی باتیں تو حسبِ معمول اچھی ہوتی ہیں اور اچھی لگتی ہیں۔ بہت اپنائیت اور خلوص کے ساتھ سب کو جواب دیتے ہیں اور مانو ان سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ محمد سلیم اختر صاحب کی سترہواں مسافر بھی منفرد لگی۔ شائستہ انور کی ہانڈی، منی باجی، بادبان، حسد کی آگ، پچھل پیری، سب ہی اچھی لگیں۔ محمود شام صاحب کا تو ایک نام ہے ان کی تعریف میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کاشی صاحب کی زہرِ عشق کا کیا کہنا اس کے علاوہ ایم اے راحت صاحب کا ناول بھی بہت عمدہ ہے۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش سب ہی بہترین تھیں۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ غرض دو دن میں ڈائجسٹ ختم کر لیا۔ اچھا اب سب سے اجازت چاہتی ہوں۔ دوبارہ موقع ملا تو حاضرِ خدمت ہو جاؤں گی۔ اللہ نگہبان۔

ایک بہت خاص آپ بیتی

لاہور کی جیل میں سزائے موت کی سزا کاٹنے والے اُس قیدی کی زندگی کے شب روز جو اسے ایک معصوم انسان سے مجرم بننے پر مجبور کر گئے۔ اُس قیدی کی داستانِ عبرت جس میں آہیں بھی ہیں...... سسکیاں بھی ہیں' محبت اور نفرت کے رنگ بھی...... بہت جلد رانا حبیب الرحمٰن کے قلم سے ایک آتش فشانی سچی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے۔

☆: شمسہ جی! آپ کا تبصرہ شاندار رہا۔ موقع ملنے کی بات ہے تو ہم ہر ماہ آپ کی آمد کے منتظر رہیں گے تو پھر اگلے ماہ تبصرہ آرہا ہے ناں آپ کا؟

✉: یہ احوال میں پہلی بار آمد ہے عرفان حسین آصف کی ملتان سے۔ لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی میں کافی عرصہ سے ماہ نامہ سچی کہانیاں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ماہ نامہ سچی کہانیاں میں تمام رائٹرز بھائی اور بہنیں بہت محنت سے لکھتے ہیں۔ اللہ پاک ان کو اور سخن دے۔ آمین۔ شمارہ ہمارے ہاتھ میں ہے اور اس کی اسٹوریاں بھی بہت اچھی ہیں۔ جن میں ہمیں 'یہ دوستی ہے' ناسور' ڈراپ سین، قسمت کے کھیل، روایات کی دلدل' کوئی خوشیاں لادے' میرا ساجن' آستین کے سانپ' اور میرے اپنے اسٹوریز بہت پسند آئیں۔ ویسے تو تمام نئے پرانے رائٹر حضرات بہت محنت سے لکھتے ہیں۔ مگر جو جادو کاشی بھائی اور ایم اے راحت کے ہاتھ میں ہے شاید ہی کسی کے ہاتھ میں ہو۔ ہمارے پورے کالج میں یہ دونوں ناول، زہرِ عشق اور ہم شکل بہت مقبول ہیں۔ کچھ ایسے طلبہ طالبات بھی ہیں جو صرف ان دونوں ناولوں کے لیے ڈائجسٹ خریدتے ہیں۔ سچی کہانیاں اور آپ کے ہم شکل اور زہرِ عشق کے کچھ دیوانوں کا نام لکھ رہا ہوں۔ ابرار حسین، ارم ناز، شائستہ، وقاص خان اور مائرہ ہیں۔ کاشی بھائی میں پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ اس میں کچھ غلطیاں بھی ہوں گی تو پلیز اسے نظر انداز نہ کرنا میں ان غلطیوں پر آئندہ قابو پانے کی کوشش کروں گا۔ اور امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے اور میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆: پیارے آصف! خوش آمدید۔ لو تمہارا تبصرہ ہوا شائع۔ اب کہانی کے بارے میں پڑھ کر ہی کچھ رائے دے سکتے ہیں۔ فی الحال تھوڑا سا انتظار۔ تمہارے کالج فرینڈز کے لیٹرز کہاں ہیں؟؟ اگلے ماہ ان سب کے تبصرے ہمارے پاس ہوں۔

✉: یہ احوال میں حاضری دے رہے ہیں ملک علی رضا۔ نثار کالونی، فیصل آباد سے۔ لکھتے ہیں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں مارچ کا شمارہ ملا۔ میرے لیے خوشی کا باعث ہے کہ مجھے بہت سے دوستوں نے یاد کیا۔ سچی کہانیاں کی کہانیاں، غزلیں، خطوط پرلطف اور بے مثال تھے۔ فوزیہ احسان رانا، رانا حبیب الرحمٰن لاہور، مجید احمد جائی، کاشی چوہان صاحب آپ نے بڑی محبت سے تمام

دوستوں کو اکٹھا کیا ہے۔ دوستوں کو ایک جگہ ملایا ہے۔ سچی کہانیاں رسالہ اب تو میرا محبوب میگزین بن گیا ہے۔ جب تک میری زندگی ہے میں ضرور پڑھتا رہوں گا۔ ارے...... جو احباب مجھے ہر وقت یاد رکھتے ہیں خاص کر آفتاب رسول، عظمت اٹلی، فرحان یوسف چائینہ، افضل آزاد اور بہت ہی اچھے دوست حکیم جاوید نسیم اور خالد فاروق سدا خوش اور آباد رہیں۔

☆: پیارے علی رضا! تم بھی ہر ماہ ہم کو یاد رکھا کرو۔ اور احوال میں حاضری یقینی بناؤ۔ تبصرے کا شکریہ۔

✉: فیصل آباد سے محمد شعیب لکھتے ہیں۔ اس خط کے ہمراہ میں کہانیاں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے یہ تحریریں سچی کہانیاں میں اپنی جگہ ضرور بنائیں گے۔

☆: پیارے بھائی! خوش آمدید! ارے یہ کیا؟؟ اپنی بات کی اور بس...... کچھ پرچے کے بارے میں بھی تبصرہ کرتے تو۔ اچھا لگتا۔ اب یہ جلد بازی نہیں چلے گی۔

✉: کراچی سے فرح انیس تحریر کرتی ہیں۔ احوال میں سب ہی احوالیوں کے احوال اچھے لگے۔ تمام احوالیوں کو میری جانب سے سلام اور سب کی خیریت مطلوب ہے۔ نزاہت افشاں اللہ آپ کو کامیابی دے بھائی۔ آمین۔ میرا B-A1 کا رزلٹ آ گیا۔ فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔ اب ماسٹرز کی تیاری ہے آپ سب سے التجا ہے میری کامیابی کی دعا کیجیے گا۔ ٹائٹل پر لڑکی اچھی لگی پر ساتھ چھوٹی سی عجیب وغریب مخلوق دیکھ کر ڈر لگا۔ منزہ سہام کا 'الفاظ کھو گئے' پڑھ کر یہی لبوں سے نکلا۔ اللہ بجیا کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ حنا بشریٰ کی تحریر اچھی لگی۔ برائی کا انجام برائی ہوتا ہے۔ نفیسہ سعید کی تحریر بہت پیارا پیغام لے کر آئی۔ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ شانی خامان کی تحریر میں ماہم کے عجیب وغریب شوق نے اسے اتنے بڑے نقصان سے دوچار کر ڈالا۔ رضوانہ پرنس کی تحریر میں نیلما کی بے بسی اور موت اور آخر میں رمشا، علیب کے انجام پر خوف آیا۔ علی حسنین تابش کی تحریر بھی اچھی لگی۔ حسد کی آگ بہت بری ہوتی ہے۔ انسان کو جلا کر خاکستر کر ڈالتی ہے۔ نازیہ بتول کی تحریر میں رضا صاحب کو داد دینے کو دل چاہا ان کی ہمت پر۔ منعم اصغر، نادیہ ملک، تحسین جونیجو، الماس فاطمہ کی تحریریں اچھی لگیں۔ ممتاز احمد کی تحریر زبردست لگی۔ کشاف اقبال کی تحریر پسند آئی۔ زہر عشق ماشاء اللہ زبردست جا رہی ہے ہر قسط کا بے صبری سے انتظار ہوتا ہے۔ کچھ تحریریں ابھی پڑھی نہیں۔ کاشی بھیا آپ کا بہت شکریہ آپ نے میری تحریر لگائی۔ آپ جیسے بھائی ہم بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ انشاء اللہ۔

☆: اچھی فرح! تبصرہ زبردست رہا۔ اپنا بہت خیال رکھنا اور ہاں احوال میں اسی طرح حاضری یقینی ہونی چاہیے۔

✉: محمد قاسم خان بلوچ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ چک نمبر 184 گ ب سے احوال میں شامل ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ پہلے کی طرح اس بار بھی آپ نے ایک نہایت عمدہ پرچہ اچھے ٹائٹل کی

اپریل 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام:--

مکمل پتا:--

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اپریل 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی:-------------------- تعداد صفحات:--------------

نام:--

مکمل پتا:--

فون/سیل نمبر:--

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اپریل 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان:-------------------- مصنف:--------------

دوم، عنوان:-------------------- مصنف:--------------

سوم، عنوان:-------------------- مصنف:--------------

نام:-------------------- شہر:--------------

صورت میں پیش کیا۔ سب سے پہلے تو میں احوال کی بھیڑ میں پہنچا جہاں بڑی رونقیں سجی ہوتی ہیں۔ ہر ماہ کے شمارے میں کئی چہرے نئے نظر آئے۔ دلچسپ باتوں کے ساتھ نئے لوگوں کو احوال میں دیکھ کر اب یقین ہوتا جارہا ہے کہ ماہنامہ سچی کہانیاں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کررہا ہے۔ احوال میں نئے ساتھیوں کو محبت بھرا اسلام۔ عمارہ ناز پہلی بار کمالیہ سے تشریف لے آئیں۔ ویلکم عمارہ جی۔ تحسین جونیجو آپ نے میری کہانی پسند کی شکریہ۔ بہن جی آپ کا۔ سرگودھا کے اچھے لکھاری ممتاز احمد جی آپ نے اچھے لفظوں میں میری ٹوٹی پھوٹی تحریر کو پسند کیا۔ میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کرو۔ اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں دے۔ آمین۔ آپ سب کا تہہ دل شکریہ۔ تبصرے تمام لوگوں کے بہت پسند آئے تحریروں کی طرف آئیں تو اس بار پراسرار پرچہ بہت شاندار تھا کہانیوں کے حوالے سے۔ سب سے پہلے تو محمد سلیم اختر کی کہانی سترہواں مسافر پڑھی۔ بہت خوب سلیم اختر۔ محمد اسامہ کی چھوٹی سی تحریر حلوہ کھاؤں گی۔ بہت پسند آئی ارم خان کی سب کچھ تیرا ہے۔ زبردست تحریر رہی۔ جاوید راہی کی۔ منی باجی۔ سیدہ حجاب فاطمہ کی کہانی۔ حسد کی آگ، ممتاز احمد کی تحریر ہر لحاظ سے اچھی رہی۔ ممتاز احمد بہت اچھا لکھتے ہیں۔ باقی تحریریں ابھی زیر غور ہیں۔ آئندہ شمارے میں ان پہ بھی بات ہوگی۔ ہائیڈ پارک میں انمول موتی، خوب صورت باتیں، قدرت کے رنگ غزلیں، اقوال زریں، حوا کی بیٹی یہ سب پسند آئیں۔ تیر نیم کش میں شعبان کھوسہ اور ارباز حسین کے شعر اچھے لگے۔ اب باتیں بہت ہوگئیں۔ انشاء اللہ آئندہ شمارے میں ڈھیروں باتوں کے ساتھ پھر حاضری دوں گا۔ آخر میں پیارے کاشی اور دوسرے سب سچی کہانیاں کے ساتھیوں کو خلوص بھرا اسلام اور دعا کہ اللہ پاک ہم سب کو اپنی رحمت رکھے۔ آمین۔

☆: اچھے قاسم! تبصرہ بہتر لگا! اور سب سے اچھا تمہارا عجز ہمیں اسیر کرتا ہے۔ خوش رہو۔

✉: کرن ناز تحصیل سمندری ضلع فیصل آباد سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ پہلی بار احوال میں شامل ہورہی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ مجھے بھی دوسرے نئے لوگوں کی طرح احوال میں شامل کیا جائے گا۔ سچی کہانیاں دو سال سے پڑھ رہی ہوں اور اس رسالے سے میں بہت محبت کرتی ہوں کیونکہ اس میں جو تحریریں شائع ہوتی ہیں وہ بہت اچھی اور جاندار تحریریں ہوتی ہیں۔ پڑھتے ہوئے بہت مزہ آتا ہے۔ اس بار مارچ کا پراسرار نمبر چار تاریخ کو امی جان کے ہاتھوں سے موصول ہوا۔ کیونکہ امی جان ہی ہر ماہ سچی کہانیاں بازار سے لاکر دیتی ہیں۔ امی جان کے لیے دل سے تھینکس۔ پراسرار کہانیاں پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ ہر کہانی میں پراسراری باتیں پڑھتے ہوئے اک عجیب سی کیفیت دل پہ طاری رہتی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس بار کچھ کہانیاں مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آئیں۔ سترہواں مسافر، گم شدہ چہرہ، دوسری دنیا کا عشق، کیسا یہ راز ہے، سب کچھ تیرا ہے، آدم خور، تمہارے ساتھ ساتھ، بھوک، سپنو لیے، حلوہ کھاؤں گی اور حسد کی آگ یہ

سب کہانیاں نمبرون تھیں۔ اس شمارے کی باقی کہانیاں ابھی پڑھ رہی ہوں۔ کیونکہ ٹائم بہت کم ہوتا ہے میرے پاس پھر بھی سچی کہانیاں شوق اور ذوق سے پڑھتی ہوں۔ ایسے خوبصورت ڈائجسٹ سے دور رہنا اب میرے لیے بہت مشکل سا ہوگیا ہے۔ کاشی بھیا آپ سے گزارش ہے کہ میرے خط کو ضرور شائع کیا جائے تاکہ میں اگلی بار بھی ایک اچھے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوسکوں۔ ہائیڈ پارک میں رمشا عارف کا لطیفہ اور حنا لطیف کا بے بسی، مرسلہ پڑھ کر خوب ہنسی آئی۔ غزلوں میں ڈاکٹر دانش علی غزل، محمد قاسم خان بلوچ کی غزل بہت پسند آئیں۔

☆: کرن! خوش آمدید! بیٹا تبصرہ تو آپ کا شاملِ احوال ہوا اب آپ نے ہر ماہ ہمیں احوال میں موجود ملنا ہے۔

✉: یہ تبصرہ ہمیں موصول ہوا ہے ایم افضل آزاد ساہیوال کا۔ لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں اس بار 5 تاریخ کو لاہور سے ملا۔ اس بار ٹائٹل تو بہت خطرناک لگا حسب عادت پہلے منزہ سہام کا الفاظ کھو گئے۔ بڑھا جہاں پر ان کے الفاظ فاطمہ ثریا کو ڈھونڈ رہے تھے۔ احوال میں کچھ نئے کچھ پرانے ساتھی موجود تھے۔ پراسرار اسٹوریوں میں کاشی چوہان کی اسٹوری بہت خطرناک ہوگئی ہے۔ منی باجی، جاوید راہی نجات، الماس فاطمہ ارمان، اک پل میں سب کچھ، نزہت ناز، آدم خور، ملک صفدر عباس، سب کچھ تیرا ہے، ارم خان، عرشی کون تھی، نادیہ ملک، ہم شکل، ایم اے راحت، حسد کی آگ، ممتاز احمد، بھارت میں بلیک لسٹ، معاف کردو، حنا بشریٰ، سنپولیے، علی حسنین تابش، ہانڈی، شائستہ انور، وہ بڑھیا کون تھی، سیدہ حجاب فاطمہ کی اسٹوریاں بہت پسند آئیں۔ ہائیڈ پارک میں عظمیٰ شکور، اسامہ بلال اعوان، محمد جواد، عامر بشیر، شمائلہ اختر، روبینہ ناز رو بی، حنا لطیف نے بہت اچھا لکھا۔ تیر نیم کش میں نعیم اکبر، جمیلہ کنول، عامر جاوید، ایم سعید انور، شعبان کھوسہ، شازیہ رضوی، اشعر عتیق، فرح عالم، ایم وکیل عامر کے شعر بہت اعلیٰ تھے۔ اب اجازت۔

☆: پیارے افضل! نام تمہارا آزاد ہے اور کسی دوسرے کو کیوں ہتھکڑی پہنا کر احوال میں ساتھ جوڑ رہے ہو۔ امید ہے سمجھ گئے ہوگے۔ خوش رہو۔ تبصرہ بہتر تھا۔ اپنے دوست سے کہنا دو لفظ الگ صفحے پر لکھ دیا کرے۔

✉: بہاول نگر سے محمد ابوہریرہ بلوچ عرض کرتے ہیں۔ مارچ کا پراسرار نمبر 5 مارچ کو ملا۔ ٹائٹل دل کش تھا۔ احوال کی محفل میں نئے آنے والے قارئین کو ویلکم۔ عمارہ ناز، احتشام احسان، خضر حیات، محمد ندیم عباس میواتی، عثمان بلوچ، منزل خان، شاہد رفیق، راشد لطیف، ملازم حسین، ممتاز احمد دیگر دوستوں نے زبردست تبصرے لکھے۔ ویلڈن یوں ہی احوال کی محفل کو سجائے رکھنا۔ کہانیوں کی طرف سے 'معاف کردو' حنا بشریٰ، 'ہانڈی' 'منی باجی' 'سرخ لیموں' دوسری دنیا کا عشق' منعم اصغر 'عرشی کون تھی' 'سنپولیے' علی حسنین تابش۔ 'زہرِ عشق' سبھی اچھی تھیں سب کا زور قلم اور زیادہ

ہو۔ باقی مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

☆: اچھے ہریرہ! کہانی پڑھ کر ہی رائے دے سکیں گے۔ فی الفور کچھ کہنا عبث ہے۔ خدا تمھیں تمہارے امتحانات میں کامیاب کرے۔

✉: ایم وارث بیگ ضلع ٹوبہ چک نمبر 190 گ ب وال سے پہلی بار شاملِ احوال ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ پیارے پیارے بھیا کاشی چوہان جی نیک دعاؤں کے ساتھ پہلی بار آپ کی خدمت اور آپ کی میٹھی اور نرالی بزم سچی کہانیاں میں شرکت کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے ضرور اس بزم میں خوش آمدید کہیں گے۔ کاشی بھائی مارچ کا پراسرار نمبر بہت کامیاب تھا۔ احوال میں لوگوں کی چٹ پٹی باتیں اور لوگوں میں پیار و محبت دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ میں سچی کہانیاں اب باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں پہلے پہل تو میں سچی کہانیاں اپنے پیارے دوست اور بھائی محمد قاسم خان بلوچ سے لے کر پڑھتا تھا۔ میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور یہ سچی کہانیاں رسالہ قاسم بھائی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے مجھے سے منگواتے ہیں۔ کیونکہ میں روز ٹوبہ میں اپنے کالج جاتا ہوں اور اب میں ایک پرچہ اپنے لیے بھی اضافی لیتا ہوں۔ اب یہ رسالہ میرے دل میں سما گیا ہے۔ امید ہے اس رسالے سے میری محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔ کہانیوں میں جناب محمد سلیم اختر صاحب کی سترہواں مسافر بہت پسند آئی۔ اس کے بعد ایک اچھے لکھاری ممتاز احمد جی کی کہانی حسد کی آگ بھی دل کو بھا گئی۔ جاوید راہی کی کہانی منی باجی بھی دلچسپ تحریر تھی۔ کشاف اقبال اور ارم خان کی کہانیاں اچھی لگیں۔ باقی تمام تحریریں وقت ملنے پر ضرور پڑھوں گا۔ ہائیڈ پارک تو ہمیشہ ہی زبردست ہوتا ہے۔ خاص طور پر چٹ پٹے لطیفے اور اچھی باتیں۔ شازیہ رضوی کا شعر بہت بہت اچھا تھا۔ سچ میں انسان کو ماں کی میٹھی گود میں سکون آ جاتا ہے۔ اب میں پیارے کاشی آپ سب سے اجازت لوں گا نیک دعاؤں کے ساتھ۔ اگلی بار پھر شاملِ احوال ضرور ہوں گا آپ کے حوصلے دینے پہ۔

☆: پیارے وارث! خوش آمدید! تمہارا اتنا بھرپور تبصرہ سچ میں مزہ دے گیا۔ خوش رہو۔ اب تمہارے اگلے ماہ کے تبصرے کا تو ہمیں ابھی سے انتظار ہونے لگا ہے۔

✉: سیدہ حجاب فاطمہ، کراچی سے لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے مجھے دوبارہ سچی کہانیاں میں جگہ دی اور کاشی بھائی میری کہانی کو سچی کہانیاں میں شامل کیا۔ کاشی بھیا آج میں جو بھی ہوں اپنی ماں کی دعاؤں اور سچی کہانیاں کی مرہونِ منت ہوں۔ اب ذرا بات ہو جائے اس دلربا کی جس نے ہمارے من آنگن میں محبتوں کے جھولے ڈال رکھے ہیں۔ یکم مارچ بڑی بے چینی سے ہاکر کا انتظار کر رہے تھے۔ جو آواز سنی تو دوڑے مگر یہ کیا وہ تو یہ کہہ کر اپنی راہ ہو لیے کہ شمارہ ابھی نہیں آیا۔ منہ لٹکائے ساس کے پاس آئے تو انھوں نے عندیہ دیا کہ تمہاری کوئی کتاب آئی ہے۔ امید تو امید ہوتی ہے نا اسی کے سہارے قیاس کیا شاید جو کہانی بھیجی تھی

وہ لگ گئی ہو اور جب بیڈ پر پڑی اعزازی کاپی پر نگاہ پڑی تو دل بلیوں اچھل کود کرنے لگا۔ شمارہ صفحہ اول سے صفحہ آخر تک آپ کی محنت اور لگن کی دلیل ہے۔ منزہ جی کے ساتھ ساتھ ہمارے بھی الفاظ کہیں کھو گئے ہیں کہ بچیا ایک خزانہ تھیں۔ اسماء اعوان کی لائف بوائے بہت اچھی جا رہی ہے ہر ماہ ایک اچھوتا خیال لایا کرتی ہیں۔ سترہواں مسافر، معاف کردو، روم نمبر 607، گم شدہ چہرہ، بھوک، عرشی کون تھی، ہانڈی بہترین تحریریں رہیں۔ ایک تصویر ایک کہانی اچھا سلسلہ ہے دانیال نے اس بار بھی چھوٹے خیال سے بڑا کردار بنا ڈالا۔ علی حسنین تابش کی سنپولیے اور محمد یوسف لغاری بھائی کی سرخ لیموں بھی بیسٹ رہیں۔ باقی پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے مگر یہی کہوں گی کہ جب پڑھوں گی تو آگے بھی مزیدار ہی ہوگا۔ اب اجازت کہ ویسے ہی میں لیٹ ہو چکی ہوں اور ایسا نہ ہو کہ احوال میں حاضری سے رہ ہی جاؤں۔

☆: اچھی بہن! بس آپ غیر حاضر ہوتے ہوتے رہ گئی ہیں۔ امید ہے آئندہ اس طرح کا مزیدار تبصرہ آپ ہمارے لیے ہر ماہ بہت جلد اور وقت پر عنایت فرمایا کریں گی۔

✉: قندیلہ ضنم خان بھی تحصیل ماموں کانجن چک نمبر 509 گ ب سے پہلی بار احوال میں شرکت کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ اس بار میں اپنے خوب صورت شہر ماموں کانجن تحصیل کی مارکیٹ میں کچھ کتابیں خریدنے گئی تو بک اسٹال میں میری نظر سچی کہانیاں پر پڑی تو خیال آیا کہ آج اپنے ساتھ یہ رسالہ بھی لے جاتی ہوں۔ ویسے تو میں ایک اور رسالے کی بھی فین ہوں لیکن جب میں نے اس رسالے کو پڑھا تو یقین کریں دل کو یہ ڈائجسٹ بھا گیا۔ میں اس کی اپنی طرف سے جتنی بھی تعریفیں کروں کم ہیں۔ بہرحال جو دل کو اچھا لگ رہا ہے اس خوب صورت ڈائجسٹ کے لیے وہ لکھ رہی ہوں۔ اس رسالے کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ میں بھی اس میں خط لکھوں اور اس بزم کی رکن بنوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے پورا رسالہ تین دن میں پڑھ لیا۔ خوف ناک اور پراسرار کہانیاں پڑھتے ہوئے بہت مزا آیا۔ ہر رائٹر نے اپنی کہانی لکھنے پہ بہت محنت کی۔ الفاظ کھو گئے منزہ سہام کا لکھا ہوا پسند آیا۔ کہانیاں تو سب کی اچھی تھیں مگر سترہواں مسافر، سب کچھ تیرا ہے، وہ بڑھیا کون تھی، اک پل میں سب کچھ، روم نمبر 607، حسد کی آگ یہ کہانیاں کچھ زیادہ اچھی لگیں۔ شاعری بھی بہت جاندار تھی۔ تبصروں میں سب کے خطوط اچھے لگے۔ اگلی بار سچی کہانیاں میں امید ہے اپنا تبصرہ بھی پڑھنے کو ملے گا اگر کاشی بھیا نے میرا یہ خط شامل کر لیا تو۔ اس بار تو میں مختصر سا خط لکھ رہی ہوں لیکن اگلے ماہ تفصیل سے تبصرہ لکھوں گی۔ تاکہ ہم بھی اپنے دل کی باتیں لوگوں تک پہنچا سکیں۔ اور میں اپنی تمام دوستوں کو یہی کہوں گی کہ سچی کہانیاں پڑھو یہ ایک اچھا ڈائجسٹ ہے۔

☆: پیاری سی قندیلہ! خوش آمدید! تمہارا جتنا پیارا نام، اتنا ہی پیارا تبصرہ بھی تھا۔ احوال میں تمہاری آمد کا شدت سے انتظار ہے گا۔

✉: پھولوں کی نگری پتوکی سے محمد ندیم عباس میواتی اپنے تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ یوں تو ہمارا شہر پتوکی زبریوں، پھولوں کی نسبت پورے ملک میں شہرت رکھتا ہے۔ لیکن موسم بہار میں تو جنت کا ٹکڑا ہی لگتا ہے۔ آج میں احوال گلشن کے آنگن میں بسنے والے قارئین کی خدمت میں انہی پھولوں کو لے کر حاضر ہوں سب سے پہلے محترم ایڈیٹر بھائی کاشی چوہان تازہ گلابوں کا گلدستہ قبول کریں۔ نئے مہمانوں کو دل کش مسکراہٹ سے خوش آمدید۔ پھر پیاری سسٹر منزل خان، نازیہ بتول، بڑی آپا، مسز نوید ہاشمی، ام عادل، کنزہ ملک، آپی صائمہ مجید اینڈ بابا مجید احمد، ملازم حسین، شاہد رفیق، ابوہریرہ بلوچ، عثمان بلوچ، منعم اصغر، یاسر، ندیم ڈھکو، راشد لطیف، خضر حیات، خادم حسین، علی حسنین تابش، سب نے بہت بھرپور تبصرے لکھے۔ میری طرف سے سلام اینڈ گلابوں کے گلدستے قبول فرمائیں۔ ڈیئر سسٹر سدرہ انور علی آپ کو بھی گلدستہ، تبصرہ شاندار۔ آپ اسٹوری بھی لکھا کریں۔ ڈیئر سسٹر سیدہ حجاب فاطمہ وہ بڑھیا خوشبو کی دیوانی تھی۔ لو گلابوں کی خوشبو والا گلدستہ اب ذرا بچ کر رہنا۔ (ہاہاہاہا)۔ معاف کردو، حنا بشریٰ، بھوک، عرشی کون تھی، ہانڈی، سرخ لیموں، سپنو لیے، علی حسنین تابش، تمہارے ساتھ ساتھ نازیہ بتول، دوسری دنیا کا عشق، منعم اصغر، آٹھ کہانیاں، فرح انیس، ہماری ادھوری کہانی، منی باجی، محترم جاوید راہی، حسد کی آگ، ممتاز احمد، زہر عشق، محترم بھائی کاشی چوہان اور ڈیئر ارم خان سب کچھ تیرا ہے۔ بہت اچھی تھیں۔ سب کے لیے گلابوں کے گلدستے حاضر خدمت۔ ایکسٹرا جو لینا چاہے وہ پتوکی آجائے۔ تیر نیم کش اور ہائیڈ پارک مسلسل زبردست رہا۔ یوں پورا شمارہ بیسٹ تھا۔ ویلڈن کاشی بھائی۔ زندگی نے وفا کی اور ایگزام سے فرصت ملی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک فی امان اللہ۔

☆: ندیم شہزادے! ہمیشہ گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھول لیتے ہوئے اب ہمیں بھی محتاط رہنا ہوگا۔ تبصرہ زبردست رہا۔

✉: مجید احمد جائی، ملتان شریف سے عرض کرتے ہیں۔

ماشاءاللہ! ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔ اداریہ ''الفاظ کھو گئے'' رلا دینے والا تھا۔۔ محی الدین نواب، فاطمہ ثریا بجیا اور کاشف زبیر کا یوں اچانک چلے جانا غم زدہ کر گیا۔۔۔ ماہ فروری بڑا بھاری گزرا ہے۔ ادب کی نامور شخصیات داغ مفارقت دے گئیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے آمین۔ احوال میں قدم جمے تو کاشی بھیاء ہم سے مخاطب تھے۔ عرض کروں گا کہ اپنی کہانی ''وہ مراطیب خاص'' کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اور اب دس ماہ گزر گئے لیکن یہ معاملہ پھر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں حیران ہوں کہ میرے خصوصی دوست کیا چاہتے ہیں۔۔۔ یہ کہانی میری ذات پر مبنی ہے اور اب میں نئی زندگی جی رہا ہوں۔۔۔ میں بیس کروڑ عوام تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا تھا، اپنا پیغام دینا چاہتا تھا جو مایوس ہو جاتے ہیں اُن کو کہنا چاہتا تھا کہ مایوسی گناہ ہے۔۔۔ مایوسی کرنے کی بجائے اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھیں اور اگر ہم میں سے کوئی بھی کسی بیماری میں مبتلا ہے تو اُس

کا علاج سنت نبوی سمجھ کر کرائے۔اس لئے یہ غلطی سرزد ہوئی۔۔۔اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔۔سستی شہرت۔نہ دل آزاری۔۔احوال میں تمام کے تبصرے جامع اور جاندار تھے۔۔۔سب سے سپرہٹ خط پیارے ممتاز احمد سرگودھا کا لگا۔۔کاشی بھائی آپ کی نظم اِس دفعہ پھر غائب ہے۔۔کیوں۔۔۔؟ کہانیوں میں سب سے پہلے ممتاز احمد حسد کی آگ پڑھی۔واقعی حسد کی آگ انسان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔سرخ لیموں شان دار تحریر تھی۔مہاناناگ بہت خوب کہانی تھی' وہ بڑھیا کون تھی؟ مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔زہر عشق پر اسراریت کا جادو چڑھا رہی ہے۔اس کے علاوہ باقی تحریریں زیرِ مطالعہ ہیں۔تبصرے سے معذرت پر اسرار نمبر ون نمبر ون ہی رہا۔خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں۔

☆: پیاری مجید! تم نے وضاحت دی اچھا لگا۔مگر......زندہ رہیں وہ لوگ جو مرنے نہیں دیتے۔

✉: تانیہ راجپوت' لاہور سے پہلی بار ہم سے مخاطب ہیں۔پیارے کاشی بھیا کیسے ہیں۔۔۔؟ اوہ سوری سب کو سلام کرنا تو بھول گئی۔تو لیجئے سب کو سلام کرتے ہیں۔سب لوگ کیسے ہیں؟ میں تو ایک دم فٹ فاٹ۔سرورق بہت بہت بہت اچھا اور خوفناک تھا۔ڈیئر سدرہ! کیسی ہو؟ آپ کا لیٹر زبردست ہوتا ہے۔باقی سب بھی اچھا لکھتے ہیں۔سوچا آج خاموشی کا در پھلانگ کر محفل کی گپ شپ میں حصہ لیا جائے۔ٹھیک ہے نا کاشی بھیا؟ کہانیاں ایک دم فٹ تھیں۔''آپی حجاب'' کی اور ''آپی تحسین جونیجو'' کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔علی حسنین تابش' سلیم انکل' کی بھی اچھی تھیں۔میرے خیال سے میری آمد سب کو پسند آئی ہوگی۔یہ سلسلہ جاری رہے گا۔کاشو بھیا آپ کا ناول؟ واہ واہ واہ دل چاہتا ہے آپ کے ہاتھ چوم لوں۔سلمان ابراہیم کا کردار مجھے بہت پسند آیا۔اوکے اب کاشو بھیا جانے دیں۔اللہ حافظ۔

☆: ارے گڑیا! تم نے تو مجھے نانا نانی کی یاد دلادی! وہ مجھے کاشو ہی کہا کرتے تھے۔اوہ تمھیں خوش آمدید کہنا تو ہم بھی بھول گئے۔ویلکم ٹو احوال۔

✉: یہ آمد ہے جیکب آباد سے آپی پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل کی۔لکھتی ہیں۔حسب معمول پرچہ وقت پہ مل گیا تھا دلچسپ اتنا تھا، کہ جی چاہ رہا تھا۔بہت آہستہ آہستہ مزے لے کر پڑھوں۔بعدازاں خیال آیا کہ خط بھی لکھنا ہے۔آج جب پڑھ لیا تو تم نے فون پہ کہا آپی، آپ بہت لیٹ ہوگئی ہیں۔سو میں اس برقی سہولت کے توسط سے خط لکھ رہی ہوں بجیا کے انتقال کا بہت دکھ ہوا۔یہ صدیوں کا صدمہ ہے۔اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔آمین کاشو۔(یہ تمہارا نیا نام ہے) تم نے شاعری کا صفحہ پھر غائب کر دیا۔کیوں معصوم شاعروں کی دعائیں لیتے ہو۔کہانیاں سب بہت بہت بہت ہی اچھی تھیں۔کسی ایک کی تعریف کی اور ایک کی بھی نہ کی تو یقین کرو کہ ناانصافی ہوگی۔زہر عشق کی کیا بات کریں، تمہارے قلم میں سحر ہے۔لیکن اصل لطف جب آئے گا جب یہ کتابی شکل میں ہمیں ملے گی، تاکہ ایک ہی نشست میں زوق کی تسکین ہو۔میری کئی غزلیں تمہارے پاس ہیں، آگے سمجھ جاؤ۔اوکے بیٹا اب اجازت دو۔مشینی کمپوزنگ پہ اتنی مہارت نہیں ہے کہ ایک بہت طویل خط لکھ سکوں۔اس لیے

شعروشاعری سے گریز بھی کیا ہے اور ڈاکٹر نے پرہیز بھی بتایا ہے۔سو خدا حافظ۔

☆: پیاری آپی! آپ بھلے سے دو لفظ لکھ دیں لیکن شاملِ احوال ضرور ہوا کریں۔اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉: شیخوپورہ سے احتشام شامی لکھتے ہیں۔مارچ کا شمارہ لاہور سے خریدا۔سرورق حسب معمول خوبصورت تھا پر سرار نمبر کے لحاظ سے۔کہانیوں کی فہرست پر نظر ڈالی اور احوال میں پہنچے جہاں احتشام اور منعم ساتھ ساتھ بیٹھے نظر آئے۔ہاں جی ہم دوست ہی اتنے اچھے ہیں۔پرسرار نمبر کی سات خاص کہانیوں میں نمبر ایک پر رضوانہ پرنس کی ''بھوک'' رہی، نیلما کی موت پر افسوس ہوا دوسرے نمبر پر ''گم شدہ چہرہ'' رہی۔شانی خامان نے خوبصورتی سے کہانی بنی۔ایسے بہت سے الجھی باتیں کرنے والے افراد ہمیں آس پاس نظر آجاتے ہیں اور ان کی بہکی بہکی باتیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیتی ہیں۔نفیسہ سعید کی روم نمبر 607 تیسرے نمبر پر آئی۔ہمارے قرآن پاک کے کلام میں وہ خاصیت ہے جو شیطانی بلاؤں کو بھگا سکے۔عرشی کون تھی۔۔۔۔؟ کاشی بھائی آپ کو معلوم ہے۔۔۔۔؟ سنپولیے'' علی حسنین تابش نے بھی خوب لکھی۔''ہماری ادھوری کہانی'' کشاف اقبال نام کی طرح کہانی بھی ادھوری ادھوری لگی۔وہ بڑھیا کون تھی، بیٹا دے یا مایا، حلوہ کھاؤں گی بھی بہترین تھیں۔''بادبان'' نعمان اسحاق بہت زبردست لکھ رہے ہو۔''حسد کی آگ'' ایک بہترین سبق آموز تحریر تھی۔ممتاز احمد صاحب نے بہت بہتر لکھا۔خیر اور شر کی جنگ میں جیت ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔اللہ نسرین جیسی کم عقل عورتوں کو ہدایت نصیب فرمائے۔

☆: بھائی احتشام! تبصرے کا شکریہ۔کہانی پڑھ لی ہے بہتر ہے۔مگر ہمیں تو مزید بہتر چاہیے۔

✉: غلام مرتضیٰ قبلی۔فاروق کالونی چشتیاں سے پہلی بار مختصر نامے کے ساتھ موجود ہیں۔تمام مدیران، اسٹاف اور قارئین کو سلام۔شمارہ ''سچی کہانیاں'' ایک مکمل فیملی ڈائجسٹ ہے۔اس کو اسی وجہ سے بے حد پذیرائی حاصل ہے۔اسکول لائف سے آج ٹیچنگ لائف میں بھی ''سچی کہانیاں'' کا قاری ہوں۔پراسرار نمبر کے لیے بے حد منتظر رہتا ہوں۔ماہ مارچ کا پراسرار نمبر بہت پسند آیا۔اللہ اس ڈائجسٹ کو اور تمام

طویل کہانی نمبر 2

پیارے ساتھیو! طویل کہانی نمبر کا اعلان ہوتے ہی آپ کی بے شمار کہانیاں ہمیں موصول ہوئیں۔ایک پرچے میں تمام منتخب کہانیاں سمونا ممکن نہ تھا۔اس لیے اگلے ماہ یعنی ماہِ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ہوگا۔امید ہے طویل کہانی نمبر آپ کی توقعات پر پورا اترے گا۔اور اگلے ماہ کے پرچے کا آپ کو بے چینی سے انتظار ہوگا۔

نوٹ فرمالیں۔ماہِ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ہوگا۔

ایجنٹ اور ہاکر حضرات نوٹ فرمالیں۔سچی کہانیاں ماہِ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ہوگا۔

اسٹاف کو ہمیشہ خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

☆: ارے بھائی قبلی! خوش آمدید۔ اتنا پرانا تعلق اور لکھیں تو صرف دو سطریں۔ امید ہے اگلے ماہ تمہارا تفصیلی تبصرہ ہمارے پاس ہوگا۔

✉: چشتیاں سے ہمارے ساتھی علی حسنین تابش برقی نامے کے ساتھ شامل احوال ہے۔ لکھتے ہیں۔ پراسرار نمبر مارچ کی 4 تاریخ کو ملا۔ سرورق پسند آیا۔ اداریہ تو آنکھیں نم کردینے والا تھا۔ احوال زبردست رہا۔ اپنی کہانی شائع ہونے پر دلی خوشی ہوئی۔ سلیم اختر صاحب' سید حجاب فاطمہ' یوسف لغاری' ممتاز احمد صاحب کے ساتھ ساتھ محترمہ تحسین جونیجو اور باقی سب رائٹر کی کہانیاں پسند آئیں۔ کاشی بھائی آپ کا ناول زبردست جارہا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ اب اجازت۔

☆: پیارے تابش! تبصرے کا شکریہ۔ بھئی اب تم سے ہمیں کوئی یادگار سی کہانی چاہیے۔ امید ہے میری بات سمجھ گئے ہوگے۔ خوب محنت کرو۔

لیجیے ساتھیو! اس ماہ تک کی ہماری آپ کی ملاقات پہنچی اپنے اختتام تک۔ پہلا طویل کہانی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پڑھیے اور اپنی رائے سے نوازیے کہ ہماری سخن کاری آپ کی امیدوں پر کس حد تک پوری اتری۔ کہ ہم نے تو کردیا ہے بند اک کوزے کو دریا میں پھر سے...... اجازت سے پہلے ایک تازہ ترین نظم آپ کی بصارتوں کی نذر۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔

شہر' جنگل......اور......

چاند جنگل سے جب گزرتا ہے
کیسا شفاف سے وہ دِکھتا ہے
آتے آتے مرے شہر کی طرف
میلا میلا سے کیوں وہ دِکھتا ہے
شہر میں میرے سمندر بھی ہے
اِس سمندر میں کتنی ڈوبی ہیں
میری حسرت کی سیپیاں یارو!
جن سے بوجھل ہے سمندر بھی مرا
چاند میرے ! تو اب اداس نہ ہو
سنتے ہیں امن ہوگیا ہے یہاں
سر نہیں کٹ رہے ہیں اب پھر سے
لوگ بس آستیں سے نکلے ہیں
تو بھی شفاف ہوجا چاند مرے
اس شہر کو سمجھ کے جنگل اب

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

بیوٹی گائیڈ

"حسن اور طرز زندگی"

دنیا میں زیادہ تر یعنی 70 فیصد لوگ صحت مند ہوتے ہی نہیں ہیں۔ زیادہ تر لوگ اپنی صحت کا خیال رکھتے ہی نہیں' انہیں پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ وہ کیا اور کتنا کھا رہے ہیں۔ کتنی ورزش کر رہے ہیں اور کر بھی رہے ہیں یا نہیں۔

صحت صرف یہ ہی نہیں ہے کہ آپ بیمار نہیں ہوتے تو آپ صحت مند انسان ہیں اگر آپ!

مہرین اسماعیل

☆...... اخلاقی طور پر

☆...... جسمانی طور پر

☆...... ذہنی طور پر فٹ ہیں تو آپ صحت مند انسان ہیں ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اسمارٹ اور دلکش نظر آئے صحت مند و تندرست رہے صحت مند ہونے کے لیے ہمیں خود اپنے آپ کو بدلنا ہوگا خود سے عہد کرنا ہوگا کہ مجھے صحت مند ہونا ہے۔ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی بدلنی ہوگی کیونکہ ہماری طرز زندگی ہماری صحت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جب تک ہم خود نہیں سوچیں گے جب تک کچھ نہیں ہوسکتا چاہے ہم کتنی ہی ورزش کیوں نہ کرلیں۔ صحت مند و تندرست رہنے کے لیے اور خوبصورت و دلکش نظر آنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے جسم کے ہارمونز کو ٹھیک کریں ہمارے جسم میں چھوٹے چھوٹے ہارمونز ہوتے ہیں جو اثر انداز ہوتے ہیں ہماری صحت پر۔ اگر ہمیں صحت مند ہونا ہے تو ہمیں اپنے جسم کے ہارمونز کو ٹھیک کرنا ہوگا ہمارے جسم کے ہارمونز پر اثر انداز ہوتا ہے ہمارے آس پاس کا ماحول جیسے! ☆......

لائٹ ☆...... نیند ☆...... ذہنی

دباؤ ☆...... غذا

☆...... ورزش



ہماری صحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا خاص خیال رکھیں ہارمونز کو اچھا کرنے کے لیے ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں غیر ضروری عادتوں کو ختم کرنا ہوگا اگر کوئی انسان دبلا پتلا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ صحت مند ہے ورزش صرف دبلا پتلا ہونے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ صحت مند ہونے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ہلکی پھلکی ورزش کریں۔ ہماری زندگی میں اگر ہم ورزش کو شامل کریں تو اس سے ہم چست و توانا رہیں گے اور کئی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے اپنی زندگی کے روزمرہ کام کرنے میں کافی آسانی پیدا ہو جائے گی ہم جو بھی کھائیں گے۔ ہلکا محسوس کریں گے ہمیں اپنا آپ اچھا لگے گا رات کی نیند کا ہونا بہت ضروری ہے موٹاپے کا نیند سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے رات کی نیند لیں۔

اکثر خواتین و حضرات اپنی روزہ مرہ زندگی کے کام کاج میں اتنے معروف ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ذہنی دباؤ کا شکار ہونے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ کئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے اپنے ذہنی دباؤ کو اپنے اختیار میں لائیں اپنے رہن سہن کو بدلیں اپنی زندگی میں ورزش کا معمول بنانے سے ہم مختلف قسم کی بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ غذا کی کمی یا زیادتی یا اس میں تبدیلی آپ کی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں اگر آپ چست و توانا ہیں اور اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمیں کیا چیز اور کتنی مقدار میں کھانی ہیں آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم جو چیز کھائے اس کے حصے بنالیں۔ موٹاپا ایک بیماری ہے جو ہماری زندگی ہماری صحت کے لیے اچھی نہیں ہے اس لیے یہ بات ضروری ہے کہ آپ ایک ایسی طرز زندگی متعارف کروائیں۔ جس میں آپ ہر وقت اپنے آپ کو چست و توانا محسوس کریں اچھی طرز زندگی آپ کو صحت مند اور خوبصورت بنانے میں مدد دیتی ہے۔

جس کی وجہ سے آپ اپنی عمر سے کئی گناہ کم دکھائی دیتے ہیں اور ایک باوقار شخصیت بن جاتے ہیں۔

لائف بوائے..... چمتکار دکھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

زندگی میں بہت ساری چیزیں انسان خود بخود شامل کر لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ مجھے ہر ایتھنک چیز اپنی جانب اٹریکٹ کرتی ہے۔ کیا کروں؟ سمجھ ہی نہیں آتا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ خوبصورتی خود بھی سب سے بڑا میگنیٹ ہوتا ہے۔ بہت دور نہ جائیں، ابھی لاسٹ ویک اینڈ کی ہی تو بات ہے۔ مسز صدیقی کے ہاں پارٹی میں کچھ مہمان سرحد پار سے بھی آئے ہوئے تھے۔

میرے لیے صرف مسز مہتا ہی کی ذات قابلِ رشک تھی۔ مجھے ان میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے سیاہ گھنے بال اور ان کی کمر پر ناگن کی طرح بل کھاتے محسوس ہوتے تھے اور وہ آبنوسی رنگ کی ساڑی پر کیا جچ رہے تھے۔ مسز صدیقی کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں جس قدر دل خراب کیے ہوئے تھی، مسز مہتا کو دیکھ کر میں نہال ہو گئی۔

ہر چیز کا سے ہوتا ہے۔ خوشی اور غمی کا بھی سو یہ میرے لیے خوشی کا سے تھا۔ مجھے مسز مہتا ایک ایتھنک ہی لگ رہی تھیں، ایسا شاہکار جس کے لیے لوگ ملین ڈالرز کی بولی لگا دیں۔ دیکھیے ذہنی رو کس طرف بھٹک گئی۔ ان کا نمکین چہرہ میری آنکھوں میں جیسے جم سا گیا تھا۔ شاید وہ بھی میری دلچسپی بھانپ گئی تھیں۔ وہ خود ہی میری طرف آ گئیں۔ اور میری طرف دوستانہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''ہیلو! آئی ایم مسز مہتا، پاروتی مہتا! آپ شاید مجھ میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔''

''گڈ ایوننگ! آئی ایم روبینہ امان! میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔''

''واٹ ڈیو یو مین؟'' انہوں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''مجھ میں مجھ ہی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ویری نائس۔ کافی دلچسپ ہیں آپ۔''

''مجھے ہر......'' یکدم میں کہتے کہتے رک گئی کہ مجھے ہر اینٹک چیز پسند ہے۔ مبادا وہ برا ہی نہ مان جائیں۔

عورت عمر کے آخری حصے میں بھی خود کو بوڑھا اور ادھیڑ عمر کہنے کی اجازت کبھی کسی کو نہیں دے سکتی۔ عورت کی عمر ہمیشہ 16 سے شروع ہوتی ہے اور 25 پر ختم ہوجاتی ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔ ظاہر ہے میں خود عورت ہوں لہٰذا میں کس طرح اس تجزیے کے منافی بات کرسکتی ہوں۔

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ تھوڑا سنجیدہ ہوئیں۔

''آپ کھل کر بات کریں۔''

''مجھے ہر حسین چہرہ اپنی جانب کشش کرتا محسوس ہوتا ہے۔ آپ میں ایک بہت خاص اٹریکشن سی فیل ہوئی تھی مجھے...... اور مجھے یہ امید نہیں یقین ہے کہ آپ میں کچھ تو اسپیشل ہے۔''

آخر میں نے دل کی بات لبوں سے آزاد کردی اور اب میں مسز مہتا کا ردِعمل دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ میری بات کا کہیں برا تو نہیں مان گئی ہیں۔

''سنا تھا پاکستانی بہت گہری نگاہ رکھتے ہیں مگر آج یہ یقین بھی ہوگیا۔'' وہ مسکراتی چلی گئیں۔

''اِس کا مطلب ہے جو بات میں نے محسوس کی وہ سچ ہے۔'' میں نے فوراً کہا تھا۔

''جی بالکل! اور ہاں میں چار دن اور یہاں کراچی میں موجود ہیں۔ مجھے امید ہے ہم پھر سے ایک بار ضرور ایک دوسرے سے ملیں گے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے ایک کارڈ میری جانب بڑھایا۔

کارڈ کی بیک پر ایک فون نمبر جو یقیناً ان کے موجودہ استعمال میں تھا، درج تھا۔ میں نے ان کو گلے لگالیا اور پھر ہم دونوں ہی اُس تقریب کا حصہ بن گئیں۔

میں نے گھر آتے ہی مسز مہتا کو فون کیا اس طرح ان کے پاس میرا رابطہ نمبر بھی منتقل ہوگیا۔

☆......☆......☆

'کراچی سے بہت اہم ترین امور کے سلسلے میں کس بندے کو بھیجا جاسکتا ہے۔ جو اِن ڈاکومنٹس کو فائل کرا کرلے آئے۔'

روبینہ بہت پریشان تھیں۔ امان مرزا کی کمپنی نے بہت اہم ڈیل کی تھی اور وہ اس وقت چونکہ خود لندن میں تھے۔ ڈیل پرا پر طریقے سے سائن کرانے کی ذمہ داری روبینہ پر آن پڑی تھی۔ مگر وہ کچھ دنوں سے مَیگرین کا شکار تھیں۔

اب کیا کیا جائے۔

وہ پریشان ہوگئیں۔ ان کے ذہن میں اچانک ہی صبح کی کال آگئی۔ ان کا چھوٹا بیٹا آج ہی ایگزامز سے فارغ ہوکر اپنی اسپورٹس پریکٹس کے لیے پندرہ دن کے لیے لاہور جارہا تھا۔

تھا تو لاابالی ہی لیکن دو بیٹوں کے بیرون ملک شفٹ ہوجانے کے باعث بڑا ذمہ دار ثابت ہوگیا تھا۔

اب یہ ذمہ داری اگر وہ ٹھیک سے نبھا لیتا تو اُسے رائٹ چوائس کا ٹیگ دیا جاسکتا تھا۔ روبینہ نے فوراً ہی اُسے کال ملائی اور پھر شام تک وہ لاہور جانے کے لیے راضی ہوچکا تھا۔

☆......☆......☆

'' مما میں آپ کو ہاسپٹل لے چلتا ہوں۔'' بازل نے محبت سے کہا۔

''نو مائی سوئٹو! آئی ایم فائن ڈارلنگ!''

''ڈیئر! سچ پوچھو تو اگر میری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں بھی اپنے سوئٹو کو یہ بودر (تکلیف) نہ دیتی۔''

''مما کیسی باتیں کررہی ہیں آپ...... یہ تو

اپنا کام ہے۔ اِٹس آ پارٹ آف بزنس...... میں بھلا کس طرح اس بات کو بودر (تکلیف) سمجھ سکتا ہوں۔"

"لو یو مائی سن! میرا بیٹا تو سچ مچ بہت ذمہ دار ثابت ہو گیا ہے۔"

"مما آپ کی ہمیشہ ایک بات مجھے یاد رہتی ہے کہ تم تینوں اپنے فادر کا رائٹ ہینڈ ہو۔ کبھی میں یہ نہ دیکھوں کہ تم تینوں میں کوئی کلیش ہو اور تمہارے فادر ڈسٹرب ہوں۔"

مما ہمیشہ سے میں نے دونوں بڑے بھائیوں کو پاپا کے بزنس میں ہاتھ بٹاتے دیکھا ہے۔ اب اگر یہ تھوڑا سا کام میرے ذمہ آپ نے لگا دیا ہے تو کیا میں اس سے منہ موڑ لوں۔ نیور مما۔ آئی لو مائی پیرنٹس۔ آئی لو یو۔"

میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ یہ تربیت کا اثر ہوتا ہے جو ہمیں انعام کی صورت ملتا ہے۔

"مما آپ ایزی فیل کر رہی ہیں نا۔"

بازل نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کر دیے۔

"او کے جانو! اب تو لگتا ہے سب ٹھیک ہے۔"

مجھے پھر سے میگرین محسوس ہو رہا تھا مگر میں بازل کو اس وقت ڈسٹرب کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

"مما آپ ہمیشہ مجھے اپنے دیے گئے حکم پر اوبیڈئنٹ پائیں گی۔ لیکن ایک وعدہ کریں کہ آپ ڈاکٹر کے پاس لازمی جائیں گی۔"

"او کے جانو! میں چلی جاؤں گی۔ ڈونٹ وری۔"

بیٹے کی محبت سے سرشار میں اپنی طبیعت میں بہت بہتری پا رہی تھی۔ اولاد کا سکھ تو آپ ہی ایک فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔ میں اسی سرشاری میں گم تھی کہ موبائل پر بیپ ہونے لگی۔

"ہیلو! کیسی ہیں آپ مسز امان!" فون پر مسز مہتا تھیں۔

"بس کچھ میگرین کی شکایت ہے۔"

"اوہ! اب تو مجھے آپ کے پاس آنا ہی پڑے گا۔ آئی وڈ لائک ٹو میٹ ود یو!"

"آپ کس جگہ پر قیام پذیر ہیں مسز مہتا؟"

میرے اِس سوال پر انہوں نے مجھے اپنی ریذیڈنس کے بارے میں مطلع کیا۔

"میں ابھی ڈرائیور بھیج دیتی ہوں۔ یقین کریں اگر کچھ بہتر فیل کرتی تو خود لینے آتی مگر......"

"اِٹس او کے! اِٹس ناٹ آمیٹر۔" یہ کہہ کر فون بند ہوا اور میں نے فوراً ہی ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا کر مسز مہتا کی طرف روانہ کر دیا۔

☆......☆......☆

"سو نائس آف یو مسز امان! واٹ آ پیلس!"

مسز مہتا مسلسل ہمارے آشیانے کو سراہ رہی تھیں۔ میرے لیے اب یہ باتیں قطعاً معنی نہیں رکھتی تھیں۔ گھر ایک خواب ہوتا ہے اور اگر خدا آپ کے خواب کو خوابوں جیسا ہی گھر دے تو پھر جنت کا نظارہ اِس دنیا ہی میں ہو جاتا ہے۔

"اب بتائیں کہ آپ کو میگرین کی شکایت کب سے ہے؟" مسز مہتا ڈاکٹر بن گئیں۔

"پہلے بتائیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔"

"ہوم ڈاکٹر کہہ سکتے ہیں۔"

"او کے...... بس مجھے دوسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد سے یعنی بیس برس سے پرابلم ہے۔"

"اسٹریس کیوں لیتی ہیں ہر بات کا۔"

انہوں نے جیسے میرے اندر جھانکا تھا۔

"میں...... میں تو کسی بات کا اسٹریس نہیں لیتی ہوں۔" میں گڑبڑائی۔

"ایک بات ہم دونوں ملکوں کے عوام میں بہت عام ہے۔ ہماری عورتیں برداشت کے سمندر اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ہر زیادتی اور ظلم سہہ کر بھی......سب کچھ OK ہے کا نعرہ لگاتی ہیں۔"

"ارے ارے مسز مہتا ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ خیال نہ کریں۔ آئی ایم فائن۔"

"گڈ!" وہ استہزائیہ مسکرائی تھیں۔

"آپ بالوں کے لیے کیا استعمال کرتی ہیں۔ مطلب بالوں کو بھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور بال جاندار ترین شے ہیں۔ یہ تو آپ جانتی ہیں۔"

"جی بالکل! کچھ خاص نہیں۔ بس شروع سے ہی امپورٹڈ آئلز، شیمپو اور کنڈیشنز یوز کرتی رہی ہوں۔ اِس عمر میں آ کر کیا قلابے ملاؤں۔"

میں مسکرائی، اچانک سے آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئیں۔

"آئی تھنک یُو فِیل میگرین ناؤ!"

"بس کچھ......" میں نے ماتھے پر انگلیوں سے مساج کرتے ہوئے کہا۔

"آئی ہیو آ سولوشن!" انہوں نے اپنے بیگ سے ایک بوتل نکالی۔ اُس بوتل سے کور ہٹا ہوا تھا یعنی بالکل وائٹ بوتل تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"یہ آپ کے لیے ایک علاج ہے۔ آپ جائیں اور نیم گرم پانی سے شاور لیں۔ سر کو اس شیمپو سے دھو کر آئیں۔ تب تک میں آپ کے فیملی البم دیکھتی ہوں۔ یقیناً جس طرح تصویروں سے آپ کے کمرے کی Walls سجی ہیں تو آپ کے پاس یادوں کے خزانے بھی تصویروں کی صورت البم میں بند پڑے ہوں گے۔" وہ مسکرائیں اور پھر میں بھی مسکرا اٹھی۔

میں کچھ دیر بعد مسز مہتا کے آگے البمز کے ڈھیر لگا کر باتھ لینے چل پڑی تھی۔

ہم امپورٹڈ چیزیں استعمال کرنے والوں کا المیہ یہ ہے کہ ہمیں دیگر تمام چیزوں کے رنگ، خوشبو، ذائقے، استعمال سب بھول جاتے ہیں۔ بس ہمارا ایمان مہنگی سے مہنگی چیز پر ہی ہوتا ہے۔ ہمیں جتنی مہنگی چیز ملتی ہے ہم اس کی کوالٹی کو ہی نمبر ون سمجھ کر مطمئن ہوتے ہیں۔

میں نے جب بال شیمپو کیے تو ذہن میں یہی تھا کہ یہ بہت مہنگا شیمپو ہے۔ اور پھر جب میں شاور لے کر آئی تو کچھ دیر کے لیے بال ڈرائی کر کے ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھ لگ گئی۔

کچھ دیر بعد جب اچانک میں ہڑبڑا کر اٹھی تو...... یہ تو چمتکار ہو گیا تھا۔ میں بہت پُرسکون تھی۔ میگرین غائب تھا۔

"اوہ! مسز مہتا!" میں اچانک انہیں یاد کرتی کمرے میں آئی۔ وہ وہیں موجود میری یادوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

"ہیلو! چارمنگ لیڈی...... آر یُو فائن ناؤ!" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔"

"میں چاہتی ہوں آپ اسی طرح ہلکا پھلکا اور ایزی فیل کریں ہمیشہ۔"

"انشاء اللہ! خدا نے چاہا تو!"

"آپ کا خدا تو چاہتا ہے مگر آپ لوگ نہیں چاہتے۔"

"کیا مطلب؟"

''مطلب یہ ہے کہ خدا نے عقل تو سب کو دی ہے نا۔ تو پھر اُس عقل کا فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے ہم۔''

''پلیز کھل کر بتائیں۔'' میں جز بز ہوئی۔

''ہمارے پاس دماغی مسئلے کا سب سے آسان حل موجود ہے۔ دیکھیں مسز امان۔ میں بہت پریکٹیکل وومن ہوں۔

میں آج سے دس سال پہلے بہت سارے ہیئر پرابلمز اور اِس میگرین کا شکار تھی۔ سچ پوچھیں تو کوئی وید، ڈاکٹر نہ چھوڑا تھا۔

مگر نتیجہ شُنے (زیرو) اور پھر اچانک سے میں نے ایک دن ایک چمتکاری شیمپو کا اپیوگ کیا۔ (استعمال کیا) وہ شیمپو استعمال کر کے ہفتے دو ہفتے میں سچ مچ چمتکار ہو گیا۔

اور پھر...... آپ نے مجھ میں ایک بہت خاص کشش محسوس کی تھی اور اب یہ چمتکار آپ بھی دیکھیں گی۔''

''پلیز مسز مہتا! کیوں مجھے اس چمتکاری شیمپو کے نام سے اب تک بے خبر رکھے ہوئے ہیں۔ اب بتا بھی دیں۔''

یہ کہہ کر میں ان کے مزید نزدیک ہو گئی۔

''ویٹ آمنٹ۔''

مسز مہتا نے اپنے بیگ سے شیمپو سے ہٹایا گیا ریپر نظروں کے آگے کر دیا۔

ریپر دیکھ کر مارے حیرت کے میری آنکھیں اُبلنے کو تیار تھیں۔

''یہ!! اوہ مائی گاڈ! مسز مہتا' لائف بوائے شیمپو!'' مارے حیرت کے میں گنگ تھی۔

''جی ہاں...... یہ ہے وہ چمتکار...... لائف بوائے شیمپو! اور پھر ہم لوگ ہیں نا عقل کے کچے جو کبھی اپنی اہم ترین پراڈکٹس پر بھی توجہ نہیں دیتے۔ لائف بوائے شیمپو میں ملک پروٹین شامل ہے۔ بادام کے تیل کی خاصیت لیے اس میں اہم عرقیات ہمارے بالوں کو ہی نہیں بلکہ ہمارے دماغ کو بھی شانتی دیتے ہیں اور کئی بیماریاں ہمارے پاس نہیں آتی ہیں۔

اب بھلا بتائیں۔ لائف بوائے شیمپو بنانے والوں کو پتا ہے کہ ہم اس منفرد اور سستے شیمپو سے کتنی مہنگی بیماریوں سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ اگر پتا چل جائے انہیں تو یہ شیمپو ڈالرز میں فروخت ہو۔''

مسز مہتا اپنی بات کر کے خاموش ہوئیں تو مجھے لگا مجھے کچھ بولنا چاہیے۔

''لائف بوائے شیمپو کو تو میں زمانے سے دیکھ رہی ہوں مسز مہتا۔ یقیناً آپ بھی دیکھ رہی ہوں گی۔

اس کی قیمت تو شروع سے بہت کم ہے لائف بوائے شیمپو یقیناً لوگوں کے لیے ایک تحفہ ہے جو ہمیں معلوم ہی نہیں ہے۔ لائف بوائے شیمپو کی قیمت اتنی ہی ہے جتنی کہ ایک عام پاکستانی افورڈ کر لے۔ کیوں! کیا میں نے غلط کہا۔''

''بالکل ٹھیک! تو پھر آج سے میں اور آپ بھی ہو گئیں لائف بوائے شیمپو کی اسیر۔''

''بالکل...... کیوں نہیں۔ ہم دونوں بھی آج سے اسی چمتکار کی ہیں شاہکار۔''

مسز مہتا جا چکی تھیں۔ اور میں آج کی رات سکون سے سوئی تھی۔

☆......☆......☆

بازل کا فون آیا تو میں اٹھی تھی۔

''مما! کیسی ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سوئٹو تم بتاؤ بیٹا آرام سے پہنچ گئے تھے نا۔''

''یس مما! بس آپ کی طرف سے فکر تھی۔''

''ارے جانو! ٹیک اِٹ ایزی۔ میری فکر تو مسز مہتا نے چٹکیوں میں ختم کردی تھی۔'' اور پھر میں نے بازل کو جب ساری کل والی بات بتائی تو وہ بھی حیران ہوگیا۔

مگر اس میں حیرانی کی بات نہ تھی بلکہ ہماری کم فہمی ہمیں بعض اوقات صحیح فیصلوں سے دور کردیتی ہے۔ ہمیشہ اپنی ذات کے لیے اپنی ہی دیسی چیز کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جیسے ہمارا لائف بوائے شیمپو ہمارے بالوں کے مسائل کا سچ مچ خاتمہ کرتا ہے مگر......ہم کتنے کم فہم ہیں نا۔

☆......☆......☆

آج اِس واقعے کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ میں ایک پُرسکون زندگی گزار رہی ہوں۔ لائف بوائے شیمپو نے میری لائف میں بالوں کی اہمیت واضح کردی ہے اور آج میں بھی اپنے بالوں پر جتنا فخر کروں کم ہے لیکن یہ سب ممکن تو صرف لائف بوائے شیمپو ہی سے ہوا نا۔ مسز مہتا کی طرف سے ایک میل آئی ہوئی ہے۔ میں بار بار اسے پڑھ رہی ہوں۔

تم نے سوچا تو ہوگا......دیکھا نہیں
خشک صحرا پہ جب برس جائے
ایک چھلکا ہوا بھرا ساون
دیر تک ریت سنسناتی ہے
ایک موہوم امید ہے
شاید اب کے کہیں کوئی کونپل
جنم لیتی ہوئی نظر آئے
بانجھ صحرا کی گود بھر جائے

''مسز امان! پتا نہیں کیوں میں اب تک پھر پاکستان نہ آسکی لیکن ایک چیز ہمیشہ تڑپاتی ہے۔'' پاکستان میں واقعی محبت اور محبت دینے والے لوگ موجود ہیں۔ یہ نظم بہت پسند آئی۔

آپ کی امید جس طرح لائف بوائے شیمپو بنا اُسی لائف بھر کے لیے میری اور آپ کی دوستی بھی مثالی بن گئی۔ کاش کوئی ایسا چمتکار ہوجائے کہ دلوں کی ساری بدگمانیاں بھی ڈھل جائیں۔ کاش انسان انسان سے پیار کرے، سرحدیں پھول برسائیں اور ہر طرف بہار ہی بہار ہو۔

اور ہاں مسز امان! اب یہ میری اپنی Poetry آپ کے لیے، امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

زندگی نام ہے
ملنے کا بچھڑ جانے کا
زندگی تو کبھی رُکتی ہی نہیں
چلتی رہتی ہے، چلتی رہتی ہے
ہم فقط سال گنتے رہتے ہیں
اور محبت کو لے کر اِس دل میں
پھر مہ و سال گنتے رہتے ہیں
اس برس جب ہو دن محبت کا
میں کروں گی تمہارے نام وہ دن
اور اِک اور دعا مانگوں گی
زندگی سہل ہو کبھی کی یہاں
ہم ہوں سرحد کے آر یا ہوں پار
بس محبت سے ہم ہمیشہ ملیں
آشا جیون کی بس محبت ہو
زندگی نام ہے محبت کا

مسز مہتا

☆......☆......☆

لائف بوائے شیمپو......تم نے مسز مہتا کی صورت مجھے ایک ایسا گفٹ دیا ہے کہ میں لائف بھر تمہارا احسان مانتی رہوں گی......سولو یو......میری بھی مسز مہتا کی امید بھری آس والی دعا کاش رنگ لے آئے۔

☆☆......☆☆

خیر اور شر سے جڑی وہ طویل کہانیاں
جن کے کردار ہمارے معاشرے میں اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ موجود ہیں
ملک اور بیرون ملک سے زندگی کی تصویریں

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے!



عبدالغفار عابد

اُس دوشیزہ کی داستانِ الم، جس نے شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر ظلم سہا

پہلی طویل کہانی کی صورت ایک یادگار کتھا

''ہارون بیٹے۔'' مسہری پر نیم دراز ابا حضور نے اپنی دائیں طرف رکھی کرسی پر بیٹھے اپنے بڑے صاحبزادے کو مخاطب کیا۔ مسہری کے بائیں طرف کرسی پر ابا حضور کے چھوٹے صاحبزادے رشید میاں بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ پائنتی کی جانب ابا حضور کی بیگم شائستہ خاتون بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔

''جی ابا حضور حکم!'' ہارون میاں نے ادب سے جواب دیا۔



"ہارون میاں ہمارا پوتا امجد اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے عنقریب انگلینڈ سے آنے ہی والا ہے۔" ابا حضور اتنا کہہ کر حقہ گڑگڑانے لگے۔ دونوں صاحبزادے ابا حضور کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے اُن کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔ شائستہ خاتون بھی چھالیہ کاٹتے ہوئے رُک کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی تھیں۔

"بیٹے ہارون میں چاہتا ہوں تمہارے بیٹے امجد کے انگلینڈ سے آتے ہی تم اس کی شادی اپنے چھوٹے بھائی رشید میاں کی بیٹی جنت النساء سے کردو۔" دونوں بھائی کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے مگر خاموش بیٹھے رہے تھے۔

"آپ دونوں بھائی خاموش بیٹھے ہیں۔ کیا میں نے غلط فیصلہ کیا ہے؟" ابا حضور نے ایک بار پھر حقہ گڑگڑا کر دونوں بیٹوں سے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں ابا حضور! آپ بزرگوں کے فیصلے تو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ میری خاموشی کی وجہ سے دراصل کچھ اور ہے۔" ہارون میاں نے بہت ادب سے جواب دیا۔

"مثلاً کیا وجہ ہے۔ بیان کریں۔"

"ابا حضور آپ تو جانتے ہیں کہ میرے صاحبزادے بچپن سے انگلینڈ کے ماحول میں اپنے پھوپا پھوپی کے پاس رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دینی ماحول میں پلی بڑھی میری پیاری بھتیجی کو قبول نہ کریں۔"

"ہوں!" ابا حضور کچھ دیر تک حقے کی نے منہ میں لیے سوچتے رہے پھر انہوں نے اپنی بیگم کو مخاطب کیا۔

"آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میرے خیال میں تو ہارون میاں ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔" شائستہ بیگم نے بیٹے کی حمایت میں جواب دیا۔

"دیکھو میرے بچو! ابا حضور نے دو تین لمبے لمبے کش لینے کے بعد سوچتی ہوئی نظروں سے دونوں بیٹوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"ہر انسان کا ایک مرکز ہوا کرتا ہے کوئی بھی انسان اپنے مرکز سے ہٹ کر خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ چلا جائے۔ اسے ایک نہ ایک دن اپنے مرکز پر واپس آنا ہی پڑتا ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ وہ مرکز کیا کہلاتا ہے؟" دونوں بیٹوں نے نفی میں گردنیں دائیں بائیں ہلائیں۔

"اس مرکز کو مذہب یا دھرم کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرا پوتا امجد الحمد اللہ ایک مسلمان گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ یہ درست ہے کہ امجد انگلینڈ کے ماحول میں پل کر جوان ہوا ہے۔ تاہم پیدائش کے بعد اُس کے کانوں میں دی جانے والی اذانوں نے میرے پوتے کو مرکز اسلام سے وابستہ کردیا ہے۔

"خدا نہ کرے بیٹا کہ آپ کا اندیشہ ٹھیک نکلے۔ لیکن خدانخواستہ ایسا ہوا بھی تو وہ اپنے مرکز سے زیادہ دنوں تک دور نہیں رہے گا۔" بات کو اختتام تک پہنچانے کے بعد ابا حضور حقہ گڑگڑانے لگے تھے۔

"اے، میں تو کہتی ہوں امجد کو اِلگنڈ بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" شائستہ خاتون نے پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اِل گنڈ نہیں امی حضور انگلینڈ۔" رشید میاں نے تصیح کی اور سب شائستہ خاتون کے غلط تلفظ پر مسکرانے لگے۔

"ارے بیٹا یہ نگوڑ ماری فرنگی بولی بھی عجیب ہے۔ بولوں کچھ ہوں منہ سے نکلتا کچھ ہے۔"

"نہیں آپ کا یہ بھولپن ہی تو پسند ہے جو انگریزی الفاظ کی حجامت کر کے ہم سب کو مسکرانے پر مجبور کرتا ہے۔" ابا حضور نے ہنستے ہوئے بیگم کو مخاطب کیا۔

تب اس فیصلے کی روشنی میں کہ امجد میاں کے انگلینڈ سے آنے کے بعد ان کی شادی جنت النساء سے کردی جائے گی۔ یہ نشست برخاست ہوگئی تھی۔ دروازے کی آڑ میں چھپی ہوئی جنت نے ساری کارروائی سنی اور امجد سے شادی کا فیصلہ سُن کر شرم سے گلابی ہوگئی۔

☆......☆......☆

جنت کو زمینی مخلوق میں شمار کرنا گویا اس کے حسن کی توہین تھی۔ وہ تو ایک حور تھی جو غلطی سے بھٹک کر دنیا میں آ گئی تھی۔ جنت کے چہرے پر برستا ہوا نور اور حیا سے جھکی ہوئی گھنیری پلکیں لوگوں کو بے اختیار بار بار اُس کا پُرنور چہرہ دیکھنے پر مجبور کردیتی تھیں۔

جنت اپنے نام کی طرح اسمِ بامسمیٰ تھی۔ پانچوں

وقت نماز کی پابند اور درود شریف کا ورد اُس کے معمول کا حصہ تھا۔ جنت نے اپنے کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی۔ اس میں انبیاء علیہ السلام اور بزرگانِ دین اور احادیثِ مبارکہ پر مشتمل کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔ جنت بہت پابندی سے اور بغور ان کتب اور احادیث مبارکہ کا مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ یہی جنت کا شوق تھا اور یہی اس کی چھوٹی سی دنیا تھی جس میں اُسے سکون اور اطمینان کی ہر دولت میسر تھی۔

احادیث مبارکہ کا بار بار مطالعہ کرتے رہنے سے جنت کو ستر سے زیادہ احادیث حرف بہ حرف زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ جنت کا یہ شوق صرف مطالعے کی حد تک نہیں تھا۔ وہ فرمان نبوی ﷺ اور بزرگانِ دین کی ہدایتوں پر سختی سے عمل بھی کرتی تھی۔

گھر والوں نے جنت کو جب بھی دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کو پیارے آقا ﷺ پر درود پاک پڑھتے ہوئے ہی پایا۔ پھر جسے اپنے بزرگوں کی خدمت اور نبی پاک ﷺ پر درود شریف بھیجنے کے علاوہ کسی دوسری شے سے ذرا بھی رغبت نہ ہو اس کے چہرے پر برسنے والے نور کو کیوں کر الفاظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

جنت سب سے زیادہ اپنے دادا اور دادی کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اس کے دادا یا ابو رشید میاں جب بھی باہر جاتے جنت سے اُس کی پسند کی شے لانے کا ضرور پوچھتے تھے اور جنت کی پسند ہمیشہ کوئی دینی کتاب ہوتی تھی۔

☆......☆......☆

امجد میاں اپنی اعلیٰ تعلیم کی سند کے ہمراہ انگلینڈ میں پچیس سال کی عمر پوری کر کے اپنے وطن لوٹ آئے۔ ایک ہلچل سی پورے گھر میں نظر آنے لگی۔ دادا دادی نے بلائیں لیں۔ ماں باپ نے لپٹا کر پیار کیا اور چچا چچی (ہونے والے ساس سسر) نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ماہ پلک جھپکتے گزر گئے۔ امجد بیشک ولایت میں رہا تھا۔ تاہم اس کے پھوپا پھوپی نے اسے اپنے مذہب کی تعلیمات سے بڑی حد تک روشناس کرایا تھا۔ یہی وجہ تھی جو یہاں آ کر امجد اپنے بزرگوں کی عزت میں کوئی کمی نہیں آنے دیتا تھا۔ تاہم امجد کا ٹارگٹ ہمیشہ اس کی پیاری دادی جان ہی بنتی تھیں۔ جو انگریزی کا حلیہ بگاڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ امجد بھی کبھی کبھار انگریزوں کے لہجے میں بولی جانے والی اُردو میں دادی جان کو مخاطب کر کے چھیڑا کرتا تھا۔

آج بھی دونوں دادی پوتے صوفے پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہارون میاں اخبار پڑھ رہے تھے اور رشید میاں کوئی سے شغل فرما رہے تھے۔ اچانک دادی جان نے پان لگاتے ہوئے امجد کو مخاطب کیا۔

”بیٹا امجد!“

”جی دادی جان اینڈ گرینڈ مام۔“

”ارے بیٹا مجھے صرف دادی جان ہی کہا کر۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی تیرے دادا جان نے تیری شادی اپنی پوتی جنت سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”ہائیں جنت مینز پیراڈائز۔“ امجد نے مسکراتے ہوئے دادی جان کو چھیڑا۔

”او میاں پیراڈائز...... اب میری بھی سنو۔“ ہارون میاں نے تیز نظروں سے امجد کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

”جی ابو حکم۔“ امجد فوراً ہی مؤدب ہو گیا۔

”تم نے سُن لیا یہ فیصلہ تمہارے دادا جان کا ہے جو تمہارے باپ کے بھی باپ ہیں۔“

”لیکن ابو......“ امجد نے احتجاج کرنا چاہا تھا۔

”فیصلے میں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔“

”او کے ابو، پیارے دادا جان کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔“ امجد نے مسکرا کر جواب دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

”جیتے رہو میرے چاند اب اِدھر آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔“ دادا جان نے امجد کو مخاطب کیا۔ دادا جان نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ ورنہ وہ خاموشی سے سب کو سنتے رہے تھے۔ امجد آگے بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گیا۔

”اب جاؤ اسی خوشی میں مارکیٹ سے مٹھائی خرید لاؤ۔“ دادا جان نے امجد کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کی پیشانی چومی اور جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے ہدایت کی۔

”بیٹا امجد لگے ہاتھوں میرا ابھی ایک کام کر دینا۔“ دادی جان نے امجد سے کہا۔

”ارے پیاری دادی جان حکم کریں میں تو کام تمام

کردوں گا۔'' امجد دادی جان کو محبت سے لپٹاتے ہوئے بولا۔

''امجد۔'' ہارون میاں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹے کو سرزنش کرنی چاہی۔

''ارے چل رے، میرے پوتے کو آنکھیں نہ دکھا۔ یہ تو میرا چہیتا ہے میری آنکھوں کا نور۔''

''اور ماتھے کا سُور (درد)۔'' دادا جان نے لقمہ دیا اور ہال قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔

''ہاں تو بیٹا امجد میں کہہ رہی تھی۔ جب مٹھائی لے کر لوٹو تو ایک پنگا لے لینا۔''

''ہائیں پنگا لے لوں، مگر کس خوشی میں۔'' امجد نے دادی کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اوں ہوں بیٹا، کیسے سمجھاؤں اچھا پنگا مت لے نا مگر پیر گھسیٹا مول ضرور لے لینا۔''

''دادی جان لگتا ہے آج آپ میری ہڈی پسلی تڑوا کر ہی چھوڑیں گی۔ کبھی پنگا لے لوں کبھی کسی کا پیر گھسیٹ لوں۔''

''اِدھر آؤ بیٹا میں سمجھاتا ہوں۔'' دادا جان نے مسکراتے ہوئے امجد کو بلایا۔ ہال میں موجود ہر ایک کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''بیٹا میڈیکل اسٹور سے پنگا کی جگہ بین گے لے لینا۔ دراصل یہ آئنٹمنٹ ہوتا ہے جو درد کی جگہ پر ملنے سے درد سے آرام دیتا ہے۔ اور دو پترے پیراسیٹا مول ٹیبلیٹ کے خرید لینا۔ تمہاری دادی جان ان ہی چیزوں کے لیے کہہ رہی تھیں۔'' پھر دادا جان اپنی بیگم کی سادگی پر مسکرانے لگے۔

''واہ...... میری دادی جان کاش آپ انگلینڈ میں ہوتیں۔ ہر طرف صفِ ماتم بچھی ہوئی نظر آتی۔'' امجد نے فرطِ محبت سے دادی جان کو لپٹا کر اُن کی پیشانی چومی اور مطلوبہ اشیاء خریدنے کی غرض سے مارکیٹ روانہ ہو گیا۔

ایک گھنٹے میں امجد سب چیزیں خرید لایا تھا۔ دادی جان نے پلیٹوں میں مٹھائی سجا کر سب کو دی۔ جنت شرم کی وجہ سے یہاں موجود نہیں تھی چنانچہ دادی جان نے ایک پلیٹ امجد کو دیتے ہوئے ہدایت کی کہ جا کر اوپر جنت کو دے دو۔

''مس پیراڈائز۔'' امجد نے جنت کو چھیڑا۔ اور جنت کی نظروں کے ساتھ ہی گردن بھی شرم سے جھک گئی۔

''اللہ! آپ یہاں کیوں آ گئے۔ ہمیں حیا آ رہی ہے۔''

''مس پیراڈائز میں دودھ اور شہد کی نہروں کو پینے نہیں آپ کو مٹھائی کھلانے آیا ہوں۔ امجد مسکرایا۔

''آپ کھلائیں گے مٹھائی۔'' جنت بوکھلا گئی۔

''آف کورس! جنت کے ملنے پر خوشی سے بانٹی جا رہی ہے۔''

''آپ پلیٹ رکھ دیں ہم کھا لیں گے اور اب خدا کے لیے چلے جائیں، کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''کوئی دیکھے نہ دیکھے مگر دادی جان نے مجھے مٹھائی دے کر آپ کو جی بھر کے دیکھنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''آپ نہیں مانیں گے۔'' کہتے ہوئے جنت نے شرم سے آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ اور امجد نے گلاب جامن جنت کے منہ میں ٹھونس کر پلیٹ میز پر رکھ دی تھی۔

☆......☆......☆

چھ ماہ کے قلیل عرصے میں امجد اور جنت شادی کے مقدس بندھن میں بندھ گئے۔ امجد کو ایک بڑی کمپنی میں سیلز منیجر کی نوکری مل گئی۔ اور دن ہنسی خوشی اور سکون اطمینان سے گزرنے لگے۔

''کیا خیال ہے جنت آج چھٹی کا دن ہے۔ کیوں نہ کہیں سیر و تفریح ہو جائے۔'' امجد نے جنت کو مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔

''سیر و تفریح۔'' جنت نے چونک کر دہرایا۔ اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

''ہاں بھئی کراچی میں کئی پکنک پوائنٹ ہیں۔ جہاں کہو گی چلے چلیں گے۔''

''سرتاج مجھے چلنے میں تو اعتراض نہیں مگر میں برقعے میں جاؤں گی دوسرے مجھے کسی ایسی پبلک پلیس پر نہ لے جایئے گا جہاں مردوں کی بھیڑ بھاڑ ہو۔''

''ٹھیک ہے پھر ہم لانگ ڈرائیو پر چلیں گے۔'' امجد نے جواب دیا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" کہہ کر جنت تیزی سے تیار ہونے لگی پھر برقعہ اوڑھ کر اپنے تایا ابو کے پاس پہنچ گئی۔

ہارون میاں اور اُن کی بیگم اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے کسی مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ جنت کو دیکھتے ہی دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

"او......ہو...... بھئی آج تو ہماری بہو بہت ہی پیاری لگ رہی ہے۔ کیا کہیں جانے کا پروگرام ہے؟" ہارون میاں نے جنت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں تایا ابو...... آج یہ تفریح کرانے لے جا رہے ہیں۔" جنت نے شرم سے نگاہیں جھکائے جواب دیا۔

"میں آپ لوگوں سے اجازت لینے آئی ہوں۔"

"شکر ہے اس بیوقوف کو خیال تو آیا۔ ویسے جنت بیٹی امجد آپ کا شوہر ہے، وہ جہاں لے جانا چاہے آپ چلی جایا کریں۔ ہماری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہے تایا ابو اجازت کی ضرورت بالکل ہے۔ کیونکہ اجازت کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ دعائیں بھی ملتی ہیں جو بزرگ اپنے بچوں کو رخصت کرتے وقت اپنے دل کی گہرائیوں سے دیتے ہیں۔" جنت نے بڑھ کر ہارون میاں کے گلے سے لگ کر جواب دیا۔

"میری بچی۔" ہارون کا دل بھر آیا۔ اور وہ رومال سے آنکھیں خشک کرنے لگے۔

"جاؤ بیٹی امجد انتظار کر رہا ہوگا۔" تائی امی نے جنت کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اور جنت دونوں کو ادب سے سلام کر کے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

بال آخر دو سال گزر گئے۔ ان دو برسوں میں ہلکے پھلکے گھریلو حادثات ہوتے رہے تھے۔ امجد نے اپنی محنت سے کمپنی کو کافی منافع بخش مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ کمپنی کے مالک عثمان یزدانی امجد کے کام سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ وہ خود تو کبھی کبھار کمپنی کا چکر لگاتے تھے۔ البتہ سارا کاروبار اُن کی بے انتہا نک چڑھی اور ضدی بیٹی مشہودہ یزدانی نے بحیثیت منیجنگ ڈائریکٹر کے سنبھالا ہوا تھا۔

مشہودہ خود بھی امجد کی کام سے لگن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور گاہے بگاہے امجد کے کام کی تعریف بھی کرتی رہتی تھی۔ ان دو برسوں میں دونوں غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ اور بات آخر کار شادی کے بندھن میں بندھ جانے تک آ پہنچی۔

مشہودہ ایک ماتحت کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے پر تیار نہیں تھی مگر اپنے باپ سے مجبور تھی جو امجد جیسے محنتی ورکر کو اپنا داماد بنانے پر مصر تھا، یہ پہلا حادثہ تھا۔ دوسرا حادثہ وہ تھا جب امجد جنت کو سیر کرانے لے کر گیا تھا۔ امجد کے بار بار کہنے پر جنت نے برقعے کا نقاب تو اُلٹ لیا تھا مگر برقعے سے باہر آنا گوارا نہ کیا۔ وہ جنت کے ساتھ گھومتے ہوئے ایک عجیب سی خفت محسوس کر رہا تھا۔

دراصل اس میں امجد کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ جس دیس میں رہ کر واپس آیا تھا۔ وہاں کے ماحول کا کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ تھا۔ گو کہ کراچی میں بھی کسی کسی مقام پر انگلینڈ کے ماحول کی جھلک موجود تھی۔ لوگ اپنی بیویوں کو لیے اور جوان لڑکے لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تفریح کا مزہ لے رہے تھے۔

کئی خوش فکروں نے مسکراتی نظروں سے امجد اور برقعے میں چھپی ہوئی جنت کو دیکھا اور امجد شدید ترین سبکی محسوس کرنے لگا۔ وہ اس لمحے کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا جب اس نے جنت سے تفریح کے لیے چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

تیسرا حادثہ مندرجہ بالا دو حادثوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی سنگین صورت اختیار کر چکا تھا۔ جس کا اثر سب گھر والے بھی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ گھر کے سونے آنگن میں ابھی تک کسی ننھے سے وجود کے آثار نہیں تھے۔ امجد کی جھنجلاہٹ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ گھر کے ماحول پر چھایا ہوا سکوت صریحاً کسی طوفان کے رونما ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا...... اور پھر...... گھر میں بھونچال آ ہی گیا۔

"دادی جان میں اب دوسری شادی کر رہا ہوں۔" امجد نے یہ بات اس وقت کہی جب ہال میں سب ہی

موجود تھے۔
"دوسری شادی مگر کیوں؟" ہارون نے چونک کر امجد کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔
"کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں۔" امجد نگاہیں نیچی کیے بڑبڑایا۔
"وجہ ایک ہو یا دس، آپ ایک ایک کر کے سب بتائیں۔" اس مرتبہ دادا جان بولے تھے۔
"دادا جان میں نے کوشش کی تھی کہ جنت کو لے کر باہر نکلوں۔ اُن کو اپنے آفس میں کام کرنے والے اپنے دوستوں اور اُن کی بیگمات سے ملواؤں، مگر یہ محترمہ برقعہ اُتارنے پر تیار ہی نہیں ہیں اور نہ کسی گیٹ ٹو گیدر میں ساتھ جانے پر آمادہ ہوتی ہیں۔ سارے دوست مجھ پر پھبتیاں کستے ہیں میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ یہ دور بیویوں کو گھر میں بند رکھنے کا نہیں ہے دادا جان۔"
"بیشک بیٹا امجد ہماری پاکیزہ تہذیب تھک ہار کر چادر اوڑھے سو چکی ہے۔ اب تو ہم اپنی شناخت کو کھو کر تعفن بھری اس مغربی تہذیب میں سانس لے رہے ہیں۔ جو جدید تہذیب و تمدن کے نام سے جانی جارہی ہے۔ یہ آزادی کا دور ہے۔ اس غلیظ دور میں ہم اپنی بیویوں کو گھر کی عزت بنا کر رکھنا پسند نہیں کرتے۔"
"دوسری وجہ بھی ہے دادا جان۔ ہر ماں باپ کو اولاد کی آرزو ہوتی ہے۔ لیکن دو سال کی مدت گزرنے کے باوجود جنت مجھے اس تمنا سے محروم رکھے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے میرے دوسری شادی کرنے کی۔"
"اور ایسا ہو نہیں سکتا۔" ہارون میاں نے غصے کے عالم میں تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ معاً جنت پھرتی سے آگے بڑھی اس نے اپنے سسر تایا ابو کو بمشکل تمام واپس بٹھایا اور اُن کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔
"تایا ابو اس میں غصہ ہونے والی کیا بات ہے۔ خدا کی مصلحت ہے میں اِن کو اولاد کی خوشی نہیں دے سکی۔ مگر دوسری شادی کی اجازت پوری ہوش مندی سے دے رہی ہوں۔" جنت نے انتہائی محبت سے ہارون میاں کو سمجھایا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں جنت بیٹی؟"
"تایا ابو جب اللہ تعالیٰ نے ہی مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے تو جنت اس کے حکم کے آگے کیا کہہ سکتی ہے۔"
"مگر بیٹا یہ اجازت بھی کچھ شرائط کی روشنی میں دی گئی ہے۔" دادا جان نے مداخلت کی۔
"ہاں دادا جان آپ کی یہ پوتی اور تایا ابو آپ کی بہو آپ کے صاحبزادے کے ساتھ سوسائٹی میں موو نہیں کر سکتی۔ نہ ہی ان کو اولاد کی خوشی دے سکی ایسی صورت میں میرے سرتاج کو دوسری شادی کرنے کا مکمل اختیار ہے۔"
"میری بیٹی کیا آپ اس کڑے امتحان سے دل گرفتگی کا شکار نہیں ہوں گی؟" ہارون میاں نے سوال کیا۔
"تایا ابو میں اپنے شوہر کی خوشی میں خوش ہوں۔ میں بھلا دل گرفتہ کیوں ہوؤں گی۔ میرے دل کے سکون کے لیے میرے اللہ اور پیارے محبوب ﷺ کی محبت ہی کافی ہے۔" جنت کا فیصلہ سُن کر ماحول گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔
کہنے کو اب رہا بھی کیا تھا۔ امجد کے سر پر شادی کا بھوت سوار تھا چنانچہ ایک ہفتے کے اندر امجد مشہودہ کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔ صرف جنت تھی جس نے سہاگ سیج اپنے ہاتھوں سے سجائی تھی۔ یا دادا جان جنہوں نے کمال جرأت سے اپنے آنسوؤں کو روک کر چھوٹی دلہن اور امجد کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوشگوار زندگی گزارنے کی دعائیں دی تھیں۔ پھر ایک طرف سے امجد نے اور دوسری طرف سے خود جنت نے مسکراتے ہوئے دلہن کو بازوؤں سے تھام کر حجلۂ عروسی میں پہنچایا تھا۔ دودھ اور مٹھائی کا انتظام جنت پہلے ہی کر آئی تھی۔ امجد نے اطمینان سے دروازہ بند کیا اور مسکراتا ہوا مشہودہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔
"امجد یہ تمہارا گھر ہے یا قبرستان؟" نئی نویلی دلہن نے اپنی سسرال کو قبرستان سے تشبیہ دے کر پہلا تحفہ امجد کو پیش کیا۔
"چھوڑو ڈارلنگ یہ سب بیک ورڈ لوگ ہیں۔"
"ٹھیک ہے! تاہم بیک ورڈ اپنے چہروں پر

مسکراہٹ سجا کر دلہن کا استقبال تو کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ سب روتی بسورتی زندہ لاشیں دکھائی دے رہے تھے۔“

”مشہودہ ڈارلنگ کیا ایسی باتیں اس خوشیوں بھری رات میں کرنی ضروری ہیں؟“

”آف کورس! امجد تمہارے گھر والوں کا رویہ..... نو...... امجد یہ سراسر میری تذلیل ہے۔ انسلٹ ہے۔“ مشہودہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”اوہ گاڈ!“ امجد دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ اور غصے کے عالم میں منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ پھر بھلا مشہودہ کیوں پیچھے رہتی وہ مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کے زعم میں اپنے ماتحت شوہر کے آگے جھکنے پر تیار نہیں تھی۔ چنانچہ وہ تکیہ لے کر صوفے پر دراز ہوگئی تھی۔

فجر کی اذان سنتے ہی جنت بیدار ہوگئی۔ اُس نے بستر چھوڑ کر وضو کیا اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن شریف کی تلاوت کرنے لگی۔ جنت کے پُرنور چہرے پر اس وقت بھی غم کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اپنے پیارے شوہر اور اہلِ خانہ کی خوشیوں کے لیے اُس کے ہاتھ خدا کے بزرگ برتر کی بارگاہ میں اُٹھ گئے۔

”اے اللہ...... یہ عاجز بندی جسے تُو نے صبر و رضا کی دولت سے نوازا ہے۔ تیری جلیل قدر بارگاہ میں اپنے ہاتھ پھیلائے اپنے پیاروں کی خوشیاں لوٹانے کی التجا کر رہی ہے۔ میں تو تیری رضا میں خوش ہوں۔ مجھ ناتواں کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر تجھ سے مانگوں۔ میری عبادت اگر جنت کی طلب کے لیے ہے تو جنت کو مجھ سے ہزاروں میل دور کر دینا۔ اور اگر دوزخ کے خوف سے ہے تو پھر مجھے دوزخ میں ڈال دینا۔ اے غفور رحیم تیرے غضب پر تیری رحمت چھائی ہوئی ہے۔ میں تجھے تیری رحمت کا واسطہ دیتی ہوں کہ مشہودہ کو اولاد کی نعمت سے نواز دے۔ تُو تو جانتا ہے تیرے اور پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھے اپنے شوہر‘ دادا‘ دادی‘ تایا تائی اور ابو امی سے کتنی محبت ہے اور یہ سب بھی مجھے دیکھ کر ہی جی رہے ہیں۔ پروردگار میرے سرتاج کو بیٹے کی دولت عطا کر دے تاکہ ننھے وجود کی آمد سے میرے پیاروں کے لبوں کی مسکراہٹیں واپس لوٹ آئیں جو مجھے زخم زخم دیکھ کر نہ جانے کن اندھیروں میں کھو گئی ہیں۔“

وال کلاک نے صبح کے سات بجنے کا اعلان کیا۔

جنت گھبرا کر اٹھی اُس نے کچن میں جا کر چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ جنت کو اپنے شوہر کے معمولات کا علم تھا۔ امجد کو بیڈ ٹی پینے کی عادت تھی۔

جنت نے چائے تیار کر کے جلدی جلدی دو کپوں میں انڈیلی اور ٹرے اٹھا کر امجد کے کمرے کے دروازے پر جو پہلے جنت اور امجد کا مشترکہ کمرہ تھا پہنچ گئی۔ جنت نے دروازے کو نوک کیا۔ جواب ندارد اُس نے دوبارہ نوک کرتے ہوئے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا ایک اشارے میں کھل گیا۔

”اسلام علیکم!“ جنت نے دونوں میاں بیوی کو سلام کیا۔ وہ بیدار ہو چکے تھے اور امجد انگڑائیاں لے رہا تھا۔

”کیا تم اتنی ہی جاہل ہو کہ گڈ مارننگ نہیں کہہ سکتیں؟“ مشہودہ نے نخوت بھرے لہجے میں جنت کو مخاطب کیا۔

”میں نے تو رحمت وسلامتی بھیجی ہے آپ دونوں پر۔“ جنت نے برا مانے بغیر مسکرا کر مشہودہ کو جواب دیا۔

”اپنی جیب میں رکھو یہ رحمت وسلامتی۔“ مشہودہ نے کہتے ہوئے اب امجد کو مخاطب کیا۔

”یہ کیا عجوبہ پال رکھا ہے امجد تم نے؟“ جواب میں امجد خاموش رہا تھا۔ مشہودہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ پھر کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے اُس نے دوبارہ جنت کو مخاطب کیا۔

”میں ٹھیک نو بجے ناشتا کرتی ہوں۔“

”سرتاج آپ بھی اسی وقت ناشتا کریں گے؟“ جنت نے امجد سے پوچھا۔

”یہ ناشتا آفس میں کر لیں گے۔“ مشہودہ نے جنت کو جواب دیتے ہوئے افسرانہ شان سے امجد کو گھورا۔

”امجد میں آج آرام کروں گی۔ اٹھو اور آفس جانے کی تیاری کرو۔“ دلہن نے اپنے ماتحت شوہر کو حکم دیا اور امجد کسی معمول کی مانند اُٹھ کر آفس جانے کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

”اب تم بھی یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ آخر کب

تک کھڑی اپنے شوہر کی پوجا کروگی۔'' مشہودہ نے بلند آواز میں جنت کو حکم سنایا۔ اور جنت برتن سمیٹ کر خاموشی سے باہر نکل آئی تھی۔

دروازہ کھلا ہونے کی بنا پر ساری باتیں نیچے صاف سنی جارہی تھیں۔ ہال میں بیٹھے ہوئے افراد خانہ اب جنت کی بربادی اور اپنے آشیانے کے تنکے بکھرتے دیکھنے کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے۔

بال آخر جنت کی مانگی ہوئی دعائیں رب العزت کی بارگاہ میں قبول ہوئیں اور ایک گول مٹول سے ننھے وجود نے اس گھر میں جنم لیا۔ آشیانے کے تنکے کچھ عرصے کے لیے نفرتوں کی تیز دھوپ اور سرد گرم جملوں کے تند و تیز جھکڑوں سے منتشر ہونے سے رُک گئے اور گھر میں ایک مرتبہ پھر سے اندھیروں میں کھوئی ہوئی مسکراہٹیں لوٹ آئیں۔ امجد کے نام کے مطابق دادا اور دادی نے بچے کا نام اسجد تجویز کیا تھا۔

☆......☆......☆

گھر کے پُرسکون ماحول کی جھیل میں نفرتوں کا جو پتھر مشہودہ نے چالاکی سے پھینکا تھا۔ اس سے بننے والے دائروں نے رفتہ رفتہ پھیل کر اپنا حجم اتنا بڑھا لیا کہ دو سال کے عرصے میں مکینوں کا اپنی ہی چھت کے نیچے سانس لینا بھی دوبھر ہوگیا۔

چنانچہ اس گھٹن زدہ ماحول سے دل برداشتہ ہوکر سب نے کہیں دور جانے کا فیصلہ کرکے رخت سفر باندھا اور لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔ گھر میں اب صرف امجد جنت مشہودہ اور اسجد میاں رہ گئے تھے۔ مشہودہ کے تو مقدر ہی کھل گئے۔ اُس کے ہر دن عید اور ہر رات شب برأت ہوگئی تھی۔ مشہودہ کا اصل ٹارگٹ جنت تھی جسے وہ اپنے شوہر سے چھٹکارا دلانا چاہتی تھی۔

اب گھر میں روزانہ مشہودہ اور امجد کے مشترکہ دوستوں کی آمد و رفت رہنے لگی۔ ہر شب ہی ہلا گلہ اپنے عروج پر ہونے لگا۔ یہ شور شرابہ کبھی کبھار اتنا زیادہ بڑھ جاتا تھا کہ جنت کو نماز پڑھنی مشکل ہوجاتی تھی۔ مگر آج تو انتہا ہوگئی تھی۔ ہال میں بپا ہونے والے شور سے گھبرا کر اسجد میاں نے رونا شروع کردیا۔ مگر نہ تو ماں کو اُن کے رونے کی پروا تھی اور نہ باپ کو۔ نتیجتاً امجد نے غصے میں آ کر ایک کرارا تھپڑ اسجد میاں کو رسید کردیا۔ دو سال کی ننھی سی جان تھپڑ کی زبردست چوٹ کھا کر میز پر سے نیچے فرش پر گر پڑی۔

''ماما...... ماما......'' اسجد میاں روتے ہوئے جنت کو پکارنے لگے۔ پیار محبت کا بھوکا بچہ جنت ہی کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ اور ہر دم اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ نہ جانے اسجد کے روتے ہوئے بار بار ماما کہنے میں وہ کون سا درد چھپا ہوا تھا جسے محسوس کرکے جنت برداشت نہ کرسکی۔ وہ تیزی سے نیچے اتری اور آ کر اسجد کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔ پھر وہ مشہودہ سے مخاطب ہوئی۔

''چھوٹی بیگم تمہیں اس معصوم پر ترس نہیں آیا؟''

''اوہ...... شٹ اَپ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے مسز امجد کہا کرو۔''

''میں مشہودہ کے بجائے چھوٹی بیگم ہی کہوں گی...... وہ نہیں جو تم چاہتی ہو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' مشہودہ آپے سے باہر ہوگئی۔

''چیخو مت! تم اگر ایم ڈی ہو تو اپنے آفس میں۔ یہاں تمہاری حیثیت چھوٹی بہو کی ہے اس لیے اپنی حد میں رہو۔'' جنت نے بھی اسی انداز میں جواب دیا تھا۔

''امجد میں اب اور برداشت نہیں کرسکتی۔ یا تو اسے گھر سے نکالو یا تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔'' مشہودہ نے امجد کو مخاطب کیا۔ اور امجد جنت کو بازو سے پکڑ کر اُس کے کمرے میں لے گیا۔ اسجد میاں جنت کی گود میں تھے۔

''جنت میرے اور مشہودہ کے دوستوں کے سامنے میری اتنی بے عزتی، اب میں تمہیں اور برداشت نہیں کرسکتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس گھر کو چھوڑ دو۔''

''مگر میں کہاں جاؤں گی سرتاج۔''

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ مگر اتنا سُن لو اگر صبح مجھے تمہاری صورت نظر آئی تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے آزاد کردوں گا۔'' امجد نے سرخ انگارہ آنکھوں سے جنت کو گھورتے ہوئے حکم سنایا۔

''خدا کے لیے ایسا نہ کہیں۔ میں خود ہی اس گھر کو چھوڑ دوں گی۔'' جنت نے لرزتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اور جاتے جاتے اپنے کندھے سے لگے اس ناکارہ لوتھڑے کو بھی لے جانا جو زندگی کو انجوائے کرنے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔" دروازے میں کھڑی مشہودہ نے اپنی کوکھ سے جنم لینے والے معصوم بچے کو لوتھڑا کہہ کر جنت کیس ساعت ٹن کردی تھی۔ اتنا کہنے کے بعد مشہودہ تیزی سے نیچے اتری اور اپنے ڈرائیور کو جلدی جلدی کچھ ہدایات دینے کے بعد واپس دوستوں کی محفل میں آ گئی تھی۔

"سرتاج آپ کی اجازت ہے اسجد میاں کو میں لے جاؤں؟"

"اُس کی ماں کی اجازت کی روشنی میں میری اجازت ضروری نہیں۔ البتہ اپنے لیے تم میرا حکم سن ہی چکی ہو۔" اسجد بھی یہ کہہ کر دوستوں میں پہنچ کر ہلے گلے میں شریک ہوگیا۔ دروازے کی آڑ میں چھپی ہوئی نوکرانی زینت تیزی سے نکل کر جنت کے سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"بڑی بہو۔ آپ اس ننھی سی جان کو لے کر کہاں جائیں گی؟"

"گھبراؤ مت زینت! شوہر کے حکم پر گھر سے نکل رہی ہوں۔ میرے لیے میرا اللہ ہی کافی ہے۔ اور وہی مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچائے گا۔"

"ماما۔" اسجد میاں نے جنت کے کندھے سے اپنا سر اٹھایا۔

"جی ماما کی جان۔" جنت نے اسجد کی پیشانی چوم کر پوچھا۔

"ماما...... ابو مالا (ابو نے مارا)۔" اسجد نے اپنا ننھا سا ہاتھ گال پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا ابو مالا...... ماما نے پیار کیا۔" کہتے ہوئے جنت نے اسجد کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

"زینت بیگ میں میرے اور اسجد کے کپڑے اور چپلیں رکھ دو۔"

"مجھے تو بتا دیں آپ کہاں جائیں گی؟"

"میری منزل نامعلوم ہے زینت۔ جس کی عظمتوں کے سہارے نکل رہی ہوں وہی میری دستگیری بھی کرے گا۔" زینت نے بیگ تیار کر کے جنت کو دے دیا تھا۔

"اچھا زینت، جب میرے پیارے آ جائیں تو اُن سب سے میرا اسلام عرض کر دینا۔" جنت نے حسرت بھری نظروں سے پورے گھر کو دیکھا۔ اپنے اس کمرے کو دیکھا جہاں وہ کبھی دلہن بنی سیج پر بیٹھی تھی۔

"کتنا عجیب اتفاق ہے زینت، پہلے کمرے سے بے دخل ہوئی اور آج اس گھر سے بے گھر کر دی گئی۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسجد کو کندھے سے لگائے خاموشی سے باہر آ گئی۔

"آیئے بڑی بی بی جی، آپ جہاں جانا چاہیں میں چھوڑ آتا ہوں۔" مشہودہ کے ڈرائیور نے کمال ہوشیاری سے اپنے چہرے پر ہمدردی کے آثار پیدا کرتے ہوئے جنت کو مخاطب کیا۔

"مجھے یہاں سے دور کسی چوراہے پر چھوڑ دینا پھر میں کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔ جنت نے کار میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی کار آدھے گھنٹے تک تیزی سے سیاہ سڑک پر دوڑتی رہی۔ کئی چوراہے آئے اور نکل گئے مگر کار رُکے بغیر برابر آگے بڑھتی رہی جنت آنکھیں بند کیے اپنی پریشان سوچوں میں گم بیٹھی رہی تھی۔

یکا یک کار کی رفتار کم ہوئی اور پھر وہ رُک گئی۔ جنت نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور دہل گئی۔ وہاں نہ کوئی چوراہا تھا اور نہ کسی قسم کی چہل پہل۔ ہر سو ویرانی اور بھیانک سناٹے کا راج تھا۔

"اترو بی بی۔" ڈرائیور بدلے ہوئے تیوروں سے بولا۔

جنت نے ایک نظر ڈرائیور کو دیکھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ جنت نے اسجد کو سڑک کے کنارے کھڑا کرنا چاہا مگر اسجد لہرا کر سڑک پر گر پڑا۔ اس اثناء میں ڈرائیور نے جنت کا بیگ اس کی طرف پھینکا اور گاڑی کا رُخ تبدیل کر کے واپس گھر کی سمت روانہ ہوگیا تھا۔

"کیا ہوگیا بیٹا؟" جنت نے اسجد میاں کو زمین سے اٹھاتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"ماما...... ابو مالا...... ابو مالا......" اسجد نے روتے ہوئے جواب دیا۔

جنت سمجھ گئی کہ امجد کا تھپڑ اسجد کے کسی ایسے حصے پر پڑا تھا۔ جس کی تکلیف ابھی تک ننھے اسجد کو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسجد کو گود میں لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بیگ کندھے سے لٹکایا اور پلٹ کر اسی سمت روانہ ہو گئی جدھر ڈرائیور گاڑی لے کر گیا تھا۔ دریں اثناء اسجد نے سر اٹھایا۔

"ماما...... بب بُو" اسجد نے دودھ مانگا اور جنت تڑپ کر رہ گئی۔ وہ اپنی پریشانی میں بھول ہی گئی تھی کہ زینت سے فیڈر میں دودھ بھروا لیتی۔ جنت نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور خدا سے التجا کی۔

"میرے مالک میری منزل اور ننھے بچے کی بھوک تیری رحمت کی منتظر ہے۔"

اس کے ساتھ ہی دور کسی کار کی ہیڈ لائٹس سے پھوٹنے والی تیز روشنی جنت کی پشت پر پڑنے لگی۔ کار تیز رفتاری سے چلتی ہوئی آئی اور زن کی آواز کے ساتھ جنت کے قریب سے گزر گئی۔ جنت حسرت سے کار کو جاتے دیکھتی رہی۔

کار دو ڈھائی سو گز دور نکل چکی تھی۔ یکا یک کار کی عقبی سرخ روشنی میں مزید تیزی پیدا ہوئی۔ کار کے ٹائر چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رکنے کے بعد دوبارہ جنت کی طرف واپس آنے لگی۔

"اے اللہ تیرے بھروسے پر نکلی ہوں۔ میری عزت ناموس کی حفاظت فرما۔" کار تیزی سے ریورس ہوتی ہوئی جنت کے سامنے پہنچ کر رُک گئی تھی۔

"کون ہیں آپ اور کہاں جا رہی ہیں؟" کار کی کھڑکی میں سے ایک عورت نے سر باہر نکال کر جنت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔ جنت کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا تھا کہ کار میں عورت اکیلی ہی تھی۔

"بیگم صاحبہ نام میرا جنت النساء ہے۔ فی الحال اپنی منزل سے لاعلم ہوں۔"

"مگر آپ اس ہولناک ویرانے میں ایک بچے کو لیے کہاں سے آ رہی ہیں؟"

"کیا کہہ سکتی ہوں۔ شوہر کا حکم تھا اور اُن کے حکم کی بجا آوری مجھ پر فرض تھی۔ مجھے یہاں اُن کی دوسری بیگم کا ڈرائیور زبردستی چھوڑ گیا ہے۔"

"ویری سیڈ! آیئے میں آپ کو شہر چھوڑ دوں گی۔" عورت نے جنت کو افسوس سے دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔

"مگر بیگم صاحبہ!" جنت کچھ کہنا چاہا تھا۔

"انکار مت کیجیے شہر یہاں سے تیس کلومیٹر دور ہے آپ صبح تک بھی نہیں پہنچ پائیں گی۔"

جنت کے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ دوسری طرف سے کار کا دروازہ کھول کر پیسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ تب کار دوبارہ اپنی منزل کی سمت رواں ہو گئی۔

"بچہ بھوکا ہوگا۔ یہ لفافہ لیں، اس میں چکن پیٹس، کیک پیس، اور چپس موجود ہیں بچے کو کھلائیں اور خود بھی شروع ہو جائیں۔" عورت نے لفافہ ڈیش بورڈ سے اُٹھا کر جنت کو دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ بیگم صاحبہ۔" جنت نے لفافے میں سے ایک ملائم کیک پیس نکالا اور تھوڑا سا ٹکڑا توڑ کر اسجد کے منہ میں رکھا۔ اسجد نے کیک پیس کھانے کی کوشش کی تاہم منہ میں تکلیف کے باعث کھا نہیں سکا اور رونے لگا۔

"نہیں ماما نہیں، ابو مالا۔" اور بچے کی تکلیف پر جنت کا دل خون ہو کر رہ گیا۔

"شاید بچے کے منہ میں تکلیف ہے، فلاسک میں دودھ بھی ہے وہی پلا دیں۔" اور اسجد نے جیسے تیسے دودھ پی لیا تھا۔

"بچے کو یہ تکلیف کب اور کیسے ہوئی تھی؟" عورت نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

"ابھی ڈھائی تین گھنٹے قبل میرے شوہر نے غصے میں آ کر بہت زور دار تھپڑ مارا تھا۔ اور یہ میز سے نیچے فرش پر جا گرے تھے۔" جنت نے تفصیل بتائی۔

"کیا...... اور آپ اب بتلا رہی ہیں۔" عورت نے گاڑی پھرتی سے سڑک سے اُتار کر ایک طرف رُوکی اور پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا بیگ اُٹھا کر اس میں سے اسٹیتھو اسکوپ نکال کر اسجد کو چیک کرنے لگی۔ عورت نے اسجد کے مغربی حصے کی سمت والا ہاتھ اُٹھا کر ہوا میں چھوڑ دیا۔ اسجد کا ہاتھ ہوا میں رُکے بغیر تیزی سے واپس گر گیا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ!" عورت کے منہ سے تشویش کے

عالم میں نکلا۔ اُس نے پھرتی سے بیگ میں ہاتھ ڈال کر سرنج نکالی پھر دوا کی شیشیوں میں سے ایک شیشی منتخب کی اور سرنج میں دوا بھری اور اسجد کے جسم میں منتقل کر دی۔ اُس کے ساتھ ہی عورت نے دو گولیاں پیس کر دودھ کے ہمراہ اسجد کو کھلا دیں۔ جنت اسجد کو گود میں لٹائے ہوئے ساری کارروائی خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔

''کیا بچے کو کوئی خطرہ لاحق تھا؟'' جنت نے عورت سے پوچھ ہی لیا۔

''ہاں جنت! بچے کا یہ حصہ آہستہ آہستہ پیرالائز ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔''

''شکر ہے میرے پاس ایمرجنسی میں استعمال ہونے والی میڈیسن ہمیشہ موجود رہتی ہیں انشاء اللہ بچہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تو گویا آپ ڈاکٹر ہیں۔'' جنت نے تشکر بھری نظروں سے عورت کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں جنت۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ آج ایل ایم سی جامشورو میں ہونے والے سیمینار میں شرکت کرنے گئی تھی۔ میں یہ ایمرجنسی بیگ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ نہ جانے کب اس کی ضرورت پیش آ جائے۔''

''جیسے آج میرے بیٹے کو ضرورت پڑ گئی۔ البتہ میں حیران ہوں کہ میرے صرف ایک مرتبہ بتلانے پر ہی آپ کو میرا نام یاد ہو گیا۔'' جنت نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ نام تو اتنا عظیم نام ہے۔ جسے پانا ہر مسلمان کی دلی آرزو ہوتی ہے۔ پھر مجھے یہ نام کیوں نہ پیارا لگے۔ شوہر کی اتنی فرمانبردار صرف جنت ہی ہو سکتی ہے۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے جنت کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''شکریہ۔'' جنت نے ممنون لہجے میں شکریہ ادا کیا۔

''ابھی بہت راستہ باقی ہے ایسا کرتے ہیں پہلے میں اپنے متعلق آپ کو بتلا دوں پھر آپ اپنی بپتا تفصیل سے مجھے سنانا۔ سناؤ گی نا؟''

''بالکل سناؤں گی۔'' جنت انکار نہیں کر سکی تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اپنا تعارف کروانا شروع کیا۔

''میرا نام زیبا جہانگیر ہے۔ مگر میرے شوہر جو کہ وکیل ہیں مجھے پیار سے زیب کہتے ہیں میں پیشے کے لحاظ سے ایک لیڈی ڈاکٹر ہوں۔ میرے شوہر جہانگیر پانچ ٹاپ کلاس کمپنیوں کے اکلوتے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ ہر کمپنی پچاس ہزار روپے ماہانہ انہیں ادا کرتی ہے۔ اور بھئی اب رہی شکل وصورت تو میں نہیں بتلاؤں گی (ہنستے ہوئے) اگر جنت آپ نے انڈین فلمیں دیکھی ہیں تو خود ہی پہچان لیں گی۔ اور اب آپ کی باری ہے۔''

''ویسے آج کی رات آپ میری مہمان رہیں گی۔'' زیب نے اتنا کہہ کر کار میں لگا ہوا ٹیپ آن کر دیا اور جنت کو اشارہ کیا۔

''زیب باجی، پہلے تو میں شکر گزار ہوں اپنے پروردگار کی، سڑک پر چلتے ہوئے بچے نے دودھ مانگا، مگر مجھ بے سہارا کے پاس اس کی بھوک مٹانے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے رب سے التجا کی۔ اور اس کی رحمت کے انداز کو دیکھیں اس نے فوراً ہی آپ کو وسیلہ بنا کر بھیج دیا۔ بچے کی بھوک مٹی، اس کو بروقت طبی امداد بھی ملی اور ہم مجبور ماں بیٹے کو آج کی رات سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی اس پاک ذات نے مہیا کر دیا۔ میری ٹوٹی پھوٹی عبادت اور اس کے اتنے احسان پھر جنت نے اپنی پوری تفصیل ٹیپ میں لگے کیسٹ میں ریکارڈ کر دی تھی۔

چنانچہ جیسے ہی جنت کی آپ بیتی اختتام کو پہنچی گاڑی پوش علاقے میں داخل ہو کر ایک خوبصورت کوٹھی میں پہنچ کر رُک گئی۔

''آہا...... آپ آ گئیں بیگم۔ بہت دیر لگا دی۔'' وکیل صاحب پر نظر پڑتے ہی جنت کو حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ 'امریش پوری' جنت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ مسکرانے لگی تھی۔

''ہاں ڈیئر دراصل راستے میں ایک ایمرجنسی ہو گئی تھی۔'' زیب نے جنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ......'' کہتے ہوئے وکیل صاحب نے کار کے اندر بیٹھی جنت پر نگاہ ڈالی۔

''سبحان اللہ! بھئی بیگم اس بھٹکی ہوئی حور کو کہاں سے پکڑ لائیں۔'' اور جنت وکیل صاحب کی آواز سن کر

مسکرانے لگی۔ صورت شکل قد و قامت اور اب آواز بھی بالکل وہی۔

"یہ کیسٹ لیں۔ اس میں اِن کی پوری تفصیل موجود ہے، اور اب جلدی سے اندر چلیں بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"اوہ...... اچھا اچھا...... آیئے بیٹی آپ بھی آجائیں۔" وکیل صاحب نے جس خلوص اور محبت سے جنت کو بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اسے محسوس کر کے جنت کا دل بھر آیا وہ خاموشی سے گاڑی سے باہر نکلی سوئے ہوئے اسجد کو اُٹھا کر کندھے سے لگایا اور بیگ لے کر وکیل صاحب کے پیچھے چلتی ہوئی کوٹھی کے ہال میں آگئی۔

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ پھر ڈاکٹر زیب آلے سے سوئے ہوئے اسجد کو چیک کرنے لگی۔ کچھ دیر کے معائنے کے بعد زیب نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے جنت کو دیکھا۔

"خدا کا شکر ہے بچہ اب خطرے سے باہر نکل چکا ہے۔" زیب نے کہتے ہوئے جنت کو اشارہ کیا کہ وہ اسجد کو گود میں اٹھالے۔ اور خود اُس کا بیگ لیے کوٹھی سے نکل کر سرونٹ کوارٹر پر آ کر رُک گئی۔ زیب نے دروازہ کھول کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ روشنی ہوتے ہی جنت نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔ زیب نے دیوار میں پیوست اے سی آن کر کے جنت کو مخاطب کیا۔

"جنت یہاں اطمینان سے سو کر رات گزارو۔ انشاء اللہ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ وکیل صاحب کیسٹ پر تمہاری بپتا سن ہی لیں گے پھر جیسا تم چاہو گی اُس کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔" پھر زیب جنت کو شب بخیر کہتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن جنت نے اسجد میاں کو صاف کپڑے پہنائے پھر خود بھی تیار ہو کر اسجد کو گود میں لیے کوٹھی میں پہنچ گئی۔ ڈائننگ ٹیبل پر دونوں میاں بیوی جنت کا انتظار کر رہے تھے۔

"آؤ بیٹی آؤ۔" وکیل صاحب نے جنت کو دیکھتے ہی کہا۔

"اسلام علیکم!" جنت نے ادب سے دونوں کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔ آؤ اِدھر میرے قریب بیٹھو۔" دونوں میاں بیوی نے سلام کا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ تاہم اپنے قریب بیٹھنے کے لیے وکیل صاحب نے کہا تھا۔ جنت وکیل صاحب کے قریب کُرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر ناشتے کے بعد چائے کے دوران وکیل صاحب نے جنت کو مخاطب کیا۔

"ہاں تو بیٹی اب بتلائیں آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"اگر یہاں کوئی ایسا ادارہ موجود ہو جہاں بے سہارا......!"

"نہ...... نہ...... اپنے آپ کو بے سہارا مت سمجھو۔ آپ کا سہارا تو وہ عظیم ذات ہے جس کا نام لے کر آپ گھر سے نکلی تھیں۔" وکیل صاحب نے تیزی سے بات کاٹ کر کہا۔

"پھر فرمائیں، میں کہاں جاؤں؟"

"بیٹی میں آپ کے بیک گراؤنڈ سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہوں۔ اب آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خدا سے ہر نماز میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتا تھا۔ بیٹی آپ کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری بخشش کے ساماں پیدا ہو گئے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ میں ایک گنہگار بندی، اور آپ کی بخشش کا سامان؟"

"ہاں بیٹی، آپ ماشاء اللہ قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ کا کافی علم رکھتی ہیں میں دراصل اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ جس میں پیارے نبی ﷺ نے فرمایا تھا۔ "جس شخص کو خدا نے دو بیٹیاں عطا کیں اور اس شخص نے اُن کی بہتر پرورش کی، علم کی دولت سے دونوں کو آراستہ کر کے اپنے گھر کا کر دیا یعنی اُن کی شادیاں کر دیں۔ وہ شخص میرے ساتھ اس طرح جنت میں جائے گا۔ اتنا فرما کر آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کو باہم ملا کر صحابہ کرامؓ کو دکھائیں۔"

جنت کو اس حدیث مبارک کا علم تھا لہٰذا اُس نے اِن دونوں بچیوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تھیں۔

''بیٹیاں اسکول جا چکی ہیں۔ دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔'' زیب نے جنت کی متلاشی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر جواب دیا۔

''بیٹی آپ کو اگر ہم گنہگاروں کی مدد کرنی منظور ہو تو ہم آپ کو اس خدمت کے عوض پندرہ ہزار روپے ماہانہ جیب خرچ کھانا' کپڑا اور ہر وہ شے جو آپ پسند کریں گی دیں گے۔''

''جیب خرچ......'' جنت نے چونک کر دہرایا تھا۔

''ہاں بیٹی، تنخواہ ملازموں کو دی جاتی ہے۔ جبکہ میرے بیٹی کہنے سے آپ اس گھر کی فرد بن چکی ہیں۔''

یہ سُن کر جنت کا دل بھر آیا وہ آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے یہ خدمت منظور ہے۔''

''جیتی رہو جنت بیٹی، دیکھ لیں اللہ سبحانہ تعالیٰ کے اپنے چاہنے والوں پر احسانات، اور انعامات اُس نے آپ کو بھٹکنے سے بچا کر اپنی منزل پر پہنچا ہی دیا۔''

''ہاں بھائی جان آپ درست فرما رہے ہیں۔ ارے ہاں بھائی جان آپ کی کوٹھی بالکل مسجد کی دیوار سے لگ کر بنی ہے۔ میں نے آج صبح نماز سے فارغ ہو کر ہر طرف کا جائزہ لیتے ہوئے یہ چیز نوٹ کی ہے۔''

''جنت بیٹی یہ پلاٹ میں نے مہنگے داموں خریدا تھا۔ اور اس گھر کو بناتے وقت میں نے خاص طور پر یہ خیال رکھا تھا کہ میرے گھر کی دیوار مسجد کی دیوار سے لگی رہے۔ پانچ وقت اذان اور درود سلام کی پُرسوز صدائیں سنائی دیتی رہیں اور مسجد کے پُرنور و پاکیزہ سائے میرے گھر کو اپنی آغوش میں لیے رہیں۔ چچا غالب نے کیا خوب فرمایا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایہ خدا ہے

''بیٹی انسان کو دنیا کمانے کے ساتھ ہی آخرت کی فکر بھی کرنی چاہیے۔''

اسجد میاں اب چار برس کے ہو گئے تھے اور اپنی منہ بولی بہنوں کے ساتھ اسکول جانے لگے تھے۔

☆......☆......☆

ہارون اور رشید میاں کو پندرہ دن بعد لاہور سے واپس آنا پڑا تھا۔ اُن کو اپنے دفتروں سے مزید چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ البتہ ابا حضور اور امی مزید ایک ماہ کے لیے لاہور رُک گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے عجب ہو کا عالم گھر پر مسلط پایا تھا۔

''زینت یہ خاموشی کیوں چھائی ہوئی ہے۔ جنت بیٹی اور اسجد میاں کہاں ہیں؟'' ہارون میاں نے زینت سے سوال کیا۔

''نکال دیا، انہیں امجد میاں نے اپنی بیگم کے کہنے پر اسجد میاں سمیت گھر سے نکال دیا۔'' زینت نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''امجد......'' ہارون میاں غصے سے کانپتے ہوئے دھاڑے۔ اور امجد مشہودہ کے ساتھ فوراً اُن کے سامنے حاضر ہو گیا۔

''جنت کہاں ہے امجد میں پوچھ رہا ہوں جنت کہاں ہے؟'' وہ امجد کو مارنے کی غرض سے آگے بڑھے مگر رشید میاں تیزی سے درمیان میں آ گئے۔

''اس ناگن کے کہنے پر تم نے جنت بیٹی کو گھر سے نکالا ہے نا۔ اب تم بھی یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ اور خبردار جنت کے بغیر اس گھر میں داخل ہونے کی غلطی نہ کر بیٹھنا، ورنہ......!''

''بھائی جان ذرا سوچیے امجد میاں کہاں جائیں گے۔'' رشید میاں نے بڑے بھائی کو سمجھایا۔

''ہٹ جاؤ رشید...... اس نابکار نے اپنے خاندان کی نیک نامی پر جو کالک ملی ہے اسے سات سمندروں کا پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ تم کہتے ہو یہ کہاں جائے گا۔ سسرالی کتا بن کر اپنی سسرال میں جا کر رہے گا۔ مگر میری جنت بیٹی وہ معصوم تو اس دنیا کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں اور کن حالوں میں بھٹک رہی ہوگی۔'' ہارون میاں غم سے نڈھال ہو کر کرسی پر گر پڑے۔

مشہودہ نے امجد کا بازو پکڑا اور اُسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ چالاک عورت جانتی تھی۔ اگر اُس نے ہارون کو جواب دینے کی کوشش کی تو وہ اُسے دھنک کر رکھ دیں گے۔

شام تک دونوں میاں بیوی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

☆☆☆

ایک سال کے اندر امجد کی حیثیت واقعی سسرالی کتے کے جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ کام کی زیادتی نے امجد کو تھکا مارا تھا۔ اُسے شدت سے آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اور آج تو سر میں سخت درد کی بنا پر امجد کو آنکھیں کھولنے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ امجد نے مجبوراً پاس بیٹھی ہوئی مشہودہ کو سر دبانے کے لیے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا، میں تمہاری باس ہوں امجد نوکرانی نہیں۔ شرم نہیں آتی مجھے سر دبانے کا کہتے ہوئے۔"

"مشہودہ ہر وقت ایم ڈی کا چوغہ پہنے رہنا ٹھیک نہیں، ورنہ۔"

"ورنہ کیا مجھے مارو گے۔ طلاق دو گے؟" مشہودہ سیخ پا ہوتے ہوئے گرجی تھی۔

"ہاں ہاں! میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔" امجد سر میں ہونے والی دھمک سے بیتاب ہو کر جواباً چیخا۔

"تو دے دو طلاق...... ویسے بھی ایک ایم ڈی کا شوہر تم جیسے بیچ ماتحت کو نہیں ہونا چاہیے۔" مشہودہ نے امجد کو چڑایا۔

"اگر مجھ سے اتنی ہی بے زار ہو تو میں تمہیں آزاد کیے دیتا ہوں۔"

"مشہودہ یزدانی ولد عثمان یزدانی میں پورے ہوش وحواس میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔" مشہودہ امجد کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہی تھی۔

"امجد اب تم یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتے۔ جلد از جلد یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ خبردار تن کے کپڑوں کے علاوہ اس گھر کی کوئی شے لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

امجد غصے کی حالت میں اُٹھا اور پیر پٹختا ہوا کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ برے وقت کو آتے دیر نہیں لگتی۔ اسے رہ رہ کر اپنی معصوم بیوی جنت یاد آ رہی تھی۔ جو اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔ ذرا سے بخار یا ہلکے سے سر درد ہو جانے پر وہ ساری ساری رات جاگ کر امجد کا سر دباتے اور اسے دلاسہ دیتے ہوئے گزار دیتی تھی۔ مغرب کی دلدادہ مشہودہ اور مشرق کی پلی ہوئی جنت میں وہ تہذیبوں کا اصل چہرہ کھل کر امجد کے سامنے آ چکا تھا۔

چھ ماہ تک تو پاس موجود پیسوں سے امجد جیسے تیسے گزارہ کرتا رہا تھا۔ پھر ہاتھ کی کلائی میں موجود قیمتی گھڑی بچی اور اس کے بعد چین بھی بک گیا تھا۔ اس دوران امجد برابر نوکری کی تلاش میں بھی لگاتار کوشش جاری رکھے ہوئے تھا۔ مگر اس کے ناکامی کے اور کچھ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

یہ حالات صریحاً اس چیز کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ قدرت امجد سے انتقام لینے پر اُتر آئی تھی۔ امجد نے جو سزا اپنی معصوم بیوی جنت کو گھر سے نکال کر اسے دی تھی اب وہ خود اسی اذیت سے گزر رہا تھا۔

امجد کل رات سے بھوکا تھا اب تو بیچنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ بھوک تھی کہ برابر پیٹ میں کچوکے لگا رہی تھی۔ امجد دھیرے دھیرے چلتا ہوا ایک بہت بڑے ہوٹل کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔

"اتنا بڑا ہوٹل ہے شاید ایک وقت کا کھانا مل ہی جائے۔" امجد نے خود کلامی کی۔ وہ ہشاش بشاش مردوں اور عورتوں کو ہوٹل میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ گوکہ غیرت گوارہ نہیں کر رہی تھی۔ مگر غیرت سے پیٹ کی آگ تو نہیں بجھ سکتی تھی۔

بالآخر غیرت اور بھوک کی جنگ میں فتح بھوک ہی کو حاصل ہوئی اور امجد کے لڑکھڑاتے قدم ہوٹل منیجر کے آفس کی سمت اٹھنے لگے تھے۔

☆☆☆

ایک سال گزر گیا۔ بچوں کے امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ رزلٹ کارڈ وکیل صاحب کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ خوشی سے سرشار تینوں بچوں کو مبارکباد دے رہے تھے جنہوں نے اے ون گریڈ حاصل کیے تھے۔

"شاباش میرے بچو اسی طرح دل لگا کر تعلیم حاصل کرتے رہو۔ اور کبھی بھی ایسا موقع مت آنے دینا کہ میری طرح مار کھاؤ۔"

"ہیں خالو جانی آپ نے مار بھی کھائی ہے؟" امجد میاں نے سوال کیا زیب اور جنت بھی قریب ہی بیٹھی تھی۔

"ہاں امجد میاں صرف ایک مرتبہ مار کھائی تھی۔"

وکیل صاحب جواب دے کر نظریں جھکاتے ہوئے سوچوں میں گم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بولے۔

''اس وقت میں چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا۔ عمر یہی کوئی دس گیارہ سال کی رہی ہوگی۔ ایک دن میں اسکول صرف پانچ منٹ لیٹ پہنچا جس کی سزا کے طور پر استاد محترم نے میرے گال پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے نصیحت کی کہ جہانگیر میاں وقت کی قدر کرنا سیکھیں۔'' خیر چھٹی کے بعد میں گھر پہنچا تو غصے کے مارے برا حال تھا۔ میرے ابو اخبار پڑھ رہے تھے اور امی قریب ہی بیٹھی ہوئی کپڑوں پر بٹن ٹانک رہی تھیں۔

''جہانگیر بیٹے اِدھر آیئے۔'' ابو نے اخبار ایک طرف رکھ کر مجھے بلایا اور میں خاموشی سے اُن کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟''

''دیکھیے نا ابو آج کلاس ٹیچر نے میرے گال پر تھپڑ مارا ہے۔''

''اوہو، یہ تو انہوں نے بہت برا کیا کہ دوسرا گال چھوڑ دیا۔'' اتنا کہتے ہی ابو نے بھی ایک کرارا تھپڑ میرے دوسرے گال پر رسید کر دیا۔ تو بچو! میں نے اپنی امی کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں اور کبھی ابو کے ہاتھ سے پٹنے نہیں دیتی تھیں مگر امی نے اس روز مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے ابو سے کہا۔

''لگائیں دو تھپڑ میری طرف سے، آج اِن کی اتنی مجال ہو گئی کہ اپنے استادِ محترم کی شکایت گھر پر آ کر کر رہے ہیں۔''

''جہانگیر میاں میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن جو استاد تعلیم کے پَر لگا کر آپ کو آسمان کی بلندیوں پر اُڑنا سکھا رہے ہیں۔ اُن کی شکایت میں آئندہ آپ کے منہ سے نہیں سنوں۔'' ابو نے سختی سے مجھے تنبیہ کی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ ابو اسکول میں جا کر ضرور استاد محترم سے باز پرس کریں گے۔ مگر ابو اور امی کے رویے نے مجھے سمجھا دیا کہ استاد کی عزت اور تعلیم کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اور ہاں میں یہ بھی بتلاتا چلوں کہ روز صبح بیدار ہو کر کلمہ شریف پڑھنے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھ کر گالوں پر ہتھیلیاں پھیرتا ہوں اور پھر ان ہتھیلیوں کو عقیدت و احترام سے چوم لیتا ہوں۔ بچو! میں آج جس مقام پر کھڑا ہوں صرف اُن دو تھپڑوں کی بدولت جو استاد محترم اور میرے والد نے میرے گالوں پر مارے تھے۔ میری قابلیت کو اعلیٰ عدالتیں بھی تسلیم کرتی ہیں۔ پہلے مجھے ان تھپڑوں پر غصہ آیا تھا مگر اب دن دونوں محترم ہستیوں کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔'' اتنا کہہ کر وکیل صاحب خاموش ہو گئے تھے۔

''ابو پرسوں ہماری کلاس فیلو شہناز کو کلاس مس نے اُس کی شیطانی پر صرف ڈانٹا تھا۔ اور کل شہناز کی امی اور بڑی بہن نے کلاس میں آ کر مس کو اتنا ذلیل کیا کہ وہ روتی ہوئی استعفیٰ دے کر چلی گئیں۔''

''ہاں بھئی امریکہ میں قانون ہے اگر ماں باپ بچے کو ڈانٹیں تو سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ دراصل ہمارا معاشرہ ایک ایسی سواری پر سوار ہے جو برف پر پھسلتی ہوئی اس کھائی کی طرف جا رہی ہے جس میں مغربی تہذیب کا تعفن بھرا ہوا ہے۔ اور ہم ہیں کہ اُن کی تقلید میں مرے جا رہے ہیں۔ آپ کی مس کو ذلیل کرنا اور اُن کو نوکری چھوڑ جانے پر مجبور کرنا۔ یہ...... یہ صرف جھوٹی انا ہے۔ دکھاوا ہے کہ دیکھو ہم کتنے پانی میں ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ استاد کو بھی نہیں نکال رہے ہیں۔ بچے کے دل سے استاد کے احترام اور تعلیم کی اہمیت کو نکال رہے ہیں۔

''کیا خیال ہے بچو! آپ سب کے پاس ہونے کی خوشی میں کیوں نہ آج باہر لنچ کیا جائے؟'' وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے بچوں کو مخاطب کیا۔

''ابو زندہ باد...... ابو زندہ باد۔'' تینوں بچوں نے خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے تالیاں بجائی تھیں۔

چنانچہ وکیل صاحب کے اشارے پر سب اہلِ خانہ تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

''بھئی زیب آج کس ہوٹل میں چلا جائے؟'' وکیل صاحب نے پیسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی اپنی بیگم سے دریافت کیا۔

"لنچ کی دعوت آپ کی جانب سے ہے تو چوائس بھی آپ کی ہی ہونی چاہیے۔"

"ہوں۔" وکیل صاحب نے ہنکارا بھرا۔ "تو پھر ہوٹل ڈی فرانس کیسا رہے گا؟"

"مجھے تو بہت پسند ہے۔ پُرسکون ماحول، کشادہ اور بخ کیبن، اور لذیذ کھانے۔" زیب خوش ہوتے ہوئے بولی تھی۔ تینوں بچے اور جنت باہر کی رونق دیکھنے میں مگن تھے۔

وکیل صاحب نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں لے جا کر روکی۔ اور اپنی فیملی کو لیے ایک الگ تھلگ بنے ہوئے کیبن میں جا کر بیٹھ گئے۔ دریں اثناء اسجد میاں نے سرگوشی میں جنت سے کچھ کہا تھا۔

"بھائی جان میں اسجد کو واش روم میں لے جا رہی ہوں۔ آپ اتنی دیر میں لنچ منگوا لیے گا۔" جنت نے اتنا کہہ کر اسجد کا ہاتھ تھاما اور کچھ فاصلے پر ایک قطار میں بنے ہوئے واش رومز کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

وکیل صاحب کے آرڈر کے مطابق ویٹر لنچ لے آیا۔

کچھ دیر بعد جنت اسجد کو لیے واپس آ گئی اور لنچ شروع کر دیا گیا تھا۔

کھانے کے دوران وکیل صاحب ہلکی پھلکی گفتگو سے سب کو ہنساتے رہے۔ تب ہی کیبن کے دروازے کو نوک کیا گیا۔ وکیل صاحب نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آدھا گھنٹہ پورا ہو چکا تھا۔ جنت نے فوراً نقاب چہرے پر گرا لیا۔

"آ جاؤ بھئی۔" وکیل صاحب نے با آواز بلند ویٹر کو مخاطب کیا تھا۔

ویٹر اندر داخل ہوا اور کولڈ ڈرنک میز پر سجانے لگا۔ معاً جنت کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ کر پلیٹ میں گرا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھی رہ گئی۔

"ارے ارے...... کیا ہو گیا تمہیں۔" زیب نے کھانا چھوڑ کر جنت کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔

"ہاں ہاں! بتاؤ بیٹی جنت یہ اچانک کیا پریشانی لاحق ہو گئی آپ کو؟" وکیل صاحب تشویش ناک لہجے میں گویا ہوئے۔

"جنت۔" ویٹر نے چونکتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔

"صاحب جی یہ جنت ہیں؟"

"ہاں میاں یہ ہماری چھوٹی بہن جنت ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"صاحب جی! میرا نام امجد ہے۔ میری پیاری بیوی کا نام بھی جنت ہے جو مجھے دنیا کی دوزخ میں جلتا ہوا چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی ہیں۔"

"اچھا تو تم ہی ہو وہ سنگدل انسان۔" وکیل صاحب خشمگیں نظروں سے چند لمحے امجد کو گھورتے رہے پھر بولے۔

"مسٹر امجد جنت خود سے نہیں گئی تھیں انہیں آپ نے گھر چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ شوہر پرست بیوی گھر سے نہ نکلتی تو اور کیا کرتی۔ کیوں کہ دوسری صبح آپ اُن کو وہ تکلیف دہ الفاظ سنا دیتے جن کو میں وکیل ہوتے ہوئے اپنی زبان پر لانا نہیں پسند کرتا۔ کاش اتنا تو سوچا ہوتا کہ ایک گھریلو لڑکی جس نے تنہا نکل کے کبھی باہر کی دنیا نہ دیکھی ہو۔ وہ ایک معصوم جان کو لیے کہاں بھٹکتی پھرے گی۔

جنت خدا پر توکل کر کے اور آپ کے حکم سے مجبور ہو کر نکلی تھیں۔ تو وہ مالک کائنات اپنے چاہنے والوں کو کیسے بے آسرا چھوڑتا۔ یاد رکھیے مسٹر امجد دنیا کے آسرے ختم ہو جاتے ہیں مگر جو خدا کے آسرے اور اس کی مدد پر ایمان ویقین رکھتے ہیں وہی لوگ عظیم ہوتے ہیں۔ جنت میری بیگم کو ملیں اور بیگم انہیں گھر لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کو بھٹکنے نہ دیا اور نہ ان کی عزت پر کوئی حرف آیا۔ اب جنت ہم میاں بیوی کی چھوٹی بہن کی حیثیت سے باعزت زندگی گزار رہی ہیں۔

"اور آپ...... مسٹر امجد خدائے بزرگ و برتر نے آپ کو خود اسی سزا سے گزارا ہے جو آپ نے اپنی معصوم اور پاکباز بیوی کے لیے تجویز کی تھی۔ جنت بیٹی کو وہی مقام حاصل رہا جو اُن کے پیاروں کی موجودگی میں اُن کو حاصل تھا۔

مگر اب آج خود کو دیکھیں کس عالم میں ہمارے

سامنے کھڑے ہیں۔ کتنی شرم آرہی ہے آپ کو اس حلیے میں دیکھ کر ہم سب کو۔ اس کو کہتے ہیں مکافات عمل۔ شکر کیجیے امجد صاحب آپ کی نیک بیوی نے ہمیشہ آپ کی بہتری کی دعائیں مانگی ہیں اور آپ خدا کے غضب سے صرف اتنی ہی سزا کے مستحق ٹھہرے۔ ورنہ ایک وکیل ہونے کے حیثیت سے خدا کے چاہنے والے بندوں پر ظلم کرنے والوں کے میں نے بڑے بھیانک حشر ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔'' وکیل صاحب نے حتیٰ الامکان سخت لفظوں سے بچتے ہوئے سخت غصے کے عالم میں دل کھول کر امجد کی خبر لی تھی۔ جنت کی موجودگی میں امجد کے لیے فی الحال اتنا ہی ڈوز کافی تھا۔

''صاحب جی مجھے اپنا ہر قصور منظور ہے۔ ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ مجھے اپنی جنت سے معافی......''

''میری تربیت میں اللہ کی رضا اور شوہر کی عزت اور مرتبے کا احترام شامل ہے۔'' جنت نے نقاب اُلٹ کر اپنے شوہر کو مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کتنی عظیم ہیں میری بہن آپ۔ اس پُر آشوب اور بے حیائی کے دور میں مذہب اسلام کی سیپ سے نکلے ہوئے آپ جیسے گوہر نایاب کو دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔'' وکیل صاحب کچھ دیر تک جنت کو تعریفی نظروں سے دیکھتے رہے پھر وہ امجد سے مخاطب ہوئے۔

''جایئے اور جا کر منیجر کو بلا کر لائیں۔'' کچھ دیر بعد منیجر بوکھلایا ہوا کیبن میں داخل ہوا تھا۔

''سر کیا میرے ویٹر سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی؟''

''غلطی ہوئی نہیں بلکہ ہوگئی تھی اور یہ حضرت اُس کی سزا بھی پاچکے ہیں...... خیر یہ بتانا ضروری نہیں ہے آپ صرف اتنا کریں اِن کا کلیئرنس کر کے ذرا جلدی فارغ کردیں۔''

''ابھی لیجیے سر! صرف پندرہ منٹ کی اجازت دے دیں۔''

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وکیل صاحب کی فیملی واپس روانہ ہو چکی تھی۔ البتہ اس فیملی میں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ تھا امجد۔

☆☆☆

''زیب۔'' وکیل صاحب نے برابر میں بیٹھی ہوئی اپنی بیگم کو مخاطب کیا۔

''زیب جنت بیٹی کو دس ہزار روپے دے دو۔'' وہ امجد کو خالی ہاتھ اور ایک ہی میلے جوڑے میں دیکھ چکے تھے۔ پھر وہ جنت سے مخاطب ہوئے تھے۔

''جنت بیٹی آپ لوگ آج آرام کریں۔ اور کل صبح شہر جا کر امجد جو بھی پسند کریں آپ انہیں وہ کپڑے اور شوز دلوا دینا۔ ٹھیک ہے۔''

''بہت بہتر بھائی جان۔'' جنت نے ادب سے جواب دیا تھا۔

اس دوران زیب رقم نکال چکی تھیں۔ اُس نے مسکراتے ہوئے رقم جنت کے ہاتھ میں تھمائی۔ پھر جنت کے قریب بیٹھے ہوئے امجد کے گال کو پکڑ کر دو تین ہولے ہولے جھٹکے دیے۔

''گڈ لک۔'' زیب نے امجد سے کہا۔

''تھینکس۔'' امجد نے جھینپتے ہوئے انداز میں جواب دیا تھا۔

گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی اور باوردی ڈرائیور فوراً ہی گاڑی کے قریب آکر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

''سنو یوسف۔'' وکیل صاحب نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

''جی مالک حکم۔''

''کل صبح کار تیار رکھنا۔ کل تم بیٹی جنت اور اُن کے شوہر کے تابع رہو گے۔''

''جو حکم مالک۔'' ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا تھا۔

☆......☆......☆

فجر کی اذان کے شروع ہوتے ہی جنت کے ساتھ ساتھ اسجد میاں بھی گھبرا کر بیدار ہوگئے۔ اسجد میاں ماشاء اللہ اتنا قرآن مجید پڑھ چکے تھے جس سے نماز کے مطلوبہ فرائض ادا کرسکیں۔ دونوں ماں بیٹے نے جلدی جلدی وضو کیا اور اسجد نماز کے لیے مسجد میں جانے کو تیار ہوگئے۔

''اسجد۔'' اچانک امجد نے آواز دی اور اسجد میاں چونک کر جی ابو کہتے ہوئے امجد کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

''کہاں جارہے ہیں؟''

''ابو......مم......مسجد میں نماز پڑھنے۔ اللہ میاں سے باتیں کرنے۔'' اسجد میاں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''بیٹا آپ اکیلے ہی جارہے ہیں۔ اپنے گنہگار ابو کو ساتھ میں نہیں لے جائیں گے؟''

''سچ ابو آپ بھی نماز پڑھنے چلیں گے؟'' امجد سے اسجد نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! جس ذاتِ عظیم نے آپ سا ننھا فرشتہ اور آپ کی ماما کی صورت میں جیسے دنیا ہی میں جنت بخش دی ہو وہ بدنصیب کب تلک اپنے پیدا کرنے والے کی نافرمانی کرتا رہے گا۔'' یہ کہہ کر امجد نے بھی اُٹھ کر وضو کیا۔ دو رکعت سنت موکدہ گھر میں ادا کی پھر بیٹے نے باپ کی انگلی پکڑی اور دونوں مسجد کی جانب روانہ ہو گئے۔

''اے میرے اللہ آج انہوں نے فلاح کی جانب پہلا قدم رکھا ہے۔ تُو ان کے قدموں کو استقامت بھی بخشنا۔'' جنت نے مسکراتے ہوئے خدا سے دعا کی۔

آج جنت بہت خوش تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر لان میں آ گئی۔ لان میں مور اور مورنی کا جوڑا دانہ دنکا چگنے میں مصروف تھا۔

''اے مجھ ناتواں کو خوشیوں کی دولت سے نہال کرنے والے کس زباں سے تیرا شکر کروں۔ ہر ہر مقام پر میری دستگیری فرمائی۔ دلوں کے بھید جاننے والے وہ آرزوئیں جو ابھی میرے دل میں تھیں اور زبان تک نہیں آئیں تھیں۔ میرے بن کہے وہ بھی تُو نے پوری کر دیں۔ میرے غفور و الرحیم کتنا مہربان ہے تُو۔ جو ہاتھوں کے اُٹھنے سے پہلے ہی میری مرادوں کو بر لاتا ہے۔

تب جنت دو زانو ہو کر نرم و ملائم گھانس پر بیٹھ گئی۔ وہ ساتوں قراتوں پر مکمل عبور رکھتی تھی۔ جنت نے ہاتھ سینے پر باندھے آنکھیں بند کیں اور چوتھی قراتوں میں تلاوت شروع کر دی۔

باغ میں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بادِ صرصر آہستہ آہستہ بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکوں میں تبدیل ہو کر بہنے لگی۔ درختوں پر چہچہاتے پرندوں کا شور تھم گیا۔ لان میں دانہ دنکا چگنے والے مور اور مورنی کے جوڑے نے اچانک گردنیں اُٹھا کر جنت کو دیکھا۔ وہ برابر ٹکٹکی باندھے جنت کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جنت کے قریب پہنچ کر اس کی زانو سے دائیں بائیں لگ کر بیٹھ گئے۔ جنت نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اپنے ہاتھ مور، مورنی کی پشت پر رکھ کر دوبارہ تلاوت میں مصروف ہو گئی۔ معصوم پرندوں کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنی گردنیں جھکائے یوں کلامِ ربانی کو سُن رہے تھے جیسے وہ اس عظیم کلام کے ایک ایک لفظ کے معنی اور مطلب کو سمجھ رہے ہوں۔

آج کا انسان چاہے اس دیے جانے والے درس سے سبق حاصل نہ کرے۔ وہ قرآن کی تلاوت ایک عام انداز میں کر کے گویا اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ لیکن جنت اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عنایات کو پا کر اس کی محبت میں ڈوب کر تلاوت کر رہی تھی۔ تو پھر اس مقدس کلام کا اثر بادِ صرصر، درختوں پر چہچہانے والے پرندوں اور موروں کے جوڑے پر کیوں نہ ہوتا۔

☆......☆......☆

ایک ہفتے بعد دوپہر کے کھانے پر وکیل صاحب نے امجد کو مخاطب کیا۔

''امجد میاں آپ کل تیار ہو کر ٹھیک دس بجے گڈلک کاسمیٹکس اینڈ لیدر گارمنٹ کمپنی چلے جانا۔ وہاں منیجر سیلز کی آسامی خالی ہوئی ہے۔ اور کل انٹرویو ہیں، یہ بہت بڑی کمپنی ہے اس کے مالک کا نام سر جنید ہے۔ وہی انٹرویو لیں گے۔ آدمی گو کہ بہت سخت ہیں مگر آپ گھبرانا مت اور پوری آزادی سے سوالوں کے جواب دینا۔''

''بہت بہتر بھائی جان، میں آج ہی اپنی سی وی تیار کر لیتا ہوں۔'' امجد نے جواب دیا تھا۔

کمپنی کے ہال میں کنڈیڈیٹس کی بڑی تعداد موجود تھی۔ امجد کو ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ بالآخر چپڑاسی نے اس کا نام پکارا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

سر جنید خاموشی سے امجد کی سی وی کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے امجد سے اُن کے دادا کا نام پوچھ کر خود ہی سی وی کو مکمل کیا تھا۔ سر جنید مختلف سوالات کرتے رہے اور امجد اپنے جوابات سے انہیں مطمئن کرتا

رہا۔

"مسٹر امجد! آپ کی قابلیت اور تجربے نے ہمیں خاصا متاثر کیا ہے۔ تاہم ہمارے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ ہماری حریف کمپنی ہمیں ہر میدان میں شکست دے رہی ہے۔"

"دراصل ہماری پروڈکشن اتنی نہیں ہے کہ ہم دیے گئے آرڈرز کی مانگ پوری کر سکیں۔ لامحالہ ہمیں اپنی پیداوار بڑھانے کے لیے دونمبر مال کا سہارا لینا پڑے گا۔ کیا آپ باہر کے ممالک میں ہمارے مال کی کھپت کے لیے تیار ہیں؟"

"سوری سر، میں دونمبر مال کے فیور میں نہیں ہوں۔"

"مسٹر یہ کمپیٹیشن کا دور ہے۔ ہر شے میں ملاوٹ ہو رہی ہے۔"

"اور آپ کیا یورپ والوں کو اتنا بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اُن کی جدید لیبارٹریز دومنٹ میں کھرا اور کھوٹا الگ کر دیں گی۔"

"جب آپ یہ رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انٹرویو دینے کیوں تشریف لے آئے۔ جائیے جا کر کسی مسجد کے پیش امام بن جائیں۔"

"تھینک یو سر۔" امجد اُٹھا اور سب لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہوا دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ وہ سب اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"افسوس دینی تعلیم میں اتنا قابل نہیں ہوں جو کسی مسجد کے پیش امام کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ البتہ بے ایمانی کے کام میں اپنا ضمیر بیچنا اور وطن عزیز کی عزت کو دوسرے ممالک کی نظروں میں گرانا قبول نہیں۔" امجد اتنا کہہ کر تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

سرجنید نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔ اور پھر تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ پھر سرجنید نے چپڑاسی کو حکم دیا۔

"دوسرے امیدوار کو بھیجو۔"

☆☆☆

"انٹرویو کیسا رہا؟" جنت نے امجد کے جوتے اتارتے ہوئے پوچھا۔

"افسوس جنت، میں ناکام رہا؟"

"چلیں کوئی بات نہیں دل چھوٹا نہ کریں۔ اللہ ضرور کوئی وسیلہ پیدا فرمائے گا۔"

"جنت میں نے تو پورے خلوص کے ساتھ اپنے رب کے آگے سر جھکایا ہے۔ شاید اُس کی بارگاہ میں میرے سجدوں کو شرفِ قبولیت حاصل نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں کہتے اللہ تعالیٰ سجدوں کی توفیق بھی انہی کو بخشتا ہے جن کے سجدے قبول فرماتا ہے۔" جنت نے محبت سے سمجھایا تھا۔

بچوں کے اسکول سے آتے ہی دوپہر کا کھانا لگا دیا گیا۔ وکیل صاحب بھی آ چکے تھے۔ چنانچہ کھانا شروع کر دیا گیا۔ دریں اثناء امجد نے اپنے انٹرویو کے نتیجے سے وکیل صاحب کو آگاہ کیا اور کھانا کھا کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔

"بھائی جان...... انہیں افسوس ہے خدا نے اِن کے سجدوں کو شرف قبولیت نہیں بخشا اسی لیے انٹرویو میں فیل ہو گئے ہیں۔" جنت نے وکیل صاحب سے کہا۔ وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے پہلے جنت پھر امجد کی طرف دیکھا۔

"امجد میاں جب کسی گنہگار اور بھٹکے ہوئے بندے کی پیشانی اپنے رب کے حضور زمین سے جا لگتی ہے تو اس کی رحمت یہ گوارا ہی نہیں کرتی کہ اس کے آگے جھکنے والے سر کو بے مراد رکھے۔ یہ لیجیے۔" وکیل صاحب نے ایک لفافہ امجد کی سمت بڑھایا۔

"کیا ہے بھائی جان اس میں؟" جنت نے بیتابی سے سوال کیا۔

"اس لفافے میں اِن کا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔ سرجنید نے انہیں سیلز منیجر کے عہدے پر رکھ لیا ہے۔ تنخواہ پچاس ہزار روپے ماہانہ ہے اور کمپنی کو فائدہ پہنچانے کی مد میں مزید ترقی کے مواقع بھی ہیں۔"

کچھ دیر بعد امجد جنت کے ہمراہ مبارکباد وصول کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ امجد میاں باہر بہنوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

"جنت کیا واقعی خلوص دل سے مانگی جانے والی دعاؤں اور سجدوں میں ایسی تاثیر ہوتی ہے؟" امجد نے نی

وی آن کرتے ہوئے جنت سے سوال کیا۔
اس سے پہلے کہ جنت کوئی جواب دیتی۔ ٹی وی پر دکھائی جانے والی قوالی امجد کے سوال کا جواب دہرا رہی تھی۔

خلوصِ دل کے سجدے رائیگاں جایا نہیں کرتے
خدا کے نام لیوا غم سے گھبرایا نہیں کرتے

☆......☆......☆

امجد نے اپنی ساری توانائی کمپنی کی ترقی پر خرچ کر ڈالی تھی۔ کمپنی پہلے ایک شفٹ کام کرتی تھی مگر بڑھتی ہوئی مانگ نے دوسری اور پھر تیسری شفٹ کھولنے کی راہ ہموار کردی۔ نتیجتاً لوگوں کو نہ صرف روزگار ملا۔ بلکہ کمپنی کی آمدنی کا ہدف لاکھوں سے نکل کر تیزی سے کروڑوں تک پہنچ گیا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا اس لیے سب گھر پر ہی موجود تھے۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی گنگنانے لگی۔

''ہیلو۔'' وکیل صاحب نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔ وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی گفتگو کی آواز سنتے رہے پھر بولے۔

''بہت بہت شکریہ سر، ہم لوگ ضرور حاضر ہو جائیں گے۔'' یہ کہہ کر وکیل صاحب نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''کس کا فون تھا؟'' زیب نے سوال کیا۔

''سر جنید تھے لائن پر۔ انہوں نے ہم سب کو لنچ پر مدعو کیا ہے۔ آپ لوگ جلد از جلد تیار ہو جائیں۔ سر جنید وقت کے بہت پابند ہیں ہمیں ٹھیک ایک بجے اُن کی کوٹھی پر پہنچنا ہے۔''

کار میں وکیل صاحب اُن کی بیگم پچھلی سیٹ پر امجد، جنت، اسجد اور دونوں بچیاں موجود تھیں۔ اسجد میاں امجد کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''بیگم ہم شاید کسی غلط کوٹھی میں آ گئے ہیں۔ وکیل صاحب نے کوٹھی کے مین گیٹ پر کھڑے اجنبی چہروں کو دیکھتے ہوئے بیگم کو مخاطب کیا۔

''واقعی وہ سر جنید اور اُن کی بیگم تو نہیں لگ رہے۔'' زیب نے تشویش کے عالم میں جواب دیا۔ گاڑی آہستہ روی سے چلتی ہوئی رُک گئی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ اچانک کھلا اور جنت تڑپ کر باہر نکلی وہ بے قراری کے عالم میں تیزی سے اجنبی شخص کی جانب لپکی اور دادا جان کہتی ہوئی اجنبی شخص کے سینے سے لپٹ گئی۔

''میری بچی کہاں کھو گئی تھی تو۔'' دادا جان نے بھرائی ہوئی آواز میں جنت کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

وکیل صاحب اور زیب سمجھ گئے کہ گیٹ پر کھڑے ہوئے مرد اور عورت جنت کے دادا، دادی ہیں۔ امجد دادا دادی سے مل کر شرمندگی سے سر جھکائے اپنے ابو ہارون میاں کے سامنے کھڑے تھے۔ اور ہارون جنت کو لپٹائے ہوئے سخت نظروں سے امجد کو گھور رہے تھے۔ بالآخر اُن کے چچا رشید میاں نے بڑھ کر امجد کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر مسکرا کر بولے۔

''شام کا بھولا اگر دوپہر کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔'' اس بگڑی ہوئی مثال پر سب مسکرانے لگے تھے۔ رشید میاں نے فوراً ہی وضاحت بھی کر دی تھی۔

''دراصل یہ شام کو اپنی دوسری بیگم کے ہمراہ گھر سے نکلے تھے اور آج دوپہر کو واپس آئے ہیں۔'' سب مل کر کوٹھی میں داخل ہوئے۔ سر جنید اور اُن کی بیگم ہاتھوں میں پھولوں کے خوبصورت ہار لیے کھڑے ہوئے تھے۔ سر جنید نے امجد کے گلے میں ہار ڈال کر اُس کی پیشانی چوم لی۔

''شکریہ سر!'' امجد نے ادب سے سر جنید کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرا ہار سر جنید کی بیگم نے جنت کے گلے میں ڈال کر اُسے امجد کے ملنے پر مبارکباد دی تھی اور جنت نے اُن کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا تھا۔

''باقی باتیں بعد میں پہلے دعوت سے انصاف فرمالیں۔ سر جنید سب مہمانوں کو کھانے کی میز پر لے آئے۔''

کھانا پُرتکلف اور بہت مزیدار تھا سب نے سیر ہو کر کھایا تھا۔ جب نوکروں نے میز صاف کر دی تو سر جنید نے گفتگو کا آغاز کیا۔ تین خوشیاں مجھے ایسی ملی ہیں کہ میں رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

پہلی خوشی، آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ میں امجد میاں کے دادا سے کیسے واقف ہوں۔ تو بھئی یہ میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ امجد کی سی وی پر میں اُن کا نام لکھتے وقت چونکا تھا۔ کیا میرے بچپن کا کلاس فیلو اور جگری دوست تو نہیں ہے۔

بعد کی تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت وہی ہیں۔ میں ان سے ملنے اِن کے گھر جا پہنچا۔ دونوں میاں بیوی اپنے پوتے پوتی کے غم میں ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ میں نے اِن کو دلاسا دیا اور بتایا کہ امجد میری کمپنی میں ملازم ہیں تو دونوں کی ڈھارس بندھی اور خوشی بھی ہوئی۔

"دوسری خوشی بیٹی جنت آپ سے وابستہ ہے۔ آپ نے جو عمل اپنے شوہر کے حکم پر کر کے دکھایا۔ اُس نے دخترِ اسلام کے پاکیزہ کردار کو زندہ کر دکھایا ہے۔ آپ جس مقدس ذات کے محبوب ﷺ پر آٹھوں پہر درود وسلام پڑھتی رہتی ہیں وہ بھلا آپ کو کیسے تنہا اور بے سہارا چھوڑ سکتے تھے۔ آپ وکیل صاحب کے گھر آ گئیں۔ امجد میاں آپ کو آپ کی گستاخی کی سزا ملی۔ تاہم آپ کی محترم بیوی اور بچے کی دعاؤں پر خدا کی رحمت جوش میں آئی اور اُس نے آپ کی سزا معاف کر کے دوبارہ جنت بیٹی سے ملوا دیا۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں جو اتنی نیک شریکِ حیات آپ کو ملی ہے۔ درود وسلام پڑھنے والوں سے خدا اس لیے بھی زیادہ محبت کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے محبوب ﷺ سے محبت کرتے ہیں۔"

"اب تیری خوشی!" سر جنید نے رُک کر اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھیں اور ایک خوبصورت لفافہ امجد کو دیتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! امجد ہماری کمپنی میں جنرل منیجر کی پوسٹ مبارک ہو۔"

"شکریہ مادام بہت بہت شکریہ۔" خوشی کے مارے امجد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سب ہی نے امجد کو مبارکباد دی تھی۔

"یہ لو میاں امجد یہ چابیاں اس کوٹھی کی ہیں جو وکیل صاحب کی کوٹھی کے عین سامنے بنی ہے اور یہ دوسری چابی کار کی ہے۔ کوٹھی ویل ڈیکوریٹڈ ہے۔ خانساماں، چوکیدار، مالی اور دیگر گھریلو ملازمین معہ کار ڈرائیور ہر وقت آپ لوگوں کے لیے کوٹھی میں موجود رہیں گے سارے ملازمین کی تنخواہیں کمپنی کے ذمے ہیں۔"

"بھئی جنید تم نے تو میرے پوتے کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔" دادا جان مسکرائے۔

"ہاں میرے دوست تمہارا پوتا ان بلندیوں سے زیادہ کا اہل ہے۔ اور اب یہ صرف تمہارا ہی نہیں میرا بھی پوتا ہے۔ اور یہ بات میں دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں۔"

☆......☆......☆

سب لوگ چلتے ہوئے کوٹھی کے طویل و عریض خوبصورت باغ کو عبور کرنے کے بعد کوٹھی کے دیو قامت گیٹ سے اندر داخل ہوئے اور اُن کے قدم یکدم ایک جھٹکے سے رُک گئے۔ سامنے جنت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہی جھکی ہوئی گھنیری پلکیں اور چہرے پر برستا ہوا نور جس کو کیمرے کی آنکھ نے بہت خوبصورتی سے فوکس کیا تھا۔ جنت کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اُس کی بھنوؤں کو چھو رہی تھیں جبکہ بایاں ہاتھ اندر کی جانب چلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

جنت یقیناً اپنے پیاروں کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے گھر آنے پر مبارکباد دے رہی تھی۔ ایک شعر آسمان اور زمین کی جنتوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔

مانا کہ آسمان پر جنت کا ہے وجود
بیوی اگر ہو نیک گھر جنت سے کم نہیں

سب ہال میں پہنچ کر نشستوں پر بیٹھ گئے۔ امجد جنت کو اپنے کمرے میں لے جانے کے لیے اوپر لے آیا تھا۔

ہال میں دادا جانی سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"دیکھ لیا آپ لوگوں نے امجد میاں اپنے مرکز سے کتنے دور جا چکے تھے۔ مگر دوبارہ وہیں واپس آ گئے ہیں۔ اور انشاء اللہ اب وہ کبھی بھی مرکز سے جدا نہیں ہوں گے۔"

"جنت اپنے مبارک ہاتھوں سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولو۔" امجد نے جنت کی طرف تالے کی چابیاں بڑھائیں۔ جنت نے گھنیری پلکیں اُٹھا کر امجد کو دیکھا اور بولی۔

"میرا کمرہ......! کہیں میں پھر سے بے دخل تو نہ کر دی جاؤں گی۔"

"نہیں جنت ایسا وقت آنے سے پہلے میں خود اپنی زندگی سے بے دخل......!" جنت نے تڑپ کر امجد کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

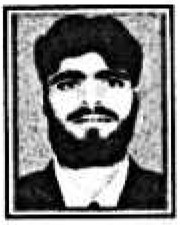
"اللہ نہ کرے۔ آئندہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے نہ سنوں۔ چلیے دروازہ آپ کھولیں۔"

"نہیں دروازہ تم ہی کھولو گی۔"

''یہ آپ کا حکم ہے؟'' جنت مسکرا دی۔
''نا بابا۔ میری توبہ میرے باپ کی توبہ جو کبھی حکم دوں البتہ التجا ہے۔ ریکویسٹ ہے۔''
امجد دونوں کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرتے ہوئے گھگھیا یا تھا۔ اور جنت کھلکھلا کر ہنس دی۔
جنت نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور امجد اسے بازوؤں سے پکڑ کر کمرے میں آیا۔ امجد نے دوبارہ وہی شعر پڑھا تھا۔
مانا کہ آسمان پر جنت کا ہے وجود
بیوی اگر ہو نیک گھر جنت سے کم نہیں
یکبارگی جنت کی جھکی ہوئی نگاہیں امجد کی نگاہوں سے ٹکرائیں تب وہ آگے بڑھی اور امجد کے سینے سے جا لگی۔
''سرتاج۔ اتنی بلندی نہ عطا کریں۔''
''میرے بلند اور پاکیزہ کردار رکھنے والے ساتھی آپ کا مقام آسمان پر ہے۔ جسے پانے کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں مچلتی رہتی ہے۔''
''اس عزت افزائی کے لیے ممنون ہوں۔''
''جنت میں نے آپ کو کبھی کوئی تحفہ نہیں دیا تھا مگر آج ضرور دوں گا۔''
''کیسا تحفہ...... کیا وہ کوئی قیمتی تحفہ ہے؟''
''تحفہ ہے تو بہت قیمتی۔''
''اُف اللہ! سرتاج جلدی سے دکھائیے نا۔ وہ ایسا کون سا قیمتی تحفہ ہے؟'' جنت نے بے تابی سے پوچھا۔
جواب میں امجد نے جیب سے پاسپورٹ اور ہوائی جہاز کے ریٹرن ٹکٹ نکال کر جنت کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔
''جنت جن محبوب خدا کی محبت میں ڈوب کر آپ آٹھوں پہر درود و سلام پڑھتی رہتی ہو۔ اب اُن کے روضہ اطہر کے سامنے ادب سے کھڑے ہو کر درود و سلام پڑھنا، ہم سب ایک میں عمرے کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ میں یہ خوشخبری نیچے سب لوگوں کو سنانے جا رہا ہوں۔''
امجد اتنا کہہ کر کمرے سے چلا گیا تھا۔ اتنا عظیم تحفہ پا کر جنت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ تو بہت صابر و شاکر اپنے خدا کی رضا میں خوش رہنے والی لڑکی تھی۔ کوئی بھی اپنے سر پر سوکن کا لانا برداشت نہیں کر پاتی۔ مگر جنت اپنے شوہر کی خوشی کے لیے سب سے ٹکرائی تھی۔ اور دلہن کو سیج پر لے جاتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔
جنت کمرے سے اور پھر مشہودہ کے کہنے پر اپنے شوہر کے حکم پر گھر سے بے گھر ہوئی۔ تو مسکرا رہی تھی۔ اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا غم ضرور تھا مگر لبوں نے مسکرانا نہیں چھوڑا۔ مشہودہ کا ڈرائیور اسے بھیانک ویرانے میں بے یارو مددگار چھوڑ گیا۔ مگر جنت مسکراتی رہی۔ تاہم جنت آج پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اس خوف سے گریہ کناں تھی کہ کوئی بے ادبی نہ ہو جائے۔
''میرے آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ میرا ناپاک وجود، بے ادب زبان گنہگار آنکھیں اور آپ کی بارگاہ سے اذنِ باز یابی، یہ گنہگار سخت شرم سار ہے۔ آپ کے دربار عالی وقار میں تو غوث، اولیائے کرام اور بزرگانِ دین جنہیں اللہ کا دوست بننے کا شرف حاصل ہے آپ کے حضور بے ادبی کے خوف سے لرزاں بر اندام رہتے ہیں۔ تو اس خاک کی کیا قیمت، ڈرتی ہوں میرے درود و سلام کے جواب میں (لا) کی صدا نہ گونج اٹھے۔
جنت رو رو کر سارے جہانوں کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو حاضری کے خوف سے لرزتی رہی۔ اچانک جنت کو ہلکی سی غنودگی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ہاتف کی شیریں آواز سُن رہی تھی۔
''وہ تو سراپا رحمت اور کرم ہی کرم ہیں انہوں نے صرف باز یابی بخشا ہے تو دل کیوں چھوٹا کرتی ہو۔ اُن کا حکم ہے کہ اُن کی بارگاہ بے کس میں سب سے پہلے تمہارے سلام کا جواب دیا جائے گا۔''
جنت نے غنودگی سے بیدار ہو کر فوراً آنکھیں کھول دیں۔ دل کو سکون مل گیا، بے قرار روح کو قرار آ گیا۔ جنت کی نگاہیں دیوار میں لگے سبز گنبد کے مکین کے طغرے پر پہنچ کر رُک گئیں۔ جنت گنبد خضرا کو آنکھوں میں بسائے ہولے ہولے گنگنانے لگی تھی۔
جسے چاہا در پہ بلا لیا جسے چاہا اپنا بنا لیا
یہ بڑے کرم ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے
☆☆......☆☆

دوسری طویل سچ بیانی

تم مل گئے ہو!



محمد یوسف لغاری

پرت در پرت قسمت کی تاناکیوں سے جڑی، ایک بہت خاص داستان، امریکہ عظیم سے



"دیکھو جھولا اتنے زور سے دینا ہے کہ میرے پاؤں اُس ٹہنی کو چھونے چاہئیں" تارفہ نے اپنی بہن عروشہ کو کہا۔

"اور کوئی حکم" عروشہ نے کہا۔

"اور ہمیں شاعری کا وہ انتخاب بھی سنانا ہے جو تم ابھی روشان کے کمرے سے لائی ہو۔ مگر دھیان رہے جب میں جھولے میں لہراتی ہوئی دور جاؤں تو تم خاموش ہو جانا اور جب میرے کان تمہارے پاس آئیں تو پھر دوبارہ شروع ہو جانا۔" تارفہ نے شانِ بے نیازی سے حکم چلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ملکہ عالیہ کوئی اور حکم؟"

"نہیں بس اب ہم جھولے پر بیٹھ کر پرواز کرنے لگے ہیں۔" تم جھولے کو اڑانے کی تیاری کرو۔" اس نے بھی خاص ملکہ کے اسٹائل میں جھولے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ویسے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ جوں ہی روشان صاحب کے آفس سے واپسی کا ٹائم ہوتا ہے، آپ بالکل گیٹ کے سامنے جھولے پر کیوں آجاتی ہیں۔" عروشہ نے جھولے کو پکڑتے ہوئے کہا۔

ہم اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہیں۔" اس نے جھولے پر بیٹھتے ہی آنکھیں موند کر جواب دیا۔

"اوہ اچھا اگر باقی کوئی حکم رہ گیا ہے تو وہ بھی بتا دیں۔"

"ہاں چلو انتخاب پہلے ہی سنا دو۔"

"اچھا جی لو سنو۔" عروشہ نے کہا۔

دل چاہتا ہے، جب تم آفس سے تھک کر آؤ،
پھر میں تمہارے بال سہلاؤں،
تم مجھے اپنے آفس کی، دن بھر کی روداد سناؤ،
باتوں باتوں میں پھر جاناں،
ذکر کرو اک دوشیزہ کا،
اس کی محبت کا، اس کی وفا کا،
تب میں موڈ بناؤں، آنکھوں میں آنسو بھر لاؤں،
پھر تم ہنس کر سوری بولو،
میرے کانوں میں رس گھولو،
دل چاہتا ہے
دل چاہتا ہے!!!

"آپی انتخاب ختم ہو گیا ہے اور آپ اپنے بیلٹ کس لیں نہیں تو کوئی اینٹ ساتھ رکھ لیں۔ یہ نہ ہو آپ اُڑ جائیں کیونکہ جھولا پرواز کے لیے تیار ہے۔" وہ جھولے کو کافی پیچھے لے جاتی ہوئی بولی۔ لگتا تھا وہ کسی شرارت کے لیے تیار تھی۔ مگر تارفہ کچھ نہیں بولی البتہ چہرے پر معصومیت صاف نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا وہ ابھی تک اسی نظم کے زیر اثر تھی۔ عروشہ نے جھولا کافی پیچھے لے جا کر اچانک زور کا دھکا دیا، ایک تو جھولا کافی پیچھے سے زور سے آرہا تھا اور دوسرا عروشہ کا دھکا، جب کہ تارفہ نہ جانے کسی کے خوابوں میں گم سم جھولے پر بیٹھی تھی۔ اتنی اڑان برداشت نہیں کر سکی اور گھبرا کر چیخ پڑی اور فوراً جھولے کو پکڑ کر نیچے اتر کر عروشہ کو برا بھلا کہنے لگی جب کہ عروشہ اس کی حالت پر ہنس کر کہنے لگی کہ جناب بولا بھی تھا کہ اپنے بیلٹ کس لیں۔ نہیں تو کوئی اینٹ ساتھ رکھ لیں۔ یہ نہ ہو آپ اُڑ جائیں اب چکھ لیا نہ مزا۔"

"تو بدتمیز، تم ہنس رہی ہو، میری جان نکل رہی ہے۔" اس نے جوتا اُتار کر اس کو مارا، اب شومئی قسمت کہ عروشہ بالکل گیٹ کی جانب تھی وہ تو ہٹ گئی اور وہاں سے سیدھا اندر آرہے تھے جناب اسسٹنٹ کمشنر روشان اور وہ جوتا سیدھا اس کے ماتھے پر لگا اور روشان ہائے اللہ میں مر گیا کہہ کر بیٹھ گئے۔ اب دونوں بہنوں کی شکل دیکھنے والی تھی۔

روشان نے جلدی سے رومال نکال کر ماتھے پر رکھا۔ وہاں سے خون جاری ہو چکا تھا۔ اس نے امید بھری نگاہوں سے دور کھڑی تارفہ کو دیکھا، تارفہ نے یہ دیکھ کر عروشہ کو کہا کہ جلدی سے امی کو بلاؤ۔"

"ارے نہیں خالہ پریشان ہوں گی۔ بس تم جلدی سے میرا فرسٹ ایڈ بیگ لے آؤ۔" اُس نے عروشہ کو کہا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ تارفہ اور اس کے بیچ بہت کچھ ہونے کے باوجود، بہت کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے دل میں ہے، اس کی چوٹ پر پریشانی اس کے چہرے سے صاف عیاں تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ عروشہ کی مدد سے اپنی پٹی کر چکا تھا۔

"اب جلدی سے یہ سارا سامان واپس رکھ دو تا کہ خالہ کو پتا نہ چلے۔" وہ اب درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"اچھا ویسے کیا استقبال تھا۔ وہاں آفس میں سارا دن سر جی، سر جی ہوتی ہے اور یہاں آتے ہی کیسا

شاندار استقبال۔ ویسے کیا اب میرا نام بھی اس لسٹ میں لکھا جائے گا کہ فلاں شہری نے جوتا اچھال دیا' کیوں عروشہ۔'' وہ اپنے مزاحیہ موڈ میں آ گیا تھا۔

''مشکل ہے کیونکہ آپ صدر، وزیراعظم نہیں ہیں، ویسے ایک اور لسٹ میں آ سکتے ہیں۔'' عروشہ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟؟؟''

''وہ یہ کہ شادی سے پہلے ایک لڑکی نے اپنے...... اس سے پہلے عروشہ کی بات مکمل ہوتی۔''

''عروشہ کی بچی۔'' تارفہ کی غصیلی آواز سنائی دی ٹھہر میں تجھ سے پوچھتی ہوں۔ اور اس نے دوسرا جوتا اتارتے ہوئے کہا، یہ دیکھ کر عروشہ اندر کی جانب کی بھاگی اور تارفہ اس کے پیچھے لپکی۔ اور روشان ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

مگر تارفہ ایک لمحے کے لیے رک گئی۔

''روشان صاحب وہ جوتے کے لیے سوری ہمیں پتا نہیں تھا کہ آپ اندر آ رہے ہیں۔ ہم نے عروشہ کو مارا تھا اور وہ آپ کو لگ گیا۔''

''اٹس اوکے کوئی مسئلہ نہیں۔ ابھی تو وہ اتنا زور کا لگا ہے تو کوئی بات نہیں یہ شکر ہے وہ خالی تھا ورنہ اگر اس کے اندر انسانی وجود خود موجود ہوتا تو میرا کیا حال ہوتا۔'' روشان نے اپنی عادت کے مطابق کے مسکراتے ہوئے کہا۔

مگر یہ بھی تارفہ تھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس اتنا کہا کہ کھانا پکا ہوا ہے میں آپ کے کمرے میں بھجوا رہی ہوں۔'' اور کمرے میں چلی گئی۔

'تارفہ کب تمہاری زبان کا تالا کھلے گا۔ اتنا تو ہم خوب جانتے ہیں کہ تمہاری دل کی دھڑکن میں ہم بستے ہیں مگر بدقسمتی سے آپ بھی میری طرح شرمیلی ہو اور شاید ضدی بھی کہ اقرار روشان کی طرف سے ہو، اور ہم بھی یہ بات سوچتے ہیں کہ اقرار تارفہ صاحبہ کی طرف سے ہو۔ اب بات ضد کی ہے اچھا دیکھتے ہیں کہ کتنا صبر ہے اور ویسے بھی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے مگر یہاں تو کڑواہٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ روشان صاحب۔'' وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

شام کو روشان کی ڈی سی او صاحب کے ساتھ فلڈ پلان پر میٹنگ تھی، اگر وہ کھانا کھاتا تو تھری پیس استری نہ کر سکتا تھا اس لیے اس نے تھری پیس استری کر لیا اور کھانا چھوڑ دیا، اب آئے روز کی میٹنگز کی وجہ سے بہت پریشان ہوتا، اب اس کو زندگی کے کسی جیون ساتھی کی ضرورت تھی۔ تارفہ کے سوا وہ کسی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خود اس کے ماں باپ بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے تو تارفہ کی امی مطلب اس کی خالہ زہرہ نے اس کو پالا پوسا تھا اور خالہ زہرہ کے شوہر انکل زیدی بھی فرشتہ صفت انسان تھے۔ انہوں کبھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا جب کہ روشان نے خود بھی کبھی ان کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

اب جب کہ اس کو کسی سہارے ضرورت تھی تو وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کس سے بات کرے اگر خالہ سے بات کرتا ہے تو خالہ ناراض ہی نہ ہو جائیں، تو اس کے ذہن میں آیا کیوں نہ عروشہ سے بات کی جائے تا کہ وہ خالہ زہرہ سے بات کرے، اس بات پر وہ مطمئن ہو گیا۔

☆......☆......☆

تارفہ اور عروشہ دو بہنیں مگر گہری دوست زیادہ تھیں دکھ سکھ، خوشی غمی ایک دوسرے کے ساتھ بانٹنا اور ان کو کسی اور سہیلی کی ضرورت نہ تھی۔ خالہ اور انکل زیدی کی جان تھی، تارفہ بہت شرمیلی تھی۔ مجھ سے بلکہ خاندان کے کسی بھی لڑکے سے تنہائی میں یا سب کے سامنے بات چیت سے گھبراتی تھی اور اور اپنا راز کسی کے ساتھ نہیں بانٹتی تھی۔ عید پر اپنی شاپنگ بھی نہیں کرتی تھی' اس کے لیے جو آ جاتا تھا وہ پہن لیتی تھی۔ عیدی جو مل گئی وہ چپ کر کے لے لیتی تھی مگر اس کے برعکس وہ گھر کے کاموں میں طاق تھی اور خالہ زہرہ کی خوب مدد کرواتی تھی اور اس لیے اپنی چھوٹی بہن کی نسبت اپنے امی ابو کی آنکھوں کا تارا تھی مگر ایک خامی تھی کہ کانوں کی کچی تھی۔ کسی نے اُس بتا دیا کہ فلاں تمہارے بارے میں یہ بولا ہے' تو وہ بنا تصدیق کیے اس سے بول چال بند کر دیتی تھی۔ جب کہ عروشہ اس کے برعکس تھی۔ وہ اتنی شرمیلی تھی نہ بہت چالاک۔ سب سے بات چیت کرتی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ حد سے تجاوز کر جاتی۔ اس میں یہ خامی تھی وہ مذاق مذاق میں دوسروں

کی لڑائی کروا کر انجوئے کرتی۔ اس کی گندی عادت سے سب خائف تھے مگر وہ باز نہیں آتی تھی اور تارفہ کی نسبت شرمیلی نہیں تھی اور بہت ضدی تھی اور دل میں ٹھن جائے کہ میں نے یہ چیز حاصل کرنی ہے تو بس اس کو حاصل کر کے ہی رہتی تھی، خود میرا بھی یہی حال تھا میں بھی شرمیلا تھا اور بے پناہ ضدی تھا۔ تارفہ اور عروشہ کے سوا کسی اور لڑکی سے بات کرنے پر میری جان نکلتی تھی۔ میں اپنے کردار کو مضبوط رکھنا چاہتا تھا تو بس میرا گھرانا بھی یہی تھا خالہ اور انکل زیدی نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور میں ضلعی انتظامیہ آفس میں اسسٹنٹ کمشنر تھا۔

میرے دل میں تارفہ کے لیے کب محبت پیدا ہوئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ پھر یہ کب محبت سے طوفانی محبت میں بدلی اس کا بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا، اور اس بات کا مجھے بھی اندازہ تھا کہ تارفہ کے دل میں میرے لیے ضرور پیار بھرے جذبات ہیں مگر ہمارا اصل مسئلہ وہی میرا شرم وحیا اور شرمیلے پن کا تھا کہ اظہار کون کرے اور وہ اپنے راز کسی سے بانٹتی بھی نہیں تھی۔

جبکہ میں اتنے سالوں کی محبت کو میں اپنے ہونٹوں پر لا کر جوں ہی میں تارفہ کے سامنے آتا میرا سارا طوفانی پیار ہوا کی طرح اُڑ جاتا۔ ایک دفعہ میں نے ہمت کر کے اُس کو کہنے کی کوشش کی تو ابھی میں اپنے سارے الفاظ زبان پر لایا ہی تھا کہ میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ زبان تالو سے چپک گئی اور تارفہ میری شکل دیکھنے لگی اور وہ میرے سامنے پہلی دفعہ ہنسی اور بھاگ کر چلی گئی۔ پھر میں نے اندازہ لگایا یوں ''اظہارِ محبت'' ہمارا کام نہیں ہے اور سوچا کہ کیوں نہ کسی کی مدد لی جائے۔ پھر جس شام کو میری ڈی سی او صاحب کے ساتھ فلڈ پلان پر میٹنگ تھی، اگر میں کھانا کھاتا تو تھری پیس استری نہ کر سکتا تھا اس لیے تھری پیس استری کر لیا اور کھانا چھوڑ دیا، اب آئے روز کی میٹنگز کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوتا، اب مجھے زندگی کے کسی جیون ساتھی کی ضرورت تھی تارفہ کے سوا میں کسی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا تو میں کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کس سے بات کروں اگر خالہ سے بات کرتا ہوں تو خالہ ناراض ہی نہ ہو جائیں، تو میرے ذہن میں آیا کہ عروشہ سے بات کی جائے تاکہ وہ آگے اپنی امی سے بات کرے، اس بات پر میں مطمئن ہو گیا تھا۔

میٹنگ میں یورپی ٹیم نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ ہمیں اپنا اسٹاف دیں، ہم ان کو ساتھ امریکہ لے جائیں گے اور ان کی فلڈ پلان پر ٹریننگ کروائی جائے گی جس پر مجھ سمیت پانچ بندوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اب ہمیں جلد ہی چھ ماہ یا ایک سال کے لیے امریکہ جانا تھا۔

میں شام کو لوٹا تو دل بہت اداس تھا میں تو تارفہ کے بنا ایک دن نہیں گزار سکتا تھا یہاں تو سات سمندر کی دوری والی بات تھی تو میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں ناکہ عروشہ سے بات کر کے اس کو ساری حالت بتا دوں تاکہ وہ خالہ زہرہ سے بات کر لے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور تارفہ کا ہاتھ مانگ کر نہ لے جائیں۔

☆☆☆

شام کو میں نے عروشہ کو بلایا اور دنیا کی ساری ہمت اپنے اندر اکٹھی کی۔ مگر پھر بھی بولا نہیں گیا، آخر کار عروشہ تنگ ہو گئی تو اس نے پوچھا کہ روشان کوئی کام ہے تو بتاؤ۔''

''ہاں۔'' میں توانائی اکٹھے کرتے ہوئے بولا۔ ''بات یہ ہے کہ میں آج تم سے زندگی کی اہم ترین بات کرنا چاہتا ہوں تو وہ بات یہ ہے کہ میں، وہ......'' میں پھر ہمت کھونے لگا تھا۔

''اف روشان کیا میں، میں لگا رکھی ہے اتنا شرمانے والی کیا بات ہے جو بولنا ہے وہ بولو۔ میں آپ کے دل کی حالت سمجھ سکتی ہوں۔ عروشہ نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں عروشہ بس بات یہ کہ مجھے تم پلیز کسی سے کچھ کہنا مت پتا نہیں میرے دل میں کب محبت پیدا ہوئی۔۔۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔۔۔۔ پھر یہ کب محبت سے طوفانی محبت میں بدلی۔ اس کا بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا، مجھے اظہار محبت کرنا نہیں آتا میں کئی دفعہ کوشش کی ہے مگر ناکام ہوا ہوں۔ اب بہت ڈسٹرب ہوتا ہوں۔ مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت ہے اب ہر روز خالہ کو تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اتنے بجے تازہ گرم کھانا چاہیے یا میں اتنے بجے گھر آؤں گا تو آپ اتنے بجے گیٹ کھولنا، پھر میری چیزیں ادھر اُدھر ہو جاتی ہیں چلو کوئی بندہ ان کی حفاظت کرنے والا ہو گا۔ مجھے کپڑے وغیرہ وقت پر مل جائیں گے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تم خالہ تک اور تارفہ

سے تک میرا یہ پیغام دو میں تارفہ سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔'' میں نے آخری الفاظ بہت مشکل سے حلق سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا تم نے، تم تارفہ کی بات کر رہے ہو۔'' عروشہ نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''کیا وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے۔'' اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

''اس نے کبھی کہا تو نہیں پر اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے کچھ نظر ضرور آتا ہے۔ ویسے بھی وہ شرمیلی ہے نا۔'' میں نے کہا۔

''آنکھوں سے جھلکتا پیار، روشان صاحب فلموں کے ڈائیلاگ مت بولو حقیقی دنیا میں آؤ۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں، مگر فلمیں جھوٹی مگر ڈائیلاگ سچے ہوتے ہیں۔ اچھا ویسے اس نے تم سے میرے بارے کبھی کچھ کہا ہو۔'' میں نے اس پوچھا۔

''روشان صاحب میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ حقیقی دنیا میں آئیں کسی کی آنکھوں میں کچھ نظر آنے سے پیار نہیں ہو جاتا۔ لازمی نہیں آپی کو آپ سے پیار ہو، اور ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی عزت کرتی ہو، کیونکہ اس نے کبھی مجھ سے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کی اور مجھے نہیں لگتا جو آپ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو اور تارفہ آپ سے پیار کرتی ہو۔'' اس نے کافی تلخی سے کہا۔

''کیا کہہ رہی تم۔'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔

''اچھا خیر چھوڑیں۔ اب مجھے کیا کرنا ہے۔'' عروشہ نے کہا۔

''ہاں تم میرا پیغام تارفہ اور امی تک پہنچا دو کیونکہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کئی دفعہ کہنے کی کوشش کی ہے مگر ہمت نہیں ہوئی اور لگتا ہے کہ میں زندگی بھر نہیں کہہ سکوں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں مگر روشان صاحب میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ انسان کو اگر دو راستے نظر آ رہے ہوں تو لازمی نہیں کہ انسان کو صرف ایک ہی راستہ دیکھنا چاہیے بلکہ دوسرے راستے پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ راستہ آسان ہو، بہر حال میں آپ کے لیے ضرور کوشش کروں گی۔'' عروشہ یہ کہہ کر چلی گئی مگر مجھے اس بات کی بالکل سمجھ نہ آسکی۔

☆......☆......☆

یونی ٹیم نے جب سے ہم کو سلیکٹ کیا تھا اس کے فوراً بعد ہماری امریکہ جانے کی تیاری شروع ہو چکی تھی جو کہ میرے لیے سوہان روح تھا مگر یہ سب برداشت کرنا تھا۔ ویزا، پاسپورٹ کو کچھ ابھی کچھ دن باقی تھے اس کے لیے سرکاری سطح پر کوشش جاری تھی اور جلد ہی یہ کام نمٹ جانا تھا۔ اس پہلے ہی مجھے عروشہ کی طرف سے جواب چاہیے تھا۔

پھر ایک دن میں صبح سو کر اٹھا تو میں حیران رہ گیا کہ میرے جوتے اور کپڑے سلیقے سے ہینگر پر لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آسکی کی یہ کس کا کارنامہ ہے تاہم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میرا ٹائم بچ گیا اور پھر اس طرح ہر روز ہونے لگا۔ میری ہر چیز مجھے ٹائم پر تیار ہو کر ملنے لگی مگر یہ بات معمہ رہی کہ یہ کون کر رہا ہے۔

پھر آخر وہ دن بھی آ گیا جس دن مجھے امریکہ روانہ ہونا تھا۔ اس دن میں سویا ہوا تھا کہ اچانک میرے کمرے میں کوئی چیز گرنے کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا تو عروشہ میری شرٹ ہینگر پر لٹکا رہی تھی اور میری نیند بیدار ہونے پر کہنے لگی کہ سوری روشان میں شرٹ رکھ رہی تھی تو یہ گلدستہ گر گیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اس کو اپنے کمرے پا کر الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

تو یہ سب کئی دنوں سے عروشہ کر رہی تھی۔ میں نے سوچا۔

''اچھا سنو!'' میں نے اس کو پکارا۔

''جی۔'' وہ جاتے ہوئے پلٹی۔

''وہ تم نے تارفہ سے بات کی تھی؟'' میں نے کہا۔

میری چھوڑو آپ نے خود بات کی۔'' عروشہ نے کہا۔

''اف تم کیسی بات رہی ہو تم کو پتا بھی ہے میں اس معاملے میں کورا ہوں اور میری زبان نہیں کھلتی۔ اس لیے میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔''

''ہاں میں نے اس سے بات کی تھی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ وہ پتھر کا مجسمہ ہے۔ روشان صاحب اس کے دل میں آپ کے لیے شاید کوئی فیلنگز نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے وہ پتھر کا مجسمہ ہو گی مگر دنیا میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو پتھر کے مجسموں کو پوجتے ہیں اور ان

کی مورتیاں گھروں میں رکھتے ہیں اور ان سے پیار کرتے ہیں مگر ہمارا معاملہ تو ایک زندہ مجسمے کے ساتھ ہے۔ جس کو پوجتے نہیں ہیں مگر پیار کرتے ہیں بس چنگاری تو ہے مگر آگ لگانی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے روشان صاحب مگر شاید اس چنگاری کو آگ لگاتے لگاتے آپ کی عمر ہی ضائع نہ ہو جائے۔'' عروشہ تلخی سے کہتی ہوئی باہر چلی گئی یہ تلخی اور غصے میں۔ کیوں گئی ہے میں نے سوچا۔

وہ دن میرے لیے سوہان روح تھا جس دن ہمیں امریکہ روانہ ہونا تھا۔ ائیر پورٹ پر ہمیں سب رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ انکل اور آنٹی تو بس رو رہے تھے عروشہ کی حالت بہت خراب تھی اور تارفہ نہ رو رہی تھی نہ آنسو بہا رہی تھی، بس اس کی حالت ایسی تھی جیسے اس کا جسم کانپ رہا ہو اور اس کے جسم سے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔

تجھے اظہارِ محبت سے اگر نفرت ہے
تو نے ہونٹوں کو لرزنے سے تو روکا ہوتا
بے نیازی سے مگر کانپتی آواز کے ساتھ
تو نے گھبرا کے مرا نام نہ پوچھا ہوتا

☆☆☆

نہ جانے لوگ پردیس میں کیسے رہتے ہیں۔ میں تو دو دن میں ہی پورا ہو گیا تھا۔ میرا جسم تو امریکہ میں تھا مگر دل پاکستان میں تھا۔

ہماری ٹریننگ شروع ہو چکی تھی یہ ٹریننگ لوگوں کو سیلاب کی صورت میں ڈوبنے سے بچاؤ، وغیرہ سے متعلق ہوتی تھی۔ جو کہ خاصی تھکا دینے والی ہوتی تھی پانی کی بہتی لہروں کو دیکھ کر مجھے تارفہ یاد آجاتی تھی اور میں جھنجھلا جاتا تھا، جس کی وجہ سے میں اکثر خیالوں میں رہنے لگا تھا پھر ان خیالات کی وجہ سے مجھے اکثر ڈانٹ بھی پڑنے لگی۔ ایک دن حد ہی ہو گئی۔ جب مجھے دو بار مخاطب کیا گیا مگر میں تو خیالوں میں پاکستان کھویا ہوا تھا۔ بس اس دن مجھے بہت غصہ آیا کہ یہ محبت کیا ہے۔ یہ دوری کیا ہے، کسی کو کھو دینے، کا نام کسی کو پالینے نام، یہ اذیت میں کب تک برداشت کروں گا۔ آخر میری آنکھیں کسی کی منتظر کب تک رہیں گی۔ کب تک کہتے ہیں نا کہ جس نے محبت نہیں کی اس نے اذیت محسوس نہیں کی۔ محبت تو صبر کا نام ہے محبت لازمی مضمون ہے۔ جس نے اس کو اختیاری کے طور پر لیا وہ محبت کی لطافت کو چھو لینے سے بھی محروم ہو گیا پھر میں نے اس دن عروشہ کو غصے میں کال کی اور تارفہ کی خیریت پوچھی اور دھیرے سے اپنا مقصد پوچھا اور اس واضح کہا کہ آج تم مجھے ہر حال میں جواب دو کہ تارفہ کیا کہتی ہے۔''

''روشان صاحب میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ان کے دل میں ایسا ویسا کچھ نہیں۔ یہ سب آپ کی غلط فہمی ہے۔ دنیا بہت وسیع ہے کسی اور جگہ نظریں گھمائیں۔ ہوسکتا ہے کوئی اور آپ کا منتظر ہو۔''

''عروشہ پلیز یہ دل ہے کوئی کمپیوٹر کا ری سائیکل بن یا کوئی کچرا بن نہیں جس میں کسی کے لیے ہر روز نئی جگہ بن جائے یا جب فل ہو جائے تو ڈیلیٹ کر کے کسی اور Item کو گھسا لیا۔ اس میں صرف بس اُس کی ہی گنجائش ہے۔

''اچھا!!! تو پھر تارفہ تارفہ کا الاگ الاپتے رہیے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں عروشہ تم کو ہنسا آرہا ہے نا کوئی بات نہیں تم ابھی محبت کے اس لطیف جذبے سے دور ہو تو نا اس لیے اس اذیت سے دور ہو اور دعا کرتا ہوں کہ تم اس اذیت سے دور ہی رہو۔ اب بس میری یہ آخری کال ہے اور ......'' اس پہلے میں اپنی بات مکمل بات کرتا عروشہ نے فوراً میری بات کاٹ دی اور کہنے لگی۔

''کیا میں اس لطیف جذبے سے دور' کیا میں اذیت سے دور ہوں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ تمہیں اس سے محبت کرنی چاہیے جو تم سے محبت کرتا ہو مگر روشان تم کتنے بھولے اور سادہ ہو۔ محبت کی زبان صرف آئی لو یو نہیں ہوتی۔ یہ آپ کو دوسرے بندے کی آنکھوں اور......''

''بالکل عروشہ میں بھی یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے عروشہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تارفہ نے گو اپنی زبان سے اظہار نہیں کیا کہ اس مجھے تو ایسا لگتا ہے مگر اب شاید ہمارا عشق، عشقِ ناتمام بن چکا ہے اور یہ میری آخری کال ہے۔ آج کے بعد میں کوئی کال نہیں کروں گا۔ اپنا یہ نمبر ہمیشہ کے لیے بند کر رہا ہوں اور پھر کبھی پاکستان لوٹ کر نہیں آؤں گا میں تارفہ کے سائے سے بھی دور چلا جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں انکل اور آنٹی کی خدمت نہ کرسکا۔'' میں روتے ہوئے کہا۔

’’نہیں روشان پلیز ایسا مت کرنا پلیز روشان میری بات توسنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔‘‘ عروشہ یکدم میرے اس فیصلے پر گھبرا کر دوسری طرف سے زور، زور سے کہنے لگی۔

مگر میں نے کال کاٹ دی اور پھر سم کے تمام نمبر موبائل میں سیو کیے اور سم کو توڑ کر پھینک دیا اور دوسری نئی سم لے لی اس فلڈ ٹریننگ جاب سے دل اچاٹ ہو چکا تھا اس جاب سے جان چھڑانی تھی مگر یہ تھوڑے مشکل مراحل تھے۔

اگلے دن میں نے اپنے پاکستان میں اپنے چند اعلیٰ افسر دوستوں کو فون کیا اور ان کے توسط سے یہاں سے جان چھڑائی اور یہاں سب کو بتایا کہ میں پاکستان واپس جا رہا ہوں مگر یو کے کی ایک کمپنی کے ساتھ میری بات ہو چکی تھی۔ یہ ایک بحری جہاز کی کمپنی تھی۔ وہاں مجھے جنرل منیجر کے اچھے عہدے کے پُرکشش تنخواہ کے لیے رکھ لیا گیا تھا۔

اور یہاں میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اپنا سب ماضی بھلا کر۔ ایک سال، دو سال، حتیٰ کہ پانچ سال گزر گئے۔ کسی نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا‘ تو اس کا مطلب یہ تھا کسی کو مجھ تک آنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا تھا، میں اپنی زندگی میں مصروف ہو چکا تھا بس کبھی کبھی دل کے کسی کونے کھدرے سے آواز آتی کے تارفہ کیسی ہو گی، عروشہ کدھر ہو گی، دونوں کی شادیاں ہو چکی ہوں گی۔ بچے کتنے ہوں گے۔ بس یہ یادیں تھی تو میں مسکرا دیتا تھا۔

عہد فرصت میں کسی یار گزشتہ کا خیال
جب بھی آتا ہے تو جیسے رگ جاں کھینچتا ہے

☆☆☆

ایک دفعہ جب میں اپنے کام میں مصروف تھا تو میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے دیکھا تو حیران رہ گیا پاکستان کا نمبر تھا۔ ریسیو کر کے کانوں سے لگایا تو دوسری طرف سے خالہ زہرہ کی آواز تھی۔

’’اسلام علیکم روشان‘‘

’’جی...... وعلیکم السلام میں ڈرتے ہوتے جواب دیا۔

’’بیٹا اور کتنا دور بھاگو گے، ماں سے بیٹا دور نہیں بھاگ سکتا۔‘‘ خالہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

’’نہیں وہ بس خالہ۔ میرے منہ سے مارے شرمندگی کے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔

’’اچھا تم دو دن تک پاکستان پہنچ جاؤ۔‘‘

’’کیوں خالہ خیریت تو ہے۔‘‘

’’ہاں خیریت ہی ہے وہ تارفہ کی شادی ہے اور کام کو بوجھ ہو گا‘ اس لیے تم جلدی سے آجاؤ۔‘‘

یہ بات سنتے ہی مجھ پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

’’جی مگر خالہ ادھر کافی کام ہیں میں نے کہا۔‘‘

’’روشان تم نے آنا ہے یہ ہمارا حکم ہے۔‘‘ خالہ نے اپنا پرانا حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

’’مگر وہ خالہ!!!‘‘

اس سے پہلے کوئی اور بات ہوتی رابطہ کٹ گیا۔

یہ قسمت میرے ساتھ کیا کھیل، کھیل رہی تھی۔ کیا تارفہ کی شادی اب ہو رہی تھی۔ میں کیسے جاؤں اس کے سامنے وہ میرے سامنے کسی دوسرے کی دلہن بن جائے گی میری آنکھیں بہہ اٹھیں۔ مگر دوسری طرف حکم تھا اور جس کی بجا آوری لازمی تھی۔

☆☆☆

آج میں پانچ سال کی طویل مدت کے بعد پاکستان واپس آیا تھا۔ پانچ سال اپنوں سے دور رہنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

سب لوگوں نے بڑی خوشی سے میرا استقبال کیا۔ کسی نے ماضی کو کریدا کہ اتنا عرصہ کہاں تھے۔ بڑی مشکل سے سب کو جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر مطمئن کیا۔

میں تارفہ سے نہیں ملا تھا نہ ملنا چاہتا تھا اور نہ ہی مجھے عروشہ نظر آئی تھی۔ دوسرے دن نکاح تھا اور گویا مجھ پر پہاڑ گرنے والا تھا، نکاح کے دن جب مجھے انکل زیدی نے کہا کہ جاو بیٹا تارفہ سے نکاح فارم پر سائن کروا کر لے آؤ۔‘‘

جی ہاں کیوں کہ اس کا نکاح کسی اور کے ساتھ ہو رہا تھا تو مجھے ایسے لگا جیسے میں مر جاؤں گا۔ میں جیسے تیسے اس کے کمرے میں گیا کیونکہ اُسے تو میری دلہن بن کر آنا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس نے دستخط کر دیے۔ میں رجسٹر لے کر کھڑا ہوا تو آخر اس کا ضبط جواب دے گیا تارفہ رونے لگی وہ سسکیاں بھرنے لگی جو کچھ اس نے مجھ سے کہا وہ میرے لیے

ناقابل برداشت تھا وہ مجھ سے کہنے لگی،
''روشان تم ایسا کیوں کیا؟؟؟''
میں حیران رہ گیا۔ میری سماعتیں حیران تھیں کہ ایک مجسمہ بولا تھا۔
''میں نے کیا کر دیا ہے۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
''تم نے ہمیں پیار کا جھانسا دیا دھوکہ دیا' فریب دیا۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔
''کیا کہہ رہی ہو تم، میں نے تم کو دھوکہ دیا۔ میں نے تم سے کئی دفعہ بات کرنے کی کوشش کی مگر حوصلہ نہیں ہوا جو کہ تم خود جانتی ہو۔ پھر میں نے عروشہ کا سہارا لیا۔ اور عروشہ نے تم کو کہا تو تم نے صاف انکار کر دیا کہ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جذبات نہیں ہیں۔ اس لیے میں نے جبر کیا اور ہمیشہ کے لیے تم سے دور چلا گیا۔''
''بس کرو روشان جھوٹ مت بولو اور کتنا جھوٹ بولو گے۔ تم عروشہ سے پیار کرتے تھے۔ اس سے میرے بہانے گھنٹوں بات کرتے تھے۔ اس سے بات کرتے وقت تو تم کو پسینہ نہیں آتا تھا۔ تم تو محبت کے فلاسفی بنتے تھے اور شاعری پر بنی ڈائریاں لکھتے تھے۔ روشان تم کو صرف مجھ سے بات کرتے وقت ڈر لگتا تھا۔ یہ سب تم دونوں کی چال تھی اور وہ تم سے پیار کرتی تھی۔''
''تارفہ پلیز خدا کا واسطہ عروشہ اور ہمارے بیچ ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں اس کا احترام کرتا ہوں۔''
''روشان وہ مجھے تمہاری ہر کال دکھاتی تھی کہ آج ہم نے اس موضوع پر بات کی۔ فلاں موضوع پر بات کی اور اور حتیٰ کہ اس نے تمہارے ساتھ کی گئی دو، دو گھنٹے کی کال سمری بھی دکھائی تھی اور تم اس سے شادی کرنے والے تھے۔ تارفہ بدستور سسکیاں بھر رہی تھی۔
''اوہ میرے خدا! تارفہ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میری اس سے کبھی دس منٹ سے بھی زیادہ بات نہیں ہوئی۔ اچھا میں ابھی عروشہ کو بلا کر لاتا ہوں اس کے منہ پر سب حقیقت پوچھ لو۔'' میں نے شدید غصے میں کہا۔
''روشان صاحب! مردے گواہی دینے نہیں آتے۔''
''کک...... کیا مطلب۔''
جب آپ نے آخری دفعہ کال کی تھی تو آپ نے کہا تھا کہ میں ادھر امریکہ میں ہی کسی اور لڑکی سے شادی کر رہا ہوں اور وہ بے چاری تم سے یہ کہتی رہ گئی کہ روشان پلیز ایسا مت کرنا۔ پلیز روشان میری بات تو سنو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ مگر تم تے اس کی کال کاٹ دی اور اس صدمے سے اس کو ہارٹ اٹیک ہوا کیونکہ وہ تم سے بہت پیار کرتی تھی اور وہ بچ تو گئی اور ایک سال تک تمہارا نمبر ٹرائی کرتی رہی اور پھر تمہاری جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور اُس نے ایک دن خودکشی کر لی۔''
''کیا عروشہ نے خودکشی کر لی۔ اوہ مائی گاڈ۔'' یہ میرے لیے نیا صدمہ تھا۔
اچانک دروازہ بج اٹھا باہر تارفہ کی خالہ تھی۔
''بیٹا جلدی آؤ۔''
''جی بس آیا۔'' میں نے کہا جس پر وہ چلی گئی۔
لیکن تارفہ یہ پانچ سال پرانی بات ہے اور شاید میں نے آخری کال پر میں نے اس کو ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے جب بھی اس کو کال کی تمہارے حوالے سے کی تھی اور اس دن بھی میں نے تمہارا ہی کہا تھا کہ میں اپنا یہ نمبر ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا۔ میں تمہارے سائے سے بھی دور چلا جاؤں گا اور پھر کبھی پاکستان لوٹ کر نہیں آؤں گا اور کسی دوسری لڑکی کی بات بھی نہیں ہوئی تھی اور......''
اس سے پہلے کوئی اور بات ہوتی تارفہ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور روتے ہوئے کہا پلیز یہاں سے چلے جاؤ اور تم نے جو ہم کو دھوکہ دینا تھا وہ دے دیا اور ہمارے منہ سے تم اقرار سننا چاہتے تھے نا تو سنو روشان! تمہاری رگوں میں خون بن کر دوڑتے تھے مگر اب ہم کوشش کریں گے یہ سب بھلا کر ایک نئی زندگی کی ابتدا کر سکیں اور پلیز اب چلے جاؤ۔'' اس کے بعد تارفہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میرے پاس صفائی میں کچھ نہ تھا۔
میں کل بھی خالی دامن تھا اور آج بھی خالی دامن تھا۔
میں نے بڑی مشکل سے رجسٹر ان لوگوں کے حوالے کیا اور شادی والے گھر سے باہر نکل آیا اور میں نے کسی کو بتائے بنا اپنا سامان اٹھایا اور چپ چاپ پاکستان سے نکل آیا اور واپس اس دن اسپیشل ٹکٹ بک کروا کر یو کے لوٹ آیا۔
میرے ساتھ جو ہوا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا

ہوا ہے۔ عروشہ کے ساتھ کیا ہوا تھا تارفہ نے کہا تھا کہ عروشہ تم سے بہت پیار کرتی تھی، مگر عروشہ نے تو مجھے کبھی نہیں کہا تھا۔

اچانک اس کی باتیں مجھے یاد آنے لگیں جب میں نے پہلی دفعہ عروشہ کو کہا تھا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم خالہ تک اور تارفہ تک میرا یہ پیغام دو کہ میں تارفہ سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔ تو عروشہ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیا کہا تم نے۔ تم تارفہ کی بات کر رہے ہو۔'' عروشہ نے حیرانی سے کہا تھا۔''

''کیا وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے۔'' اُس نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔

وہ حیران کیوں ہوئی تھی؟؟؟؟

''روشان صاحب میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ انسان کو اگر دو راستے نظر آ رہے ہوں تو لازمی نہیں کہ انسان کو صرف ایک ہی راستہ دیکھنا چاہیے بلکہ دوسرے راستے پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ راستہ آسان ہو۔''

وہ آسان راستہ کیا تھا؟؟؟؟

''سوری روشان میں شرٹ رکھ رہی تھی تو یہ گلدستہ گر گیا!!!!''

''دنیا بہت وسیع ہے۔ کس اور جگہ نظریں گھمائیں ہو سکتا ہے کوئی اور آپ کا منتظر ہو!!!''

میرا منتظر کون تھا، عروشہ؟؟

اور آخری دفعہ اس سے میری کیا بات ہوئی تھی۔

میں سوچنا نہیں چاہتا۔ میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔

کیا میں اس لطیف جذبے سے دور رہوں۔ کیا میں اذیت سے دور ہوں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ تمہیں اس سے محبت کرنی چاہیے جو تم سے محبت کرتا ہو مگر روشان تم کتنے بھولے اور سادہ ہو۔ محبت کی زبان صرف آئی لو یو نہیں ہوتی یہ آپ کو دوسرے بندے کی آنکھوں اور۔''

مگر اِس کے آگے میں نے اُس کی کال سنی ہی نہیں تھی میں تو سمجھ رہا تھا۔ جو تارفہ کہہ رہی ہے اس نے سچ کہا تھا کہ روشان تم کتنے بھولے اور سادہ ہو، میں بھولا اور سادہ نہیں تھا۔ میں بے وقوف تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے۔ روشان پلیز ایسا مت کرنا پلیز روشان میری بات تو سنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ مگر پھر اس شاید میرے خلاف تارفہ کو بھڑکایا ہوگا اور تارفہ کانوں کی کچی تھی۔ اس نے یہ سب سچ سمجھ لیا ہوگا۔ آہ سب اس عشق کی کچی فصلوں میں پھنس گئے۔

''عروشہ تم نے یہ سب کیا کر دیا۔'' میں چیخ اُٹھا۔

''تارفہ، عروشہ۔'' میں چلانے لگا۔ تھوڑی بعد میں دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ آخری احساس جو مجھے تھا وہ یہ تھا کہ میرا اسٹاف بھاگ کر میری جانب آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

ہلکے سے درد کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ اعصاب پر نشہ سوار تھا۔ میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو یہ اسپتال کا کمرہ تھا۔

''میں کہاں ہوں۔'' میں نے تصدیق کرنی چاہی۔''

اسپتال میں ہو اور تم بے ہوش ہو گئے تھے۔'' میرے انچارج شمس بخاری نے جواب دیا۔ یہ بھی پاکستان کے ہی تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے چند انجکشن لگائے گئے پھر مجھے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہم واپس آ گئے۔

''روشان ایک بات تو بتاؤ۔''

''جی سر۔''

''یہ عروشہ اور تارفہ کون ہیں؟؟''

''سر۔۔ وہ۔۔ پتا نہیں۔'' میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''جب تم گرے تھے تو تم نے یہی دو نام لیے تھے۔ دیکھو بتانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔''

پھر میں نے مختصر سی داستان اُن کو سنا دی۔

''اچھا روشان اب میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔'' شمس بخاری صاحب نے میری کہانی سننے کے بعد کہا۔

''آج سے کئی سال پہلے کسی ملک کا ایک گاؤں تھا۔ اس میں ایک طاقت ور، وڈیرا اور جاگیردار خاندان رہتا تھا، پورے گاؤں کی لگام باگ دوڑ اس کے ہاتھ میں تھی پھر اس گاؤں میں چند غریب خاندان بھی رہتے تھے اُن غریب خاندان کے لڑکے کو اُس طاقت ور، وڈیرے اور جاگیردار خاندان کی ایک لڑکی سے پیار ہو گیا، یہ پیار دیوانگی، چاہت کی آخری حدوں

کو چھونے لگا مگر ملن کی صورت نظر نہ آئی تو وہ لڑکی ضد کرنے لگی کہ وہ اس کو بھگا کر لے جائے مگر اس لڑکے نے ایسی گندی حرکت نہیں کی۔ اپنی محبت کو ہوس پر حاوی نہیں آنے دیا اور کسی کی پگڑی کو زمین پر نہیں گرنے دیا اور اُس لڑکے نے اس کو سمجھایا کہ مناسب وقت کا انتظار کرو۔ پھر اُس لڑکے کا بڑا بھائی اور بہنوئی کسی طرح بیرون ملک جانے میں کام یاب ہو گئے اور اور اچھی طرح سیٹل ہو گئے۔ پھر ایک دن طاقت ور خاندان نے معمولی سے جھگڑے پر ناحق اس لڑکے کے باپ کو مروا دیا تو وہ لڑکی مزید گھبرا گئی اور اس کو وہاں سے بھاگ جانے کا کہنے لگی۔ انتقام تو لڑکے کے دل میں بھی تھا مگر اس نے صبر کیا۔ پھر ایک دن اس لڑکے کی ماں کو اس کے پیار کا پتا چل گیا تو اس کو سخت صدمہ ہوا کہ جس نے اس کے باپ کو قتل کیا وہ وہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کئی دن اس سے ناراض رہی پھر ایک رات اس کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ لڑکا اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا ماں نے اس سے کہا میری خواہش ہے کہ تم میری بھانجی سے شادی کر لو اس نے وعدہ کر لیا۔"

شمس سانس لینے کے لیے رکا۔

میں نے اس کو مسکرا کر دیکھا، یہ کہانی مجھے بہت دل چسپ لگ رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا سر۔" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہوا کیا آج وہ لڑکا شمس بخاری تمہاری سامنے ہے۔"

"کیا وہ آپ تھے سر۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا، مگر آگے کیا ہوا تھا؟

"ہاں وہ میں ہی تھا میں نے امی کی بھانجی ماریہ سے نکاح کیا اور چپ چاپ ادھر یو کے آ گیا۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔

"اور وہ لڑکی۔" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

یار تم سنو تو سہی وہی تو بتا رہا ہوں۔ یہ محبت والے اتنے جذباتی کیوں ہوتے ہیں، اس لڑکی کا نام مہرین تھا۔ ماریہ سے شادی کر کے میں بہت اداس رہا مگر اس نے آتے ہی سب کے دل جیتنے شروع کر دیے امی کی طبیعت خراب رہتی تھی اس نے بہت خدمت کی میں سو جاتا تھا وہ ساری امی کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی اور اس وجہ سے میں مہرین کو بھولنا شروع ہو گیا اور حیران بھی تھا کہ یہ کیا ہے، ہم تو ایک پل بھی ایک دوسرے کے بنا بھی نہیں گزار سکتے تھے اور پھر ماریہ کی محبت میں مہرین کو بالکل ہی بھول گیا اور اب ایک ہفتہ پہلے مجھے مہرین یو کے میں نظر آئی اور اس کا حلیہ ایسا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھی جب میں اس سے ملا معذرت کی کہ میں یوں اس کو چھوڑ کر آ گیا تو اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں اُس کی شادی ہو گئی ہے اور بہت خوش ہے اور یہ اچھا ہوا کہ شمس میری شادی تم سے نہیں ہوئی۔ اگر تم سے ہوتی تو کیا میں اتنا آزاد ہوتی؟

روشان لگتا ہے تم اپنی محبت کی باڑ میں الجھ گئے ہو، روشان اس نے سچ کہا تھا میں واقعی اس کو اتنی آزادی نہ دیتا اور جب امی بیمار ہوئی تھیں تو کیا جتنی خدمت ماریہ نے کی تھی اُتنی مہرین کرتی؟ گویا یہ سب عشق کی کچی فصلیں ہیں کوئی محبت کو پا کر خوش رہتا ہے اور کوئی اس کو کھو کر خوش رہتا ہے جیسے میں آج ماریہ کے ساتھ بے حد خوش ہوں۔ اور روشان تم تو ابھی سے ہمت ہار گئے ہو میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کرتا ہوں اور تمہاری شادی کروا دیتا ہوں اب فی الحال اُٹھو۔ چلو اٹھو شاباش۔"

سر شمس کی باتوں سے میری ہمت بندھ گئی تھی میں چند دن بعد دوبارہ ڈیوٹی پر جانے لگا وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا پانچ سال بیت گئے میں یو کے کا ہی ہو کر رہ گیا۔ شمس صاحب مجھے شادی پر زور دینے لگے تھے مگر میں اس کو ٹال رہا تھا۔

تارفہ کی یاد آتی تو بھولنے کی کوشش کرتا مگر سوچیں جان ہی کب چھوڑتی ہیں کہ وہ کیسی ہو گی۔ اس کے بچے کتنے ہوں گے۔ اس طرح کے کئی خیالات آتے تو میں ذہن کو جھٹک کر کام میں مصروف ہو جاتا۔

☆☆☆

تم سے بچھڑنے کے بعد جی رہا ہوں اس طرح
تیز آندھی میں ٹمٹما رہا ہو چراغ جس طرح

ایک دن بطال کی ای میل آئی کہ اس کی شادی ہے تو تم پلیز تم جلد از پاکستان آؤ میں نے معذرت کی اور کام کی مصروفیت کا بتایا کہ میں نہیں آ سکتا۔

مگر اگلے دن اس کی پھر میل آئی ہوئی تھی جس میں اس نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور آنے پر زور دیا تھا۔

پاکستان جانے کو تو دل میرا بھی کر رہا تھا مگر فی الحال میں نے بطال کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چند دنوں تک میں پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے پاکستان میں بطال کو بتائے بغیر اپنے لیے چند دن کے لیے ایک فلیٹ اور کار کا انتظام کیا تاکہ مشکلات نہ ہوں۔

اور آج آٹھ سال بعد میں پھر واپس پاکستان آ گیا تھا اور آنے کی ایک وجہ بطال کی شادی تھی اور اس کا اصرار بھی تھا مگر ہم نے اس کو انکار کر دیا تھا اور چلے بھی آئے۔ ہمارا ارادہ بطال کو سرپرائز دینے کا تھا۔

شادی کی تقریب انکل زیدی کے میں گھر تھی ہمیں حیرانی بھی ہوئی کہ بطال کی شادی کی تقریب وہاں کیوں ہو رہی ہے۔ یہ کنفیوژن وہاں جا کر دور ہو گئی کہ ان کا مکان کافی بڑا ہو گیا تھا کیونکہ میں تو آٹھ سال بعد آیا تھا اور یہاں کافی تبدیلیاں ہو گئی تھی اور شاید اس لیے بطال کی شادی کا فنکشن وہاں رکھا گیا تھا کیوں بطال، زیدی صاحب کا بھانجا بھی تھا اور دوسری وجہ یہ تھی ان کا گھر بالکل ساتھ ساتھ تھا ہم تھوڑا لیٹ ہو گئے تھے مگر تھوڑی بعد ہم مکان کے اندر تھے فی الحال ہم پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی لگتا تھا کہ نکاح کی تقریب شروع ہو چکی ہے۔ ہم آہستگی سے نکاح کے رش کی جانب بڑھتے گئے میری کوشش تھی کہ میرا سامنا تارفہ سے نہ ہو۔ میں ابھی وہاں قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک مجھے زور دار آواز سنائی دی۔

”روشان تم، یہ روشان تم ہو بیٹا۔“

میں نے دیکھا تو خالہ زہرہ تھی اس کے ساتھ سب لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

”ارے ہاں یہ روشان ہے۔“

”مگر کیا زندہ ہے۔“

”یہ کدھر تھا۔“

طرح طرح کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

ابھی میں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اپنے عقب سے نسوانی آواز سنائی دی

”روشان تم؟؟“

اس آواز کو تو میں ہزواروں میں پہچان سکتا تھا یہ تارفہ کی آواز تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔

وہاں دلھن کھڑی تھی مگر وہ تارفہ تھی۔

دلہن کے لباس میں میری تارفہ تو گویا بطال کی شادی تارفہ سے ہو رہی تھی۔ تو کیا یہ تارفہ کی دوسری شادی تھی۔

”تارفہ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اس کی امی نے تارفہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

مگر لگتا تھا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔

”روشان کیوں آئے ہو یہاں، کیوں بار بار ہماری زندگی کو برباد کرنا چاہتے ہو۔“ تارفہ نے مجھے کہا۔

میں خاموش کھڑا تھا!!!

”بولو جواب دو خدا کے لیے مر جاؤ، ہم نے سوچا تھا کہ تم مر گئے ہو، خدا کے لیے چلے جاؤ ہماری دنیا سے۔“ وہ یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

یہ سب سننے کے بعد میں اپنے آپ کو گھسیٹ کر باہر کار تک لے آیا اور کار میں بیٹھ کر اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

فلیٹ میں آتے ہی میں فرش پر ڈھے گیا اور بے اختیار رونے لگ کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا اور دوسری شادی کا کیا چکر تھا اچانک میرے روم کا دروازہ بج اُٹھا۔

”کون۔“ میں نے ڈور کھولنے سے پہلے حیرانی سے پوچھا کہ ادھر کون آ سکتا ہے۔

”روشان بھائی میں عشرت ہوں۔ بطال کی بہن۔“ دروازہ کھولیے۔

(عشرت، تارفہ کی بیسٹ سہیلی تھی اور ہم دونوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی)

جس پر میں نے دروازہ کھول دیا۔

”عشرت آپی آپ؟“

میں نے حیرانگی سے اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی بھائی بہت مشکل سے سراغ ملا ہے آپ کا اس بار آپ کو کھو دیتی تو نہ جانے پھر کب موقع ملتا۔“

”اچھا خیریت تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم ہاں اور کتنا بھاگو گے بھیا؟“

”فی الحال تو پتا نہیں کسی کو اپنی بے گناہی کا احساس دلانا ہے کہ میں بے وفا نہیں تھا اچھا خیر یہ بتاؤ کہ یہ دوسری شادی کا کیا معاملہ ہے۔“

"تارفہ آپی اپنی پہلی شادی کے بعد آپ کو بھول نہیں سکی وہ سمجھتی تھی کہ آپ نے اس کو دھوکہ دیا مگر اس معاملے میں عروشہ کے خط نے ہماری مدد کی۔

تارفہ آپی شادی کے بعد اپنے دن رات کے شب روز معاملات اپنی ڈائری میں لکھتی رہی جس میں آپ کا احوال ہوتا تھا بدقسمتی سے وہ گھر میں اس کی ساس کے ہاتھ لگ گئی تو اس نے فوری طور پر اپنے بیٹے کو کہا کہ وہ یہ ڈائری تارفہ کے ابو کے دکھائے اور اس کو طلاق دے۔ مگر میں نے اس کی ساس کے پاؤں پڑ کر معافی مانگ لی اور تارفہ نے خود خلع لے لی اور اس طرح شادی کے چوتھے ماہ ہی وہ اپنی ازدواجی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں سے مہندی بھی نہیں اتری تھی۔" عشرت نے مجھے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا۔

"اور وہ عروشہ کے خط کی کیا کہانی تھی۔" میں نے آنسو روکتے ہوئے پوچھا۔

آپ کو پتا تو تھا کہ عروشہ مذاق مذاق میں دوسروں کی لڑائی کروا کرا انجوائے کرتی تھی۔ مگر ایک خامی تھی تارفہ کی کہ وہ کانوں کی کچی تھی کسی نے اُس کو بتادیا کہ فلاں تمہارے بارے میں یہ بولا ہے تو وہ بنا تصدیق کیے اس سے بول چال بند کر دیتی تھی تو بس ایسا ہی ہوا۔ تم نے اپنے پیغامات کے لیے عروشہ کو چنا اور تمہارے بولنے کا انداز اس طرح تھا کہ وہ کافی اس طرح یہ سمجھتی رہی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو مگر جب تم نے انکشاف کیا تو وہ محبت کی انتہا تک پہنچ چکی تھی جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ پھر تم عروشہ سے بات کرتے تو وہ تارفہ کو بڑھا چڑھا کر بتلاتی پھر جب اس کو معلوم ہوا تم اس سے نہیں بلکہ تارفہ سے محبت کرتے ہو تو وہ جیسے مر سی گئی۔ تو پھر تم نے اچانک سب سے رابطہ ختم کر دیا تو عروشہ نے سوچا کہ اگر تم اُسے نہیں مل سکتے تو وہ تارفہ کو بھی حاصل نہیں کرنے دے گی تو اس نے تارفہ کو تمہارے بارے میں اس قدر بھڑکایا اور پھر چونکہ وہ کانوں کی کچی تھی اور کہ وہ تم سے بددل ہوگئی پھر تارفہ کی شادی ہوگئی مگر عروشہ کو احساس ہونا شروع ہوا کہ اس نے کسی کی محبت چھین کر اچھا نہیں کیا تو اس احساس جرم میں بیمار پڑ گئی پھر ایک دن صبح اس نے اپنے آپ کو خود ہی شام تک کی مہلت دی کہ وہ اگر روشان شام تک واپس آگیا تو ٹھیک ورنہ وہ خودکشی کر لے گی مگر تم نہیں آئے تو اس نے مرنے سے پہلے دو خط لکھے ایک تمہارے نام جو اس نے مجھے فون کر بتایا تھا کہ اگر کبھی تم واپس آجاؤ تو تمہیں دے دوں مگر وہ خط مجھ سے گم ہو گیا تھا مگر جب اس کی موت ہوئی تھی تو میں نے پڑھا تھا تو اس میں اتنا لکھا تھا کہ وہ اپنے کیے کی سزا پا رہی ہے اور شاید کسی کی محبت کو حاصل کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ہوسکے تو روشان مجھے معاف کر دینا۔ اور ایک خط اس نے تارفہ کو لکھا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ روشان صرف تم سے پیار کرتے تھے اور تم صرف دو تھے تیسری میں آگئی۔ ہوسکے مجھے معاف کر دینا تب تارفہ کو حقیقت کا علم ہوا۔" عشرت نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"مگر جب تارفہ کی شادی تھی تو میں اس سے نکاح فارم پر دستخط کروانے گیا تو اس نے میری کوئی بات نہیں سنی تھی اور وہ الٹا مجھے الزام دیتی رہی تھی۔"

"ہاں وہ اس بات پر بھی بہت شرمندہ ہے مگر یہ آپ کی بدقسمتی ہے کیونکہ اس کی شادی کے بعد عروشہ کو یہ احساس ہوا کہ اس نے اچھا نہیں کیا تب اس نے ساری حقیقت تارفہ کو بتائی مگر تم اس وقت یہاں سے جاچکے تھے۔ وہ تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی مگر تمہارا کوئی رابطہ نمبر نہیں تھا تو اس نے بھی تمہارے نام ایک خط دیا تھا اور کہا تھا اگر کہیں تم مل جاؤ تو یہ خط آپ تک پہنچا دوں اور اس کے علاوہ وہ تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی تھی۔"

"وعدہ!! کیسا وعدہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس نے کہا تھا اگر تم نے شادی کرلی ہو تو ٹھیک ورنہ پلیز آپ کو ہماری محبت کی قسم شادی ضرور کر لینا۔"

"عشرت آپی یہ کیسا وعدہ لینا چاہتی وہ مجھ سے میں ایسا قطعاً نہیں کروں گا۔"

"روشان یہ تمہاری مرضی مگر یاد رکھو اس نے تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دیا ہے اب چوائس تمہارے سامنے ہے محبت کا واسطہ یا تمہاری ضد اس کا فیصلہ تم نے خود کرنا ہے اور یہ لو تارفہ کا خط اس کو پڑھ کر مزید فیصلہ کر لینا۔"

"اچھا میں تارفہ سے خود ملنا چاہتا ہوں اس سے خود بات کرنا چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے اس کے ساتھ یہ حالات پیش آئے اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں ایک بار سے میری ملاقات کروادو۔"

"نہیں روشان میں نے تارفہ کو کہا تھا کہ ایک

مرتبہ تم دونوں مل لو مگر وہ کسی صورت راضی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا ذمہ دار تمہیں ٹھہراتی ہے۔ اس لیے تم سے بالکل نہیں ملنا چاہتی ہے نہ بات کرنا چاہتی ہے اور بہتر یہی ہے کہ تم بھی اس کا خیال ذہن سے نکال دو اس کو بھول جاؤ اور جس نے تم کو بھلا دیا اسے بھول جانے کی دعا کرو۔" عشرت نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے عشرت آپی میں کوشش کروں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے روشان بھائی میں چلتی ہوں اپنا خیال رکھنا۔" عشرت نے مجھ سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔"

عشرت کے جانے کے بعد میں نے بے تابی سے تارفہ کا خط کھولا تو اس میں میرے نام چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

"روشان مجھے حقیقت کا کچھ علم نہیں تھا جب علم ہوا تو میرا سب کچھ بکھر چکا تھا۔ اب لفظ محبت سے بھی مجھے نفرت ہے یہ سب مجھے دھوکا لگتا ہے فریب لگتا ہے آپ کا اور میرا ملنا تقدیر میں نہیں تھا تم نے کبھی درختوں پر ریشم کے کیڑے کو دیکھا ہے جو اپنے اردگرد ہی خول بناتا ہے پھر اس کے اندر ہی پھنس کر مر جاتا ہے بس میں بھی اس ہی ریشم کے کیڑے کی طرح محبت کے خول میں پھنس چکی ہوں جس سے رہائی ممکن نہیں اور نہ ہی تمہارے پاس واپسی ممکن ہے۔ بس اگر میری خوشی چاہتے ہو تو پلیز تم جلد از جلد شادی کر کے اپنا گھر بسا لو اور تم کو یہ میری محبت کو واسطہ پلیز تم ایسا لازمی کرنا اور یہ بھی وعدہ کرو کہ تم جس عورت سے بھی شادی کرو گے اس کو میرا مقام دو گے اس سے میری طرح محبت کرو گے۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم وعدے کی پاسداری کرو گے"

یہ میرے لیے خط نہیں تھا بلکہ اس طرح کا سوچنا بھی سوہان روح تھا اس طرح پریشانی میں میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح میں خالہ اور انکل وغیرہ سے ملنا چاہتا تھا مگر اُس گھر میں میرا جانے کو بالکل من نہیں کر رہا تھا جہاں سے تارفہ دوبارہ دلہن بن کر گئی تھی۔

☆☆☆

اب میری منزل دوبارہ یو کے ہی تھی۔ میں یو کے پہنچ گیا جہاں مجھے شمس بخاری صاحب لینے آئے ہوئے تھے اُن کے ساتھ اب تعلق دوستی میں بدل چکا تھا۔

"ارے کیسا رہا تمہارا پاکستان کا سفر۔" شمس صاحب نے گھر پہنچتے ہی بے تاب لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"بس سر کچھ نہیں ایک کٹی ہوئے پتنگ کی طرح حالت ہو چکی ہے میری اور اب ایسے وعدے کی پاسداری کرنی ہے جو شاید میرے لیے ممکن نہ ہو اگر وعدہ نبھاتا ہوں تو تب بھی سوہان روح ہے اور اگر نہیں نبھاتا تو تب بھی مجھ پر قرض ہے۔" یہ کہہ کر میں نے شمس صاحب کو تارفہ کا خط بھی پڑھنے کے لیے دے دیا تاکہ ان کو پوری بات سمجھ میں آسکے۔

"ارے یہ تو اچھی بات ہے اس نے بہت اچھا لکھا ہے۔" انہوں نے خط پڑھ کر کہا۔

"سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ اچھی بات بھلا کیسے ہوئی۔ میں اس کے سوا کسی ساتھ زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"روشان تمہاری بات ٹھیک ہے محبت کے صدمے کو بھلانے میں ٹائم لگتا ہے مگر اس نے تم کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر ٹریپ کیا ہے اور تمہارا بھلا سوچا ہے تاکہ تم یوں اکیلے در در نہ بھٹکو ایک مرد عورت کے ساتھ تھوڑا ٹائم تو گزار سکتا ہے مگر اس کے بنا اکیلے پوری زندگی اکیلے گھر میں نہیں گزار سکتا اگر وہ تم سے ایسے ہی کہتی کہ تم شادی کر لو تو تم اس کی بات بالکل نہ مانتے مگر اس نے تمہیں دوسرے طریقے سے ٹریپ کیا ہے۔ اس لیے پلیز اس بارے ضرور سوچو۔

"لیکن شمس صاحب ابھی اتنی جلدی میں اس بارے کچھ نہیں کرنا چاہتا لیکن کوشش کروں گا تارفہ کے وعدے کی تکمیل کر سکوں۔"

☆......☆......☆

اس بات کو ایک ماہ گزر چکا تھا میرے معمولات زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں صبح اٹھتا نماز قران کی تلاوت کے بعد کام پر جانے سے پہلے تارفہ کے خط کو پڑھتا اور اُسی خط سے معذرت کرتا کہ میں لیے تمہارے وعدے کی تکمیل ناممکن ہے پلیز مجھے معاف کرنا اور پھر کام پر چلے جانا۔

ایک دن میں حسب معمول میں کام پر گیا تو شمس

صاحب نے مجھے بلا لیا۔
"کیسے ہو روشان۔"
"سر ٹھیک ہوں آپ سنائیں کیسے ہیں۔"
"میں تو ٹھیک ہوں مگر تم نے شادی کا کیا سوچا۔"
"سر ابھی تک دل میں کسی کی محبت کے زخم پرانے نہیں ہوئے یہ محبت برسوں پر محیط ہے ان کے مراسم بہت پرانے ہیں یہ بس عشق کی کچی فصلیں تھی جو ابھی پکی نہیں تھیں ورنہ ان کے خط سے وفا اور محبت کی جھلک نظر آتی ہے جو میں ہر صبح پڑھتا ہوں اور ہر رات پڑھ کر سوتا ہوں بس اسی وفا اور محبت کی جو جھلک نظر آرہی اس میں ہی جینا چاہتا ہوں۔" میں نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے جواب دیا۔
"روشان بیٹا دیکھو۔ تم ٹھیک کہتے ہو اس طرح زندگی نہیں گزرتی اور کسی کے بچھڑنے سے محبت مرتو نہیں جاتی۔ یہ تو ایک کھیل ہے اس میں عشق محبت وصل کے لمحے ہوتے ہیں اور "فلاسفر فیڈرس" نے کیا خوب کہا تھا کہ محبوب کی موجودگی میں کوئی عاشق بزدلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ مجھے عاشقوں کی فوج دو میں تمہیں ساری دنیا فتح کر کے دکھا دوں"۔ اور پھر تمہارا تو ابھی سب کچھ موجود ہے تم کیوں بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہو اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ کیا تم تارفہ کے وعدے کی تکمیل نہ کر کے اس کے پیار کو دھوکہ تو نہیں دے رہے۔"
"نہیں سر! میں اس کو دھوکہ...... نہیں سر قطعاً بالکل ایسی بات نہیں ہے۔" روشان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے پریشانی نمودار ہوئی۔
"دیکھو بیٹا مجھے تم اپنے بیٹے اور چھوٹے بھائی جیسے لگتے ہو مجھے اس لیے تم سے ہمدردی تھی باقی تمہاری مرضی۔"
شمس بخاری صاحب سے میرا کیا رشتہ تھا کچھ بھی نہیں، مگر وہ ایک مخلص انسان تھے، ان کے اس پیار اور بے حد اصرار پر شرمندگی بھی ہوئی مگر میں نے کہا تھا کہ سر میرا دل مانا تھا تو رشتہ تلاش کرنے کا آپ کو ہی بولوں گا۔"
اس کے چند ماہ بعد شمس صاحب نے مجھ سے دوبارہ پوچھا تو میں خوب صورتی سے اس بات کو ٹال دیا تھا۔
ایک دن میں میں آفس میں بیٹھا اور بوٹس کی رو انگی کی فائل دیکھ رہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے دیکھا تو اسکرین سر شمس کا نام آرہا تھا۔
"اسلام علیکم سر۔"
"روشان بھائی میں ماریہ بول رہی ہوں۔ ان کی بیگم! وہ شمس کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے آپ جلدی سے ہمارے گھر آجائیں۔"
دوسری طرف سے ماریہ بھابی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔
"اوہ! آپ ڈاکٹر کو فون کریں میں آتا ہوں۔"
"جی بھائی ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں بس جلدی سے۔"
"جی جی میں آرہا ہوں۔" میں نے ان کی بات کاٹ کر جواب دیا۔
میں تھوڑی دیر میں اُن کے گھر پہنچ چکا تھا۔
ڈاکٹر صاحب ان کا چیک اپ کر رہے تھے ماریہ بھابی بھی ایک طرف کھڑی تھیں ان کی حالت کافی خراب تھی، میں نے جاتے ہی ڈاکٹر سے ان کی طبیعت کا پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا کہ اٹیک نارمل ہوا ہے مگر یہ شکر ہے بھابی نے بروقت فون کر کے مجھے بلا لیا اب میں نے ان کو انجکشن لگا دیے ہیں تھوڑی تک ان کی حالت بہتر ہو جائے گی گھبرانے والے کوئی بات نہیں ہے بس بھابی کو حوصلہ دیں۔"
میں نے ماریہ بھابی کو جا کر سمجھانے لگا میرے سمجھانے پر ان کی حالت تھوڑی دیر میں سنبھل گئی میں اور ڈاکٹر صاحب دوسرے روم میں جا کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ وقفے کے بعد ایک لڑکی چائے کے دو کپ لے کر اندر آئی میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا چہرہ کسی مہتاب کی طرح تھا میں اس کو غور سے دیکھنے لگا میں ایک لمحے کے لیے بھول گیا کہ سامنے ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے جلدی سے نظریں سے نظریں نیچی کر لیں، وہ لڑکی جا چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم چائے پی کر فارغ ہی ہوئے تھے ماریہ بھابی بھاگی ہوئی اندر آئی اور بولی کہ شمس کو ہوش آگیا ہے۔"
ہم جلدی سے اندر چلے گئے۔ جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ مسکراتے ماریہ سے پوچھنے سے لگے کہ۔" آپ نے روشان کو کیوں تکلیف دی تو اس پر

ماریہ بھابی نے کہا کہ جب آپ کی طبیعت خراب ہوئی تو آپ نے فوراً روشان کا ہی نام لیا تھا فوراً اس کو ہی بلایا جائے۔"

ڈاکٹر صاحب نے چند ادویات دیں اور آرام کا مشورہ دیا جس میں نے کہا انہیں ہسپتال لے جایا جائے تو ڈاکٹر نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور پھر وہ اجازت لے کر چلے گئے۔

میں شمس صاحب کی طبیعت پوچھنے لگا ابھی میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ اچانک وہی لڑکی دوبارہ آ گئی اُس نے آتے ہی شمس صاحب سے اداس لہجے میں پوچھا کہ "شمس بھائی طبیعت کیسی ہے آپ کی۔" میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا اس کی آواز سن کر مجھے ایسے لگا جیسے میرے چاروں جانب گھنگھروؤں کی جھنکار سی بج اٹھی ہوں۔

"جی بیٹا بس اللہ نے نئی زندگی دی ہے۔" شمس کی آواز نے میرا سکوت توڑا۔

"روشان بیٹا یہ آپ کی بھابی کی بہن ہے ان کا نام مہتاب ہے اور یہ ہمارے پاس ہی رہتی ہیں، اور مہتاب بیٹا یہ روشان صاحب پاکستان سے ہیں اور میرے آفس اسسٹنٹ ہیں جن کی میں اکثر باتیں کرتا رہتا ہوں۔" شمس صاحب نے ہم دونوں کا تعارف کراویا۔

"جی اچھا!" مہتاب نے میرا تعارف سن مجھ کو مسکرا کر سلام کیا۔ میں اس کے مسکراہٹ بھرے سلام میں ایک لمحے میں کھو گیا مگر کمرے میں دوسرے افراد کی موجودگی سے یہ احساس چھپاتا تھا۔

میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا وہاں ان سب سے باتیں ہوتی رہیں۔ ماریہ بھابی اور مہتاب دونوں ہی بہت باتونی واقع ہوئی تھیں مگر مہتاب تو دو قدم کچھ زیادہ ہی تھی۔ خاصی تعلیم یافتہ تھی اور گھر داری میں ماہر تھی۔ میں ان کے گھر میں برسوں کے بعد جی بھر کر مسکرایا تھا۔

شام کو جب میں شمس صاحب کے گھر سے کھانا کھا کر نکلا تو میں ان سب کے لیے اجنبی نہ رہا تھا اور مہتاب میرے پورے دل و دماغ پر پوری طرح سوار تھی وہ میرے تصور میں مسکرا رہی تھی ساتھ میں بھی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا مسکراتا جا رہا تھا۔

مگر جب میں اگلی صبح اُٹھا تو معمول کے مطابق کا خط پڑھنے کے بعد مہتاب کا سراپا ایک بار پھر زائل ہو چکا تھا۔

چند دنوں کے بعد شمس صاحب ڈیوٹی پر بھی آ گئے بقول ان کے اب اُن کی طبیعت کافی بہتر ہے اِس طرح اُن کے ساتھ میری ہر روز تو ملاقات تو نہ ہوتی مگر کبھی کبھی ہو جاتی۔

ایک دن میں اپنے آفس کے کام میں مشغول تھا کہ میرے موبائل کی بیل گنگنا اٹھی۔ میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو سکرین پر "سر شمس" کا نام جگمگا رہا تھا۔ "یا اللہ خیر" میں نے جلدی سے فون ریسیو کرتے ہوئے سلام کیا۔

"روشان بھائی، آپ کی بھابی بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے ماریہ بھابی کی پریشان کن آواز سنائی دی۔

"ارے بھابی کیا ہوا سب خیریت۔" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"جی بھائی وہ آج پھر آپ کے بھائی کو اٹیک ہوا تھا اور ہمارے وہی فیملی ڈاکٹر اُن کو ہسپتال لے گئے تھے ابھی واپسی ہوئی ہے اور ابھی ان کو کچھ ہوش آیا ہے تو میں ان سے پوچھا ہے کیا روشان کو بلا لوں تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا کہ وہ بچہ ہے پریشان ہو گا، مگر میں ان سے چوری آپ کو فون کر رہی ہوں۔ آپ کوئی بہانہ کر کے ہمارے گھر آ جائیں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے بھابی میں کوئی بہانہ کر دوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں اور میں ابھی آتا ہوں۔"

☆☆☆

میں تھوڑی کے بعد ان کے گھر موجود تھا مجھے دیکھتے ہی سب اور شمس صاحب یکدم پریشان ہو گئے کہ میں اچانک کیسے، لیکن چونکہ یہ پلان پروگرام تھا تو میں نے ان کو بتلایا کہ میں ایک ضروری کام کے لیے جا رہا تھا تو میں نے سوچا کہ آپ سب سے ملتا چلوں مگر آپ کے گھر میں ڈاکٹر کی موجودگی سب خیریت تو ہے نا بھابی۔" میں نے سب کچھ پتا ہونے کے باوجود بھی انجان بنتے ہوئے کہا۔

"ارے ہونا کیا تھا بھائی پھر اٹیک ہوا ہے یہ تو شکر

ہے بھابی ساتھ تھی اور مجھے کال کر دی اور میں بروقت پہنچ گیا اور ان کی جان بچ گئی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا مطلب جان بچ گئی کیوں مگر کیسے۔" اب میں نے بیچ میں پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہ اس لیے جان بچ گئی کہ اس دفعہ اٹیک کی نوعیت زیادہ تھی مگر بروقت فون کال آجانے کی وجہ سے میں جلدی آگیا اور اس طرح ان کی جان بچ گئی مگر اب یہ تشویش لاحق ہوگئی ہے اب ان کو یہ اٹیک کسی بھی وقت ہو سکتا ہے اور اگر اُس وقت ان کے پاس کوئی نہ ہوا تو شمس کی زندگی کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب پلیز یہ تو نہ کہیں۔" ماریہ بھابی روہانسی ہو کر فوراً بول پڑیں۔

چند لمحوں کے بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور میں شمس صاحب پر ناراضگی کا اظہار کرنے لگا کہ انہوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا مگر ان کا کہنا تھا کہ تمہاری بھابی تو کہتی رہی کہ روشان کو فون کر دیتے ہیں مگر وہ کسی کو بلاوجہ تکلیف نہیں دینا چاہتے اس لیے انہوں نے مجھے فون نہیں کیا۔"

ان کی بات سن کر میں شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے شمس صاحب نے اندر کمرے میں جانے کو کہا جس پر میں نے ان کو سہارا دے اندر لے گیا تو وہ لیٹتے ہی مجھ سے بہت سنجیدگی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"روشان بیٹا میں تم آج بہت سنجیدہ بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میری کوئی اولاد نہیں بس جب ہم پاکستان سے یہاں آئے تھے ماریہ کی بہن مہتاب بھی ہمارے ساتھ آگئی تھی ہم نے اس کو اولاد کی طرح پالا ہے اور ہم اس کو نہ کھونا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنی نظروں سے دور کر کے پاکستان میں بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب میری طبیعت کا تم حال تم دیکھ رہے ہو میری زندگی کا کچھ پتا نہیں ہے۔ میرا ساتھ سانس کی ڈور سے کب ٹوٹ جائے اور میں چاہتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے جانے کے بعد کوئی اپنے وطن اپنا کا ایسا ہو جو میری فیملی کو سنبھال سکے اور جو مہتاب کا جیون ساتھی بن سکے تا کہ مجھے آرام و سکون مل سکے۔" شمس صاحب یہ سب مجھے بتاتے ہوئے گلوگیر ہو گئے۔

میں ان کی حالت پر ایک دم بالکل پریشان ہو گیا تھا میں اب تو یکدم انکار کر سکتا تھا اور نہ ہاں مگر اس وقت ان کی دل جوئی کرنا ضروری تھا تا کہ ان کا دل نہ ٹوٹے۔

"ارے نہیں شمس صاحب اللہ آپ کو لمبی زندگی دے آپ کسی باتیں کر رہے ہیں۔ پلیز آپ مایوس نہ ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دیں گے۔" میں نے ان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"مگر بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"سر میں اب انکار تو نہیں کر سکتا مگر آپ جس طرح سے میرا خیال کرتے ہیں میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔" آخر کار میں نے ان کی حالت دیکھ کر اپنی ضد کا اژدھا ڈھا ہی دیا۔

"روشان مجھے کل ہی جواب چاہیے ورنہ میں پھر جلد از جلد اس کام کو کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ یہ نہ ہو کہ اگر میرا بلاوا آجائے تو میں سکون سے نہ جا سکوں۔" شمس صاحب اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

رات کی کم ہم تنہائی میں، میں اپنے فلیٹ میں لیٹا ہوا تھا اب جو تنہائی مجھے سکون دیتی تھی اور محفلیں اذیت دیتی تھیں اب مجھے اس سے تکلیف ہونے لگی تھی اور پھر تارفہ کا دیا ہوا وعدہ اور ساتھ شمس صاحب کا بڑھتا ہوا اصرار۔

☆☆☆

دوسرے دن میں نے شمس صاحب کو بنا شرمائے ہاں بول دیا وہ میرے اس فیصلے پر بہت خوش ہوئے اور اتنی دعائیں دیں کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے ارد گرد دعاؤں کا حصار ہو۔

پھر چند دنوں تک شمس صاحب کے وہیں کے رہنے والے دوست احباب اور کچھ آفس کولیگز نے مل کر میری منگنی کا اہتمام کیا اور بیس دن کے بعد میری شادی ہونا طے پائی اور اس میں مہتاب کی مرضی بھی شامل تھی۔

میں نے زندگی کے نئے سفر کو شروع کرنے کے لیے دوسرے دن شمس صاحب کے گھر سے تھوڑا فاصلے پر ایک اچھا سا گھر دیکھ لیا تھا اس کی تزئین و آرائش شروع کروا دی تھی میں بھی اس طرح سہانا سپنا دیکھ رہا تھا اور بہت خوش تھا۔

☆......☆......☆

بالآخر وہ صبح بھی آگئی جس دن میری شادی تھی آج میں اپنے نئے گھر میں موجود تھا کیونکہ میں پہلے کمپنی کی طرف سے دیے گئے فلیٹ میں رہتا تھا۔کل سے میرے اس نئے گھر میں چوڑیوں کی کھنکار کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز ہونے والا تھا۔

دوپہر تک میرے شمس صاحب کے اور وہیں کے رہنے والے دوست احباب اور کچھ آفس کولیگز اور دونوں اطراف کے باراتی میرے گھر میں موجود تھے۔

ہم نے کچھ دیر میں شمس صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہونا تھا اور میں جانے سے پہلے آخری بار تارفہ کا دیا ہوا وہ خط پڑھنا چاہتا مگر جب میں اپنی الماری کی طرف گیا جہاں سے کل آفس سے واپس آیا تھا اور سامان رکھا مگر اُس میں مجھے تارفہ کا خط نہ ملا۔

میں نے ساری الماری دیکھی، اپنا والٹ دیکھا مگر تارفہ کا خط نہ ملا۔میری پریشانی بڑھتی گئی کہ آخر وہ خط کہاں گیا۔تو پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں کل آفس سے نکلا تھا وہ خط غالباً آفس میں ہی رہ گیا تھا۔

اب میرے دل میں کسک تھی زندگی کے اس نئے آغاز سفر میں ،میں نے وہ خط ہر حال میں لازمی پڑھنا ہے مگر اب ادھر سے نکلنا مشکل تھا۔میں نے شمس صاحب کو فون کیا کہ میں تھوڑی پریشانی میں ہوں پلیز آپ میرے گھر آجائیں۔

شمس صاحب کا گھر چونکہ ساتھ میں تھا وہ چند لمحوں میں آگئے مگر اُن ساتھ ماریہ بھابی بھی تھیں اِن دونوں کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی کہ کہیں میری شادی کی رائے تو نہیں بدل گئی۔

"کیا ہوا" انہوں نے آتے ہی پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"سر ہوا کچھ نہیں وہ میں نے بتایا تھا نہ کہ تارفہ نے مجھے خط لکھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ شادی کرلو تو اب میں چونکہ میں اپنے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کرنے جارہا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں وہ خط آفس میں ہی بھول آیا ہوں، میں اُس خط کو آخری بار پڑھنا چاہتا ہوں اور پھر جلا دینا چاہتا ہوں تاکہ میں اپنی زندگی کا یہ سفر ایک اچھے اور نئے انداز سے شروع کرسکوں اور اس لیے میں نے آپ کو یہاں بلایا ہے آپ کی اجازت لینے کے لیے۔اگر اکیلا جاؤں گا عجیب لگے گا، ساتھ کسی آفس کولیگ کو لے جاتا ہوں اور کوئی بہانہ کرکے ابھی آجاتے ہیں۔"

"مگر بیٹا تم کس خط کی بات کررہے ہو۔" ماریہ بھابی نے پوچھا۔

"بھابی وہ آپ کو شمس صاحب بتلا دیں گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا ہے میں کسی کو تمھارے ساتھ روانہ کرتا ہوں اور تم یہ بہانہ کرنا کہ میں اے ٹی ایم کارڈ بھول گیا ہوں تو رقم کی ضرورت پڑسکتی ہے۔"

"جی سر بالکل ٹھیک ہے۔"

☆......☆......☆

"ارے کس خط کی بات کررہا تھا، یہ لڑکا۔" روشان کے جاتے ہی ماریہ نے اپنے شوہر شمس سے پوچھا۔

"ماریہ بس چھوڑو۔یہ بھی کہانی ہے وہ تو مرگئی مگر اس لڑکی کا بھوت ابھی تک اس کے ذہن سے نہیں اُترا۔"

"مگر شمس ایسا تو نہیں کہ اس کو ہمارے اس پلان کا پتا چل گیا ہو کہ تمہارا یہ سب اٹیک کا بہانہ تھا ہو سکتا ہے اس کو کسی نے بتایا ہو۔" ماریہ نے کہا۔

"اس کو کون بتائے گا ڈاکٹر بھی اپنا آدمی تھا اور اس کو میں نے اچھا خاصا پیسا دیا تھا اور پھر اٹیک کو پلان اس وقت کیا گیا جب مہتاب گھر پر نہیں ہوتی تھی تو کسی کو کیا پتا اور پھر تم نے تو کسی سے کچھ نہیں کہا نا؟" شمس نے پریشانی کے عالم میں ماریہ سے پوچھا۔

"ارے نہیں میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔" ماریہ نے پریشانی کے جلدی سے کہا۔

"بس ٹھیک ہے اب دعا کرو کہ وہ جلدی سے یہ آجائے ورنہ سب چوپٹ ہوجائے گا۔"

☆......☆......☆

ہمارا آفس سمندر کے ساتھ بالکل کنارے پر تھا اور ہم اس پر بیٹھ کر آنے والے بحری جہازوں اور مختلف چھوٹی شپس، بوٹس کو روانگی کے احکامات جاری کرتے تھے۔میں جیسے ہی سمندر کنارے پر بنے آفس میں داخل ہوا تو آفس کولیگ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں شادی کے روز یہاں کیسے......"

"جی بس ڈیئر وہ میں نے اپنا اے ٹی ایم کارڈ بھول گیا تھا وہی لینے آیا تھا۔" میں یہ کہہ کر

اپنے آفس کی جانب بڑھ گیا وہاں مجھے اپنی الماری میں تارفہ کا خط مل گیا۔
''سوری تارفہ میں یہ خط جلانا نہیں چاہتا تھا مجھے شمس صاحب سے مجبوری کی بنا پر اُن سے یہ کہنا پڑا ورنہ میں تمہاری یادوں کو کیسے جلا سکتا ہوں میں تو تمہارے وعدے کی تکمیل کرنے سے پہلے تمہارے اس خط کو پڑھنا چاہتا تھا اور اب اس کو سمندر برد کر دوں گا مگر جلاؤں گا نہیں۔'' میں نے اپنے آپ سے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔
میں جیسے ہی آفس سے باہر نکلا تمام اہلکار پریشان ہو کر بھاگتے نظر آئے۔
''کیا ہوا۔'' میں نے ایک اہلکار جیفر کو روک کر پوچھا۔
''سر وہ بوٹ۔'' اس نے دور سمندر میں اشارہ کیا۔
''مسئلہ کیا ہے۔'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔
''سر دور بین سے دیکھیں۔'' ایک اور اہلکار نے مجھے دور بین دیتے ہوئے کہا۔
جب میں نے دور بین سے دیکھا تو مجھے دور سمندر میں ایک بوٹ نظر آئی جو کہ ہچکولے کھا رہی تھی اُس میں ایک جوڑا سوار تھا اس طرح اکثر ہوتا تھا کہ اکثر جوڑے یا میاں بیوی سیر کو آتے تھے اور بوٹ میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کو نکل آتے تھے پھر بعض اوقات وہ سمندر کی گہری لہروں کی نظر ہو جاتے تھے یا ہماری ٹیم اُن کو بچا لیتی تھی مگر اس طرح اُن کا گہرے پانی میں جانا ممنوع تھا مگر یہ بوٹ بہت زیادہ آگے جا چکی تھی۔
''او مائی گاڈ!'' میرے منہ سے پریشانی سے نکلا اچھا اس وقت شمس صاحب کے بعد چارج کس کے پاس ہے۔'' میں نے پوچھا۔
''سر مائیکل کے پاس، مگر وہ اس وقت کھانا کھانے گئے ہوئے ہیں۔''
''اوہ نو۔ اُن کو تو آتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔ ہم انسانی زندگی کا رسک نہیں لے سکتے مجبوری ہے۔ میری چھٹی کے باوجود بھی آپ کو مجھے فالو کرنا ہوگا۔'' میں نے اُن سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''جی سر مگر قانونی یا دفتری پیچیدگی نہ ہو۔'' میرے اسسٹنٹ نے تھوڑا پریشان ہو کر کہا۔
کچھ نہیں ہوگا اگر کچھ ہوا تو میں سب دیکھ لوں گا ویسے بھی اس وقت میرے سوا کوئی ٹیم کو گائیڈ کرنے والا نہیں ویسے بھی یہ انسانی زندگیوں کا سوال ہے اس لیے جلدی سے اپنا ضروری سامان اور بوٹس نکالو۔''
تھوڑی دیر میں ہم اُس بوٹ کے پیچھے تھے۔ مجھے واقعی اس بوٹ کی حالت خراب لگ رہی تھی۔ بوٹ مین اپنی بوٹ مرمت نہیں کرواتے تھے اور آنے والے سیاحوں اور جوڑوں کو کرائے پر دیے دیتے تھے۔ جو کہ اُن کے لیے پریشانی کا باعث بنتی تھی۔ اس بوٹ کی حالت بھی قابل رحم تھی۔
بوٹ میں مرد اور عورت سوار تھے وہ مرد بڑی مشکل سے کشتی کو کنٹرول کر رہا تھا مگر وہ اُس سے کنٹرول نہیں ہو رہی تھی۔ ہمیں اُن کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اب ہم نے کسی طرح اُن کو Save کرنا تھا۔
اب ہم ان کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے جیسے ہی اُنہوں نے ہم کو دیکھا تو وہ مرد زور سے چلایا۔
''پلیز ہیلپ می۔''
میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''بطال، تارفہ۔''
میں نے دوبارہ غور سے دیکھا وہ بطال تھا اور اس کے ساتھ تارفہ تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے سُن ہو کر رہ گیا میں تو اپنی نئی زندگی کے آغاز پر صرف تارفہ کا خط پڑھنے آیا تھا مگر یہاں تو پوری تارفہ ہی آ گئی تھی۔
میں اچانک تارفہ کی چیخ سن کر ہوش میں آ گیا۔
''بطال تارفہ کو پکڑو۔'' میں نے زور سے چلاتے ہوئے کہا۔
بطال اور تارفہ نے میری جانب چونک کر دیکھا۔ تارفہ نے مجھے ایک لمحے میں پہچان لیا مگر بطال مجھے حیرانگی سے دیکھ رہا تھا کہ میں کون ہوں کیوں کہ وہ مجھے کافی عرصہ بعد دیکھ رہا تھا۔
اچانک ایک اہلکار نے ان کی جانب رسی اچھال دی جس پر میں نے بطال کو کہا کہ وہ جلدی سے رسی کو اپنے اور تارفہ کے ساتھ باندھ لے۔
ان کی کشتی میں پانی بھرنے لگا تھا اور وہ آہستہ آہستہ ڈوب رہی تھی۔
''بطال جلدی کرو۔'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔

اچانک بوٹ مکمل طور پانی میں ڈوب گئی مگر ابھی تک بطال نے تارفہ کو رسی نہیں باندھی تھی۔

''جیفر ہمارے پاس کتنے تیراک ہیں۔'' میں نے اہلکار سے پوچھا۔

''سر تیراک تو ہیں مگر ہم جلدی میں سانس لینے کے لیے آکسیجن بوکس اُٹھانا بھول گئے ہیں تو اب پانی گہرا ہے اس لیے اُن کو اتارنا رسک والی بات ہوگی بس اس رسی سے کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''اوہ میرے خدا! میں نے اُس کی بات پر سر پیٹ لیا اور جلدی سے بطال کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''بطال جلدی سے تارفہ کا ہاتھ پکڑو اور اپنے ارد گرد رسی باندھو اور اس کا ہاتھ مت چھوڑنا۔'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

مگر اُس وقت اس کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور اس نے ابھی تک تارفہ کو رسی بھی نہیں باندھی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا ہم سب کو ڈر تھا۔

اُن کی بوٹ مکمل طور پر پانی میں ڈوب گئی بطال چونکہ اپنے آپ کو رسی سے باندھ چکا تھا تو اس نے سمندر میں چھلانگ لگادی تو اہلکاروں نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

جبکہ تارفہ گہرے پانی اور بوٹ کے اندر ہی رہ گئی تھی۔

''تارفہ'' میں زور سے چلایا اور ایک منٹ میں فیصلہ کیے بغیر کہ آگے کیا ہونے والا ہے سمندر میں چھلانگ لگادی۔

تیز لہریں مجھ کو ادھر اُدھر کر رہی تھی میں نیچے گہرے پانی میں تیرتا چلا گیا۔

میں ہر صورت اس کو بچانا چاہتا تھا اس کو اوپر لانا چاہتا تھا اور وہ جب میرے سامنے تھی تو اس کو کچھ سچائی بتلانا چاہتا تھا گزرے ماہ وسال کا حساب دینا چاہتا تھا اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور کچھ بتلانا چاہتا، اور یہ بھی کہنا چاہتا تھا دیکھو تارفہ آج کتنا خوش نصیب دن ہے جس کی تکمیل کے لیے تم نے مجھے کہا اور آج میں وعدہ نبھا رہا ہوں۔

وہ مجھ کو نیچے پانی میں نظر آگئی۔

میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کو بازو سے پکڑا مگر اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور پھر نیچے جانے لگی۔

میرا سانس ٹوٹنے لگا تھا میں نے پھر جلدی سے اس کا بازو پکڑا اور جلدی سے اوپر لے جانے کی کوشش کی اور بولنے کی کوشش کی مگر پانی میں میری آواز بلبلے بن کر رہ گئی میری سانس اور ہمت بالکل جواب دے چکے تھے کیونکہ میں خود اتنا بڑا تیراک نہیں تھا اور پھر مجھے ایسا لگا جیسے اُس کا وجود میری حالت دیکھ کر مجھے اوپر لے جانے کی کوشش کر رہا ہو۔

پھر ہم پانی کی اوپری سطح پر تھے اور بوٹ کا بالکل مدھم سا شور اور تارفہ کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی کہ روشان آنکھیں کھولو ہمت کرو اور رسی پکڑو، رسی پکڑو کی آوازیں بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

مگر مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر میرے کانوں میں تارفہ کی سسکیاں اور رونے کی مدھم سی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اچانک ایک بار پھر مجھے پانی میں جانے کا احساس ہوا اور کسی نے نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا مگر اس دوران سانس نے میرا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔

تیزی سے پانی میرے منہ میں داخل ہو رہا تھا اور......

اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ اب بھی تھا۔

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

☆☆☆

اور آج پورے پچیس برس بعد، جب میں تارفہ کے ساتھ اپنی زندگی کے نشیب وفراز شیئر کرتا ہوں تو وہ سارے پل، سارے امتحانات جو ہماری زندگی میں آئے تھے کہیں بہت دور چلے جاتے ہیں۔ سچ ہے۔ قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ میں اور تارفہ۔ آج ایک ہیں۔ ہمارا خوشحال گھرانہ ہے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہمارا اثاثہ ہیں۔ جو ماشاء اللہ اب جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکے ہیں۔ ہماری محبت کی کچی فصلیں اب پک کر تیار ہو چکی ہیں اور اب نئی فصلیں اپنی اٹھان بھر رہی ہیں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ ہماری زندگی کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کیجیے۔

☆☆......☆☆

تیسری طویل سچ بیانی

اندھیرے دریچے

روشانے عبدالقیوم

اُس عورت کا قصہ بلاخیز، جس نے گدی نشینی کو کھیل بنا کر رن کھیلا

وہ بار بار دروازے تک آتی اور بے چین سی واپس پلٹ جاتی۔ سلطانہ باجی کی رُعب دار شخصیت اور پاٹ دار آواز و انداز سے اُس جیسی تیز طرار لڑکی بھی خائف تھی۔

سارا گاؤں کیا مرد، کیا عورتیں ہر کوئی اُن کا احترام کرتا تھا۔ اُن کی بات پتھر پر لکیر کا درجہ رکھتی تھی۔

پیر محی الدین گدہ نشین کی اکلوتی بیٹی جو ان کے چھوٹے بھائی غیاث الدین مرحوم کے بیٹے کی بیوی تھی۔ غوث علی شاہ پڑھے لکھے رحم دل انسان تھے۔ سلطانہ کے انداز انھیں سخت ناپسند تھے۔ سلطانہ سے ان کی اولاد نہ تھی۔ تایا نے خود ان کی شادی خاندان میں کر دی تھی۔ دوسری بیوی فرخندہ دھیمے مزاج کی سادہ سی خاتون تھی۔

سلطانہ باپ کی وجہ سے خاموشی پر مجبور تھی وگرنہ غوث علی شاہ کو سبق سکھانا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

وہ کچھ بھی کر لیتی کوئی ان کے خلاف منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ سب کی نظر میں ایک بڑی ہستی تھیں۔ پیر محی الدین کی اکلوتی اولاد، باپ کی وفات کے بعد ہر سیاہ و سفید کی مالک۔ غوث علی شاہ کو حاکم کہلانے کا کوئی شوق نہ تھا۔ وہ نامی گرامی زمین دار و سیاست دان تھے۔ ان کے خاندان کا اک نام تھا۔ جواب ان کی صورت میں رہ گیا تھا۔ کروڑوں کی زمین و جائیداد کا اکیلا وارث، کچھ کم سلطانہ بھی نہ تھیں۔

وہ اپنی حیثیت سے بخوبی آگاہ تھیں۔ اسی لیے اُس کا غلط فائدہ بھی خوب اٹھا رہی تھیں۔

اب کی بار نگینہ نے ہاتھ ملے اور آبنوسی دروازہ وا کر کے ذرا سا جھانکا۔ وہ قرآن پاک کی تلاوت مکمل کر کے بند قرآن کو چوم رہی تھیں۔

''باجی جی!'' اُس نے ڈرتے ڈرتے ذرا سرگوشی میں کہا تھا۔

''کہو؟'' وہ قرآن پاک رکھ کر پلٹی تھیں۔

''وہ جی باہر گاؤں کی کچھ عورتیں آئی ہیں جی، بڑی مجبور ہیں اگر آپ شنوائی کر دیتیں تو۔'' اُس نے بہت مسکین سی صورت بنا کر لجاجت سے کہا تھا۔

مگر سلطانہ جلال میں آ گئی تھیں اُس پہ آنکھیں نکالیں۔

''برسوں ہو گئے تمھیں اِس حویلی میں...... کیا تمھیں یاد دہانی کروانی پڑے گی کہ جمعرات کو حویلی میں نیاز کی دیگیں چڑھائی جاتی ہیں، ہمارے بزرگوں

کی روایت ہے جسے میں نے آج تک جاری رکھا ہے۔ جمعرات کا دن اللہ اور اس کے مسکین عاجز بندوں کے لیے باقی پورے دن مسئلے مسائل کے لیے، جا واپس بھیج دے، کل آجائیں ساری، جو بھی مسئلہ ہوگا دیکھ لوں گی۔" وہ سونے کے زیورات دیکھتی اشارہ کر کے بولی تھیں۔

"جی اچھا۔" نگینہ دروازے کی سمت پلٹی۔

"اور سن؟" پیچھے سے ان کی آواز آئی تو وہ دوبارہ پیچھے پلٹی تھی۔

"جی باجی جی! حکم" وہی مسکین سی صورت۔

"پیغام دے کر جلدی آنا ذرا دیکھوں تو نیاز کی دیگیں پوری ہیں کہ نہیں۔"

حویلی کے پچھواڑے نائیوں نے بڑی بڑی دیگیں چڑھائی ہوئی تھیں۔ جن کو چکھنا اور پورا جائزہ لینا سلطانہ نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ ویسے بھی وہی حویلی کی کرتا دھرتا تھیں۔

غوث علی شاہ کو پیری مریدی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اپنی ذات میں گم رہتے، گدی سنبھالنے کی باری اب ان کی تھی مگر وہ مانتے نہ تھے اور سلطانہ ہر بار انھیں طعنہ ضرور مارتیں۔ بزرگوں کی روح کو تڑپانے کا ذمہ دار قرار دیتیں اور دل ہی دل میں مطمئن بھی رہتیں کہ اس گدی کے بہانے وہ ہر سیاہ و سفید کی مالک بنی بیٹھی تھیں۔ جو دل چاہتا حکم جاری کرتیں۔ کسی کی مجال نہ تھی ان کے فیصلے سے انحراف کرنے کی۔

"جو آپ کا حکم، میں بس گئی اور یوں آئی۔" وہ سر ہلاتی تیز تیز قدموں سے دروازہ پار کر گئی۔

انھوں نے سونے کے جھمکے پہنے، گلے میں مالا ڈالی، انگوٹھیاں انگلیوں میں پہنی، سونے کے موٹے موٹے کڑے پہنے، دوپٹہ سر پر جمایا، کندھوں کے گرد شال لپیٹتی، تب تک نگینہ آ پہنچی۔

"چلیں باجی جی۔" اس نے ہاتھ احترام سے آگے کر کے انھیں بڑھنے کی جگہ دی۔ وہ زمین کو گویا



قدموں سے رگڑتی، روندتی قدم بہ قدم چلنے لگیں۔ حویلی کے پچھواڑے گہما گہمی مچ گئی۔ سلطانہ بی بی آ گئیں سلطانہ بی بی آ گئیں۔ رستہ خالی ہونے لگا، سر جھک گئے۔ پیر محی الدین کی صاحبزادی کو سلامتی دی جانے لگی۔ ہر کوئی سلام میں پہل کر کے برکتیں سمیٹنا چاہتا تھا۔

ہر دیگ میں سے سلطانہ نے چکھا، قبولیت اور پسندیدگی کی سند دی۔ ان کے ہاتھ سے پہلی نیاز بانٹی گئی، پھر تو گویا عید کا سماں بندھ گیا، گاؤں کے غریب سادہ لوح عوام انھیں دعائیں دینے لگے۔ وہ راستے سے گزر کر حویلی آئی، دیو قامت آبنوسی داخلی دروازے کی سمت جانے کے بجائے وہ بائیں باغ چلی آئیں۔

''خیریت باجی جی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟'' نگینہ جوان کے ساتھ ہی حویلی میں برسوں سے رہ رہی تھی۔ تشویش سے بولی۔ کیوں کہ وہ بہت کم اس طرف آتی تھیں۔

''تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں، مجھے اکیلا چھوڑ دو، کسی کو اس طرف مت آنے دینا۔'' انھوں نے حکم دیا۔

''جیسے آپ کا حکم۔'' وہ حکم کی غلام سر ہلاتی تیزی سے پیچھے کو بھاگی تھی۔

''شکر ہے اِس بلا سے تو جان چھوٹی۔'' انھوں نے سکھ کا سانس لیا اور اسمارٹ فون سامنے کر کے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

اُن کا دل کسی نو خیز لڑکی کی طرح دھڑکنے لگا تھا اور کیوں نہ دھڑکتا؟ وہ اُن کی پہلی محبت تھا، جو پہلی بارش کی طرح ہر سُو معطر خوشبو اور تازگی بکھیر دیتا ہے، دوسری طرف ہشاش بشاش سی آواز اُبھری تھی۔

''زہے نصیب سلطانہ بیگم۔ ہم تو تمھارے لیے ترس کر رہ گئے ہیں۔''

''مظفر خان ترسنا کیا ہے یہ مجھ سے پوچھو، باپ کی محبت میں قربانی کا جانور بن گئی، سچ پوچھو تو آج بھی میرے دل پر تمھاری حکمرانی ہے، وہ مٹی کا پتلا غوث علی شاہ، میرے پالتو جانوروں جتنی اہمیت بھی نہیں اُس کی۔ بس مجبور ہوں، اپنے خاندان کی وجہ سے، اپنے پرکھوں کی عزت کے خیال سے، تم تو سب چیزوں سے باخبر ہو پھر کیوں میرا زخم تازہ کرتے ہو؟'' وہ ہمیشہ کی طرح لاڈ سے بولی تھی۔

''زیادہ ڈرامہ بازی مت کرو سلطانہ بیگم! باپ دادا کی عزت نے نہیں، غوث علی شاہ کی دولت نے تمھیں مجبور کر دیا تھا، مجھ جیسے سیلانی صفت بندے سے تمھیں کیا مل جاتا۔'' وہ نوجوانوں کی طرح دل پر ہاتھ رکھے ہنسا تھا۔

''تم کچھ بھی کہہ دو، اک تمھاری باتیں ہیں جو بُری نہیں لگتی۔ تمھاری محبت مُنہ زور سہی پر خاندان کی بھلائی اور فائدے کے لیے مجھے قربان ہونا ہی تھا، ذرا آ کر دیکھو تو سہی وہ دھان پان سی سلطانہ کیسے پورے گاؤں پر اپنا حکم چلاتی ہے۔ کسی کے باپ کی مجال نہیں کہ آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے مجھے۔ میرے فیصلے سے انکار تو بہت دُور کی بات ہے، یہ سب مجھے تم سے مل سکتا تھا بھلا، اب وقت آ گیا ہے کہ سب سے چھٹکارا پا کر میں تمھارے پاس آ جاؤں، بہت ہو گیا، اب اور نہیں سہہ سکتی۔ میری ساری طاقت اور دولت مجھ سمیت تمھاری ہے۔'' وہ ادا سے بولی تھی۔

''دیکھ لو تمھاری محبت میں اب تک کنوارا ہوں۔'' ایک جاندار قہقہہ لگایا تھا اُس نے۔ سلطانہ کی روح سرشار ہو گئی۔

وہ گاؤں کے اسکول سے میٹرک کا امتحان دینے جاتی تھی۔ مظفر جو ہر خوب صورت جگہ پہنچ جاتا تھا۔ گاؤں کی خوب صورتی دیکھنے آیا تھا۔ وہ مصور تھا، شاعری اور حُسن کا دلدادہ، سلطانہ کی گاڑی سے ٹکرایا تھا اور یہ تصادم دونوں کو پاس لے آیا، اس کا گھر بار نہ تھا، کبھی ایک شہر میں رہتا تو کبھی کسی دوسری جگہ، کہیں ایک جگہ ٹکنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

باپ کینسر کا مریض تھا تو عدم توجہ اور پیسے کی کمی کی وجہ سے وفات پا گیا۔ یوں وہ اکلوتے خونی رشتے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، سیماب فطرت کو کوئی فرق نہ پڑا بلکہ اب تو آوارہ گردی کو مزید موقع ملا۔ وہ موچی کا بیٹا تھا اور سلطانہ کروڑوں کی مالک، ایک خاندانی گدی نشین

شخص کی اکلوتی بیٹی۔ بے تحاشا محبت کے باوجود بھی سلطانہ اِس واضح فرق کو بخوبی پہچانتی تھی۔ اپنی وجہ سے پیرمحی الدین کا سر نہیں جُھکانا چاہتی تھی۔ یوں وہ غوث علی شاہ کے نکاح میں آگئیں۔ شادی نے بھی اُن کی محبت کو دُور نہ ہونے دیا، رابطے کا ہر ذریعہ درمیان میں رہا، ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں، قسمت اچھی تھی کہ غوث علی شاہ سے ان کی اولاد نہ تھی۔ باپ اب رہا نہیں تھا۔ وہ آسانی سے جان چھڑا کر مظفر خان سے شادی کرسکتی تھیں، اِس تعلق سے مظفر کو بھی فائدہ حاصل تھا۔ وہ جب چاہتا سلطانہ سے فرمائش کرتا اور یوں موٹی تگڑی رقم اور ٹکٹ لے کر ملکوں ملکوں گھومتا، اندرون ملک کے علاوہ بیرون ممالک کی بھی سیاحت کرتا، اچھا پہنتا اچھا کھاتا، سلطانہ سے محبت اس کی لاٹری تھی۔

وہ اُسے ناراض کر کے کیوں اِس لاٹری سے ہاتھ دھوتا، کوئی بے وقوف ہی ہوتا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر بیٹھے آئی دولت کو ٹھوکر لگاتا، اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اُس نے سلطانہ کو پوری طرح مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

”ہمیں ملے بہت وقت ہوا۔ سلطانہ پھر کب ملوگی؟“ مظفر نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ضمیر نے طعنہ دیا سرزنش کی۔ پیرمحی الدین کی بیٹی تمھیں یہ مقام زیب دیتا ہے، تم کیا ہو اور کیا دکھائی دیتی ہو؟ مگر دل نے ضمیر کی نہ سُننے دی اُسے تھپک کر سُلا دیا اور سینہ تانے کھڑا ہوگیا بچے کی طرح مچل کر منہ بسورے ضد کرنے لگا۔ وصل ...... وصل ...... وصل!!!

”بہت جلد...... اور دعا کرو، پھر دُوری درمیان میں نہ آئے۔“ اپنی ہی لے میں بولی تھیں۔

”میں انتظار کروں گا...... اپنی آخری سانس تک!!“ مظفر نے صُور پھونکا اور سلطانہ پتھر بن گئی تھیں۔

”کبھی دیکھا ہے تونے عشق میں وجدان کا عالم۔
بس تُو ہی تُو، تُو ہی تُو اور تُو ہی تُو کا عالم
مگر یہ عشق تو نہ تھا۔
زقوم کا درخت تھا...... کڑوا کسیلا...... اک سزا۔

☆...... ☆...... ☆

آج جمعے کا بابرکت دن تھا۔ حویلی کے احاطے میں بڑی سی نشست پر سلطانہ کسی ریاست کی ملکہ بنی بیٹھی تھیں۔

آج کے دن وہ گاؤں کے سادہ لوح عوام کو درس دیتی تھیں۔ ایک ہجوم ان کے آگے سر جھکائے ادب سے بیٹھا تھا۔

زیادہ تعداد عورتوں اور کم عمر لڑکیوں کی ہی تھی، مرد خال خال تھے۔

”جیسا کہ آپ سب جانتے ہو آج میرا پسندیدہ موضوع بیان ہوگا، یعنی پردہ۔ اور میں اس بیان میں سورۃ نور سے تھوڑا حوالہ بھی پیش کروں گی، تاکہ آپ سب خواتین کو معلوم ہو، قرآن میں پردے کا کیا حکم ہے؟“ ان کی بات پر سارے ہجوم کے جھکے سر ہلے تھے۔

وہ آیت مکمل کر کے اب سمجھائی جارہی تھیں ساتھ میں حدیثوں کے حوالے بھی شامل کرتی اور سارے سادہ لوح بے علم لوگ سر دھنتے بے شک، مجوب بیٹھے تھے۔

”امید ہے آج کی نشست سے آپ لوگوں کو بہت کچھ جاننے کا موقع ملا ہوگا۔“ وہ شال سنبھالتی اٹھیں۔

”نگینہ؟“

”جی باجی جی! حکم؟“ وہ فوراً آگے آئی۔

”سوغات تقسیم کرو، ہر ایک کو ملے کوئی خالی ہاتھ نہ جائے حویلی سے۔“ وہ حکم دے کر آگے بڑھ گئی تھیں۔

ہجوم میں بے ساختہ خوشی کی لہر دوڑی تھی، سارے با آواز بلند سلطانہ بی بی کو دعائیں دے رہے تھے۔ یہ آوازیں ایک نیم مُردہ وجود کے دماغ پر ضرب کی طرح پڑ رہی تھیں۔

اُن ادھ کھلی آنکھوں سے آنسو بہہ کر تکیے میں جذب ہوئے تھے۔

☆...... ☆...... ☆

راہداری سے گزرتی سلطانہ بیگم ٹھٹک کر رکی تھیں۔ داخلی دروازہ کھلا تھا اور اُس پار کے منظر نے اُن کو آگ لگادی تھی۔

تیس سالہ خوب صورت سی نازک سی فرخندہ بی

ٹھنی غوث علی شاہ کے قریب کھڑی ان کے کندھوں پر پیار سے ہاتھ ڈالے۔ اٹھلا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ اور وہ مسکرا کر اُسے دیکھ رہے تھے۔

(ہونہہ بالوں میں چاندی اُتر آئی، مگر کم عمر بیوی سے محبت کا بخار نہ اُتر سکا، کبھی مجھے تو اتنی محبت سے دیکھا نہیں؟ ہونہہ مجھے ایسے انداز اور ایسی ادائیں بھی کہاں آتی ہیں؟) وہ خود ہی سے سوال اور خود ہی سے جواب دے رہی تھیں۔

رقابت یونہی آگ لگاتی ہے وگرنہ وہ سوچتی تو بہت مشکل سے کوئی ایسا لمحہ ملتا جب وہ غوث علی شاہ کے قریب گئی ہوں یا اُن سے محبت سے بات کی ہو۔

غوث علی شاہ کو رخصت کر کے فرخندہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی سامنے سلطانہ کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

"بہت پر پرزے نکل آئے تمہارے...... کہاں تو شروع شروع میں دوپٹہ منہ میں دابے سہمی سہمی سی اس حویلی میں پھرتی تھی، لگتا ہے مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا۔" سلطانہ تمسخر اُڑاتے بولی تھی۔

"بیوی ہوں میں غوث علی شاہ کی۔" وہ ذرا کمزور پڑی تھی، مقابلے میں سلطانہ جیسی شخصیت کا ہونا کوئی عام بات نہ تھی، ان کی ذات میں کوئی عجیب سی طاقت اور کشش تھی۔

"ہونہہ بیوی!" سلطانہ قہقہہ لگاتی سر جھٹکتے مذاق اڑاتے بولی تھیں۔ "بی بی اس بھول میں مت رہنا، سارے پر کاٹ ڈالوں گی، تم مجھے ابھی صحیح طرح سے جانتی نہیں۔ پیر محی الدین کی بیٹی ہوں میں...... پورے خاندان میں ہمارے ہم پلہ کوئی نہیں نہ دولت میں اور نہ منصب میں...... تم اگر میری سوتن بنی ہو تو صرف میرے بابا پیر محی الدین کی وجہ سے، وگرنہ تم میں ہے ہی کیا سوائے خوب صورتی کے؟" سلطانہ طیش میں آ گئی تھیں۔

مارے توہین کے فرخندہ کا چہرہ سُلگ اُٹھا۔ (تم میری بیوی ہو کسی سے دبنے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں کوئی پتھر اُٹھائے تو تم اینٹ اُٹھا لینا، کمزور پڑنے کی ضرورت نہیں، سلطانہ طاقت ور سہی، پر میری بیوی ہے ماں نہیں، تم پر میری ماں کی اطاعت فرض ہے کیوں کہ وہ اس گھر کی بزرگ ہیں باقی کسی سے مت ڈرنا!!) اُسے غوث علی شاہ کی باتیں یاد آئیں تو خود ہی ہمت ملی۔

اُس نے پتھر کا جواب اینٹ دینے کی ٹھانی اور اینٹ اٹھالی۔

"ایک اور چیز بھی ہے میرے پاس جو آپ کے پاس نہیں۔" اس کی بدلتی کیفیت اور بدلے انداز سلطانہ کو ٹھٹکا گئے سوالیہ نظروں سے فرخندہ کو دیکھا۔

"میں اِس حویلی اور پیر غوث علی شاہ کو وارث دینے والی ہوں، وہ شے جو آپ اب تک نہ دے سکیں، فرق تو بہت واضح ہوا پھر ہم دونوں میں؟"

فرخندہ کی اینٹ کی ضرب نے سلطانہ کو لہولہان کر دیا تھا۔ وہ پتھر کا بُت بن گئی تھیں۔

فرخندہ ان کے پاس سے گزر کر جانے لگی تو ان کے پتھر ہوئے جسم میں حرکت ہوئی رُکو؟ حکمیہ لہجہ تھا۔

فرخندہ جو اُن سے دو قدم پیچھے تھی کوفت زدہ سانس خارج کرتے رُکی مگر پلٹی نہیں۔

"مجھے آپ کے منہ نہیں لگنا۔" یہ کہہ کر جانے لگی تھی کہ سلطانہ پلٹی اور اُسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف جھٹکے سے موڑا۔

فرخندہ کو لگا اس کا بازو کندھے سے جیسے الگ ہو گیا ہو۔

سلطانہ کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل نکل کر فرخندہ کو لپیٹ میں لینے لگیں، وہ تھوڑا خوفزدہ ہوئی تھی۔

"پیر غوث علی شاہ کی نام نہاد بیوی! اس بے عزتی کا بدلہ میں تم سے لے کر رہوں گی وہ بھی سود سمیت، جس وارث کو پیدا کرنے کے چکر میں تم اُٹھلا رہی ہو، اس کا تو وجود بھی نہ رہے گا مگر اس حویلی کی آئندہ نسلیں تمہارا نام لیتے ڈریں گی۔ اپنے انجام کا سوچو اور اُس وقت سے پناہ مانگو۔" سلطانہ زخمی ناگن بنی پھنکاری تھی اور جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا۔

ان کی آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔

"میرے انجام کا تعین کرنے والی آپ کون ہوتی ہیں؟ آپ طاقت ور سہی مگر ایک بڑی ہستی بھی ہے جو آپ سے ہر مظلوم کے ظلم کا بدلہ لے گی، اور وہ

ہستی آپ کی سوچ سے بھی زیادہ طاقت ور اور بڑی ہے۔'' اُس نے ہمت کر کے جواب دیا تھا۔
سلطانہ وہاں سے بغیر جواب دیے جا چکی تھی۔
فرخندہ نے اپنے بازو سے آستین ہٹا کر دیکھا، وہاں سلطانہ کی انگلیوں اور انگوٹھیوں سے نیل پڑ گئے تھے۔ تکلیف کی زیادتی سے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

سلطانہ، مظفر خان کے خط نکالے نئے سرے سے پڑھ رہی تھیں اور سرشاری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔
''باجی جی! دروازہ کھولیں باجی جی۔'' نگینہ اونچی آواز میں صدا دیتی دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔
''کیا آفت آ گئی...... کیے موت آ گئی جو یوں واویلا مچا رہی ہے کمینی۔'' وہ بکس میں سارے خط ڈال کر بند کرتی دروازے تک آئی اور دروازہ کھولا۔ سامنے حواس باختہ سی نگینہ کھڑی تھی۔
''بکو، کیا بات ہے؟'' وہ کھاٹ کھانے کو دوڑیں۔ (پیری کا عشق جو کہیں کا نہ رہنے دے، بے چاری سلطانہ)
''وہ بڑی بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے، پیر صاحب۔ ان کے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں، جلدی آئیں۔'' اُس نے پھولے سانس کے درمیان بات مکمل کی۔
''تو یہ کون سی نئی بات ہے، جو تم نے اتنا شور مچا رکھا تھا، بڑی بی کی طبیعت تو روز خراب ہوتی ہے اور دو منٹ میں پھر سے سنبھل جاتی ہے۔ یہ تو روز کا ڈرامہ ہے۔ سارے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔'' غصے سے کہہ کر انھوں نے نگینہ کے سر پر بھاری ہاتھ مارا اور بگڑے تیوروں سے شال ٹھیک کرتی باہر آئی تھیں۔
بڑے کمرے میں غوث علی شاہ اپنی بیمار معذور ماں کے پاس بیٹھے ان کا ہاتھ سہلا رہے تھے۔ بڑی بی جو فالج کا شکار تھیں بہت مشکلوں سے انھیں کچھ بتانے کی کوشش میں تھی۔
(یہ اور بات کہ غوث علی شاہ ان کے اشاروں کنایوں میں کہی باتوں کو سمجھ نہ سکے تھے، وہ ہر بار سلطانہ سے بے زاری ظاہر کرتیں اس کی شکایت کرنے کی کوشش کرتی تھیں)
''کیا ہوا بڑی بی بی کو؟ کیا بہت طبیعت خراب ہے۔'' سلطانہ اندر داخل ہو کر تشویش اور فکرمندی سے بولی تھیں۔
''اب طبیعت بہتر ہے، میں نے دوا کھلا دی ہے۔'' وہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔
سلطانہ نے غوث علی شاہ سے نگاہیں ہٹا کر پاس کھڑی فرخندہ کو ناگوار انداز سے دیکھا تھا۔
''آپ نے آج پھر بڑی بی کو دوا نہیں کھلائی۔ بہت افسوس ہوا۔ آپ تو بہت ذمہ دار طبیعت کی مالک ہیں پوری حویلی کے معاملات خوش اسلوبی سے چلا رہی ہیں۔ پھر کیوں آج کل آپ سے اس معاملے میں کوتاہیاں ہو رہی ہیں؟ آپ جانتی ہیں مجھے اپنی ماں سے کتنی محبت ہے، اور مجھے آپ سے زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں، تبھی ان کی ذمہ داری آپ کو دے کر میں باہر کے کام مطمئن ہو کر سنبھالتا ہوں۔'' وہ دُکھ سے بولے تھے۔ سلطانہ تھوڑا سا شرمندہ ہوئی تھیں۔
آپ جانتے تو ہیں، اتنی بڑی حویلی کے انتظامات مجھے ہی سنبھالنے پڑتے ہیں۔ پھر گاؤں کے لوگوں کے معاملات، ہر آئے گئے کا خیال، بس صبح سے جو مصروف ہوتی ہوں تو سر کھجانے کی بھی مہلت نہیں ملتی، وگرنہ آپ جانتے ہیں۔ پچھلے بیس برسوں میں، میں نے کیسے ہر کام سنبھال رکھا ہے، اس بات کے آپ بھی گواہ ہیں۔'' کون سا مہرہ کس وقت کیسے استعمال کرنا ہے یہ سلطانہ سے بہتر کون جانتا تھا۔
پیر غوث علی شاہ قائل ہو گئے۔
''یہ تو میں بخوبی جانتا ہوں، تایا پیر محی الدین مرحوم نے اس حویلی کے لیے بالکل صحیح آپ کا انتخاب کیا تھا، اپنے پرکھوں کی ہر روایت کو آپ نے اب تک زندہ رکھا ہے، آپ کی ذہانت کا تو سارا گاؤں گواہ ہے۔'' وہ غصہ سے بولے۔
سلطانہ اُن لوگوں میں سے تھی جو سامنے تو گڑ کی طرح میٹھے ہوتے ہیں، مگر وار ہمیشہ پیٹھ پر کرنے کے قائل ہوتے ہیں، اُس نے بھی ساری زندگی گڑ بن کر

غوث علی شاہ کی جڑیں کھائی تھیں۔
وہ معصوم سادہ سے انسان سلطانہ کے دوسرے مکروہ روپ سے ناواقف تھے۔
''شاہ صاحب اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک بات عرض کروں؟'' فرخندہ نے بالآخر خاموشی کو توڑا۔
''بولو...... بابا اجازت کی کیا بات ہے۔'' وہ محبت سے بولے تھے۔
''میں سارا دن فارغ رہتی ہوں، اگر بڑی بی بی کی ذمہ داری مجھے دی جائے تو میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔ بزرگوں کی خدمت ہی ہمارے خاندان کی شان ہے۔'' وہ اپنائیت سے بولی تھی۔
''بات تو سو فیصد درست کہی تم نے فرخندہ! آپ کیا کہتی ہیں؟'' وہ اب سلطانہ کی سمت متوجہ ہوئے۔
''جو آپ مناسب سمجھیں۔'' اندر سے اُس کی چالاکی پر تلملا تھیں مگر بظاہر مسکرا کر بولی تھیں۔
''تو ٹھیک ہے۔ فرخندہ اب تم نے بڑی بی بی کی خدمت کرنی ہے۔ ان کا خیال رکھنا ہے۔ سلطانہ نے اتنے برسوں میں اچھی طرح اپنی ذمہ داری پوری کی اب اسے آرام ملنا چاہیے۔'' وہ مسکرائے۔
''بڑی بی بی نے خوش ہو کر ہاتھ بڑھانا چاہا کچھ بیماری کی نقاہت، ہاتھ واپس نیچے جا پڑا جو غوث علی شاہ نے محبت سے تھام کر اپنے سر پر رکھا اور ان کی دعائیں لی تھیں۔
سلطانہ جیسی بلا سے ان کی جان چھوٹی تھی، وہ جتنا خوش ہوتیں کم تھا۔ فرخندہ نے آگے بڑھ کر سر نیچے کیا، بڑی بی بی نے محبت سے ان کا سر چوما۔
وہ سیدھی ہوئی تو جتاتی نظروں سے سلطانہ کو دیکھا، ان کی تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔
'تمہارا تو اب کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا، پَر لمبے کر لیے ہیں، اس سے پہلے کہ اونچی اُڑان بھرو، تمہارے پَر کاٹ کر تمھیں اڑنے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گی، تب تمھیں یاد آئے گا اور پچھتاؤ گی، سلطانہ سے دشمنی تمھیں بہت مہنگی پڑے گی فرخندہ بیگم۔' غوث علی شاہ کمرے سے نکل گئے۔ فرخندہ بھی ان کے پیچھے گئی تھی۔
''تم جاؤ میں ابھی آتی ہوں۔'' سلطانہ نے نگینہ کو حکم دیا وہ فوراً سر ہلاتی چلی گئی تھی۔
سلطانہ قدم قدم چلتی بڑی بی بی تک آئیں۔ انھوں نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔
''کس حال تک پہنچ گئی ہو تم بڑی بی بی، مگر اکڑ ویسے کی ویسے ہی ہے۔ افسوس کہ تم بول نہیں سکتی ہو، اگر بول بھی لیتیں تو میرا کچھ نہیں بگڑتا، کون تمہارا یقین کرتا؟ میں جو کرتی ہوں بڑی صفائی سے کرتی ہوں، اپنے بیٹے اور نام نہاد بہو کے زعم میں یہ مت سمجھنا تم مجھ سے میری طاقت چھین لوگی۔ وہ دونوں میری بساط پہ بچھے مہرے ہیں۔ جب چاہوں، انھیں پیٹ سکتی ہوں۔ شہ اور مات میرے ہاتھوں میں ہے، آخری بار کہہ رہی ہوں میرے راستے میں مت آؤ، تم کمزور ہو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ نہیں تو تمھیں ختم کرنے میں مجھے سیکنڈ بھی نہیں لگے گا۔''
ان کی آخری بات نے بڑی بی بی کو کپکپا کر رکھ دیا اور منہ ان کی طرف موڑ کر دیکھا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔
افسوس اور ملامت کے آنسو۔ کہ ان کے خاندان میں ایسی زہریلی ناگن کیسے پیدا ہوگئی تھی۔

☆☆☆

''نگینہ، منشی کو بلاؤ، مجھے کچھ ضروری حساب کتاب کرنا ہے۔'' سلطانہ بہت عجلت اور بے تابی میں نظر آ رہی تھی۔ نگینہ سر ہلاتی تیزی سے گئی تھی اور پندرہ بیس منٹ بعد منشی سمیت واپس آئی تھی۔
کھڑکی میں کھڑی سلطانہ نے منشی کو دیکھا تو شال درست کرتی نیچے باغ کی طرف آئی تھیں۔
''تم جاؤ۔'' نگینہ کو حکم ہوا وہ چلی گئی۔
''سلام بی بی جی۔'' وہ ہاتھ باندھے سر جھکائے کانپتے ہوئے بولا۔
(جانے حساب کتاب میں پھر سے کیا غلطی ہوگئی جو انھوں نے اتنی جلدی پیشی کے لیے بلایا تھا؟) اُس کا ڈر سچا تھا۔
''تم سے ایک ضروری کام تھا، تمہارے سوا کسی

پر بھروسہ کرنے کو دل نہیں مانا، امید ہے میری توقع پر پورا اُترو گے، کام بڑا ہے، راز داری شرط۔ بڑے کام کا بڑا معاوضہ بھی دوں گی۔ اگر کر سکے تو؟'' سلطانہ نے پتا پھینکا۔

وہ بے چارہ غلام تھا انکار کر کے موت کو گلے لگانا تھا کیا۔ فوراً حامی بھر لی۔

جو آپ کا حکم، جان مانگیں گی تو وہ بھی حاضر ہے، برسوں آپ کا نمک کھایا، آپ کے کام نہ آ کر نمک حرامی تھوڑی کرنی ہے۔'' وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔

''یہ تو تم نے سولہ آنے درست بات کی ہے، کام ہی بڑی راز داری والا ہے۔''

''آپ حکم کریں؟'' وہ ان کی بات پر نہایت ادب سے بولا تھا۔

''پیر غوث علی شاہ کی دوسری بیوی فرخندہ کا چچا زاد، جو اس کے بچپن کا منگیتر بھی تھا معظم علی...... مجھے اُس سے ملنا ہے۔ مگر یہاں۔۔۔ حویلی کے حدود سے ذرا دور اور یہ ملاقات جتنی جلدی ہو، اتنی ہی اچھی بات ہوگی، بولو انتظام کر دو گے؟'' وہ حکمیہ بولیں۔

''خیریت تو ہے بی بی! معظم علی سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟؟'' وہ منمنایا۔

''حد میں رہو...... یہ مت بھولو کہ تم ہمارے غلام ہو اور غلام مالکوں سے سوال نہیں کرتے۔'' وہ حسب عادت جلد طیش میں آ گئی تھیں۔

''غلطی ہوگئی بی بی...... معاف کر دیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' وہ گھبرا کر بولا تھا۔

''یہ کام آج دوپہر تک ہو جانا چاہیے۔'' وہ کہہ کر جا چکی تھیں۔ شامت منشی کی آ گئی اگر غوث علی شاہ کو بھنک بھی پڑ جاتی، اس کا زندہ بچنا ممکن نہ تھا۔

☆☆☆

''بدلے کی آگ میں جلنا کیسا ہے، مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا معظم علی۔ بچپن کی منگنی کو ذرا سی خاندانی چپقلش کی وجہ سے توڑ دینا چھوٹی بات نہیں۔ تمہاری غیرت اور عزت کا سوال تھا، تم تو پھر اچھے تھے کہ بزرگوں کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی گئے، اب بھی وقت ہے، میرا ساتھ دو گے تو وہ کبھی کسی کا گھر نہ بسا پائے گی، تمھیں اجاڑ کر بھلا وہ کیسے خود سے بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ ہنسی خوشی رہ سکتی ہے۔'' سلطانہ اُسے بھڑکانا چاہتی تھی، وہ تو جیسے پہلے سے ہی جلتے توے پر بیٹھا تھا۔

''ایسا بدلہ لوں گا اُس سے اور اس کے بھائیوں سے کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔'' اس کے منہ سے آگ نکلی تھی۔

سلطانہ کے کلیجے میں ٹھنڈ اُتر آئی۔

''تمھیں خود کو ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں میں جو کہوں بس اُس پر عمل کرتے جاؤ، باقی سارا کام میرا دیکھنا کیسے دنوں میں اُسے اور اُس کی ہنستے بستے گھر کو اجاڑتی ہوں۔''

''آپ واقعی ایک بہادر اور ذہین عورت ہیں، جتنا سنا تھا اُس سے بڑھ کر پایا ہے۔'' وہ متاثر نظر آیا۔

میرے ساتھ مل کر کام کرو گے تو تمھاری ذہانت دوچند ہو جائے گی۔'' ان کی بات پر معظم علی نے قہقہہ لگایا تھا۔

☆☆☆

فرخندہ کی حرکات وسکنات آج کل غوث علی شاہ کو پل پل چونکا رہی تھیں۔ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی تھی۔ اکثر ایسے ہڑبڑا جاتی جیسے اچانک اُسے نیند سے بیدار کیا گیا ہو، سلطانہ تیلی جلا کر اب خاموشی سے تیل کی دھار دیکھتی جا رہی تھیں۔

وقت آنے پر انھوں نے اپنا حصہ بھی ڈالنا تھا مگر فی الحال وہ خاموش تھیں۔

آج بھی وہ غوث علی شاہ کے ساتھ ناشتا کر رہی تھیں۔ فرخندہ کافی دیر سے فون پر کسی سے بحث کر رہی تھی۔

آواز تو اتنی دور سے سنائی نہ دے رہی تھی مگر اس کی حرکات اور چہرے کے زاویوں سے معلوم پڑ رہا تھا۔

''دیکھیں تو ذرا آج کل اس کے کچھ زیادہ ہی فون نہیں آنے لگے؟ جب دیکھو فون پر لگی رہتی ہے یا کسی نہ کسی بہانے حویلی سے نکل پڑتی ہے۔ آپ

معلوم تو کریں خیریت ہے؟" وہ شیطانی سے کہتی آخر میں فکر سے بولیں۔ ان کی بات نے غوث علی شاہ کو سوچ میں ڈال دیا۔

"مجھے بھی یہ آج کل کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔ کافی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں، سوچا تھا شاید میرا وہم ہو۔" تیر نشانے پر لگا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل سے لاؤنج میں رکھا فون اور جگہ واضح دکھائی دے رہی تھی، وہ فون رکھ کر چہرے پر ہاتھ پھیرتی خوفزدہ سے انداز میں دائیں بائیں دیکھ کر ناشتے کے لیے جھکی نظروں سے سلام کر کے سلطانہ کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

"خیریت؟ کس کا فون تھا؟ اور تمہاری رنگت کیوں پیلی پڑ رہی ہے؟" غوث علی شاہ کا انداز تشویش بھرا تھا۔

"نن نہیں تو...... خیریت ہی ہے...... کیا ہونا ہے مجھے؟" وہ منہ پر ہاتھ دھرتے خوفزدہ ہوئی۔

صاف لگ رہا تھا وہ کچھ چھپانے کی کوششوں میں ہے۔ بھلا اُن جیسے زیرک عمر رسیدہ شخص سے کیسے کچھ پوشیدہ رہتا۔ سب صاف صاف نظر آرہا تھا۔

"فون کس کا تھا؟" اب کی بار اُن کا لہجہ بدل چکا تھا۔

سلطانہ کا جی چاہا قہقہے لگا کر خوشی منائے مگر لب بھینچ گئیں۔

"وہ...... میری سہیلی تھی۔" اُس نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری تھی۔ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی وہ گناہ گار ثابت ہو رہی تھی، موت کا مقام تھا، مگر وہ بے بس تھی۔

"کون سی سہیلی، پچھلے دو سالوں میں مجھے یاد نہیں پڑتا تمہاری ایسی کوئی سہیلی تھی جو تمہیں دن میں کئی کئی بار فون کرے؟" شک کے ناگ کو موقع مل گیا تھا۔ غوث علی شاہ کو دل پر ڈسا تھا اور ٹھیک وقت پر ڈسا تھا۔

وہ ہے میری ایک سہیلی، بچپن کی دوستی ہے، کافی عرصہ سے ہمارا رابطہ نہیں تو اب اکثر ہم بات کر لیتے ہیں۔" اُس سے بات بھی ٹھیک سے نہیں ہو پائی۔

"بات کہاں کرتی ہو؟ مجھے تو لگتا ہے بس جھگڑتی ہی رہتی ہو۔" سلطانہ نے پتا پھینکا۔

فرخندہ کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹنے لگی۔

غوث علی شاہ نے جواب میں کچھ نہ کہا کرسی دھکیلتے اُٹھے اور بغیر ناشتا کیے چلے گئے۔

فرخندہ بمشکل آنسو ضبط کرتی اوپر کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ سلطانہ نے مزے سے ناشتا مکمل کیا اور کمرے میں آکر دروازہ لاک کر کے مظفر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

"اجازت ہو تو میں بھی شامل آ کے اُن میں ہو جاؤں۔

سنا ہے کل تیرے در پہ ہجوم عاشقاں ہوگا۔"

"واہ تمہاری یہی ادائیں تو مجھے اچھی لگتی ہیں۔ بہت چالاک ہو مظفر، ہر حال میں جان جاتے ہو کہ میرے دل میں کیا ہے۔" سلطانہ بہت خوش تھیں۔

"تو کب مل رہی ہو پھر؟" وہ لطف لیتے بولا۔

آج کل میں بڑی بی بی کا پتا کٹ جائے گا، بس یہی آخری مہرہ بچا ہے، فرخندہ کو تو پھر آسانی سے انگلیوں میں مسل کر ختم کر لوں گی، یہی دو کانٹے بچے ہیں۔" "اور غوث علی شاہ؟" مظفر ٹھٹکا۔ آخر کو رقیب تھا۔

جب سب کچھ ختم ہو جائے گا تو بھلا رسوائی کیسے جینے دے گی۔ وہ تو پھر خود ہی ختم ہو جائے گا اور پھر ہمارے خاندان کا آخری چراغ ہے وہ۔ اُسے ختم کر کے کیوں بزرگوں کی بددعائیں لوں...... یہ گناہ مجھ سے نہیں ہوگا۔" وہ آخری جملے پہ غمگین سی آواز نکالتی بولی تھیں۔

"کتنی ذلالت ہے تم میں، اور دِکھتی کتنی شریف ہو، واہ بھئی واہ تمہیں تو اتنی بہترین اداکاری پر سرکاری اعزاز ملنا چاہیے۔" وہ مکاری سے بولا تھا۔

کافی دیر تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ فون بند کر کے وہ الماری کی طرف بڑھنے لگیں کہ دوبارہ فون بجنے لگا۔ معظم علی کی کال تھی۔ انھوں نے کان سے موبائل لگایا۔

"معظم علی کل تیار رہنا تمہارا انتظار آخری مرحلے میں ہے، غوث علی شاہ پوری طرح اُس سے

بدظن ہوچکا ہے اور تمھیں اس کے قریب دیکھ کر یہ شک بھی یقین میں بدل جائے گا، آخر کو تمھاری اس سے محبت کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں، کل جمعہ ہے مزار پہ حاضری دینے جانا ہے۔ فرخندہ پہلے جائے گی تم وہاں موجود رہنا، میں غوث علی شاہ کے ساتھ عین ٹائم پر پہنچ جاؤں گی، مگر یاد رہے...... تمھیں فرخندہ کے نزدیک آنا ہوگا۔ اتنا نزدیک کہ غوث علی شاہ بغیر سوچے سمجھے اُسے جان سے مار ڈالے۔'' وہ نفرت سے بولی تھیں۔ ''میں تیار ہوں، پوری طرح سے تیار۔'' وہ گہری سانس لیتا فون بند کر گیا۔

☆☆☆

''میں نے کہا میرا راستہ چھوڑو۔ کیا ہے یہ سب؟ اب کیوں میرے راستے میں آکر مجھے رُسوا کرنا چاہتے ہو۔ کیوں ایسا کررہے ہو میرے ساتھ؟'' فرخندہ مزار کے احاطے میں اک طرف کھڑی تھی۔

معظم علی اُس کے سامنے تھا، وہ چیخ نہیں سکتی تھی اُسے گریبان سے نہیں پکڑ سکتی تھی۔ جس شخص نے اس کی زندگی اُس پر تنگ کررکھی تھی وہ لوگوں کا خیال اور اپنی عزت کی وجہ سے اُس کو کچھ کہہ بھی نہیں پارہی تھی۔

''میں تم سے آج بھی بہت محبت کرتا ہوں فرخندہ...... میرا یقین کرو، تم کسی سے مت ڈرو۔ تمھیں غوث علی شاہ سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں ہوں تمھارے ساتھ، ہمیں کوئی جدا نہیں کرسکتا۔ ایک بار میری بات مان لو۔'' وہ التجائیہ لہجے میں بولا تھا۔

''بکواس بند کرو۔ ہوش میں تو ہو؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ بمشکل نیچی آواز میں غرائی تھی۔

غصے کی زیادتی سے اس کا نازک وجود کانپ رہا تھا۔ ''اپنی گندی زبان سے میرا یا میرے شوہر کا نام ناں لینا دوبارہ۔ لعنت ہے تم جیسی گندی ذہنیت والے شخص پہ، میرا تم سے کوئی لینا دینا نہیں، آئندہ میرے راستے میں مت آنا۔ تمھارے لیے اچھا نہیں ہوگا سمجھے تم؟'' وہ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتی۔ دائیں طرف سے نکلنے لگی کہ معظم نے پھر سے اس کا راستہ روکا۔

''ہٹو سامنے سے۔ مجھے تمھاری صورت سے بھی نفرت ہے۔'' وہ نفرت سے بولی تھی۔

''مگر مجھے تم سے آج بھی اتنی ہی محبت ہے۔ بہت محبت۔'' اُس نے فرخندہ کے دونوں ہاتھ تھامے تھے۔

اب کی بار فرخندہ پتھر بن گئی تھی معظم کی حرکت نے نہیں کسی اور بات نے اُسے بت بنایا تھا۔ اُس نے فرخندہ کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔

غوث علی شاہ، سلطانہ کے پہلو میں گم صم سے کھڑے انہی کی طرف متوجہ تھے۔ فرخندہ کے ساتھ معظم کو دیکھ کر ان کا چہرہ تاریک پڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا یا کرتا غوث علی شاہ پیچھے کھڑی گاڑی میں بیٹھے تھے اور آندھی طوفانوں کی طرح چلے گئے۔

معظم علی نے برف بنی فرخندہ کے ہاتھ چھوڑ دیے، وہ وہیں کسی بے کس خالی ہاتھ فقیرنی کی طرح زمین پر گری رونے لگی۔

معظم اور سلطانہ میں نظروں کا تبادلہ ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ سلطانہ، فرخندہ کے پاس آکر اُسے سہارا دیے اٹھانے لگی تھیں۔ مقصد پورا ہوچکا تھا۔

☆☆☆

''یوں لگ رہا ہے بھرے مجمع میں کسی نے میرے منہ پر کالک مَل دی ہو، خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں اِس لمحے زندہ نہ ہوتا۔'' غوث علی شاہ کا لہجہ بہت شکست خوردہ تھا۔

''ایسے باتیں مت کریں، اِس خاندان کے وارث ہیں آپ، اکلوتے بیٹے، آپ کو ایسی مایوسی کی باتیں زیب نہیں دیتی۔'' سلطانہ نے انھیں تسلی دی تھی۔ وہ خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔

''سلطانہ؟'' خاموشی بھرا سکوت ان کی بھاری آواز سے ٹوٹا۔

''جی!'' وہ دھڑکتے دل سے منتظر تھیں۔

آر یا پار فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چاہتی تو سفاک سے سفاک بات کرکے انھیں قائل کرسکتی تھیں۔

"آپ لوگوں کے فیصلے کرتی ہیں، گاؤں کا ہر فیصلہ آپ کی مرضی سے ہوتا ہے، اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟" ان کی بات پر وہ کچھ پل کے لیے ست رہ گئی۔
"بولیے؟" وہ بے تابی سے بولے تھے۔
"آپ کو برا نہ لگ جائے۔" وہ جھجکیں تھی۔
"میرا دل ہَول رہا ہے، اگر آپ کچھ جانتی ہیں تو بلا جھجک کہہ دیں، میں سہہ لوں گا۔" ان کی آواز ذرا سی کانپی تھی۔
سلطانہ کو ان جیسے مضبوط شخص کی یہ کمزوری کچھ عجیب سی لگی تھی۔
"آپ کے جانے کے بعد میں نے معظم علی سے بات کی تھی کافی برا بھلا کہا، وہ قسم کھانے کو تیار ہے کہ اکیلا وہ گناہ گار نہیں، فرخندہ خود اسے فون کر کے ملنے پر مجبور کرتی ہے۔"
"اور یہ ملاقاتوں کا سلسلہ کب سے جاری ہے؟" آواز جیسے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔
"کافی عرصے سے......" وہ خاموش ہوئیں تھوڑا وقفہ لیا، اور یہ ملاقاتیں۔" صرف دن تک ہی محدود نہیں رات کے اندھیرے میں فرخندہ ملنے جاتی ہے معظم علی سے۔" سلطانہ نے بات بمشکل مکمل کی تھی۔
یہ بات نہیں تھی بھالا تھا جو کسی نے غوث علی شاہ کے عین دل پر پیوست کیا تھا۔ انھوں نے مضبوطی سے سینہ تھاما، یوں لگ رہا تھا کہ ان کے دل سے خون ابل ابل کر بہہ رہا ہو۔
"مجھے لگتا ہے جس وارث کو وہ پیر خاندان کا کہہ رہی ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔" سلطانہ نے بال آخر تابوت پہ آخری کیل ٹھونک ہی دی۔
"گاؤں کے ایسے کسی مسئلے میں آپ کیا فیصلہ کرتی ہیں؟" ان کی آنکھیں نم ہوئیں۔
"میں کسی انگریزی قانون کو نہیں مانتی، ہمارے گاؤں میں بابا مرحوم اسلامی حدود نافذ کر گئے تھے، میں اب بھی اسی قانون پر عمل کرتی ہوں، آپ نے کبھی دلچسپی لینے کی کوشش بھی نہ کی...... کتنے بے خبر رہے آپ۔" وہ افسوس سے بولیں۔
"اسی بے خبری نے تو آج یہ دن دکھایا ہے۔" وہ کہہ کر بیڈ پر لیٹ گئے اور آنکھیں موند لیں۔
"اس موضوع پر پھر کبھی بات ہوگی، ابھی اس سے کہہ دیں، میرے سامنے نہ آئے۔" وہ آنکھیں بند کیے ہی گویا ہوئے تھے۔
سلطانہ نے ساری لائٹیں آف کیں اور کمرے سے نکل آئیں۔ اس رات فرخندہ ان کے پاس آئی تھی بہت رو رہی تھی۔ ان سے مدد کی بھیک بھی مانگی۔ مگر انھوں نے دھتکار دیا، غوث علی شاہ کی بات من وعن دہرائی، وہ بہت نڈھال سی ان کے کمرے سے نکلی تھی۔

☆☆☆

"نگینہ یہ شور کیسا ہے۔" سلطانہ سیدھی ہوئیں، نگینہ جوان کی ٹانگیں دبا رہی تھی باہر کی طرف بھاگی۔
سلطانہ تب تک بیڈ سے اتر کر دوپٹہ ٹھیک کیے تیار کھڑی تھیں۔
"باجی جی! پیر صاحب نے فرخندہ بی بی کو بہت مارا ہے، وہ رو رو کر معافی مانگ رہی ہیں، مگر صاحب بہت غصے میں ہے۔" وہ حواس باختہ سی بولی تھی۔
سلطانہ باہر آئیں، تو فرخندہ کو غوث علی شاہ کے قدموں میں گرے روتے پایا۔ وہ گریہ کر رہی تھی۔
"پیر صاحب میں بے گناہ ہوں، یہ بہتان ہے جھوٹ ہے، میں معصوم ہوں، آپ کے سوا بھی کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ وہ شخص جھوٹ کہہ رہا ہے۔ میری کوکھ میں پیر خاندان کا وارث پل رہا ہے کوئی گندا خون نہیں۔ میرا یقین کریں۔" غوث علی شاہ نے اسے پیر کی ٹھوکر سے پرے کیا تھا۔
"سلطانہ اس بدذات عورت سے کہو، چلی جائے میرے سامنے سے، مجھے اس کی صورت سے بھی نفرت ہے۔ چاہے یہ کتنی صفائیاں دے، جھوٹی قسمیں کھائے مجھے اس کا یقین نہیں۔ یہ میری نظروں سے گر چکی ہے۔" وہ سلطانہ بیگم سے مخاطب ہوئے تھے۔
"شادی شدہ عورت جب زنا کرتی ہے تو اس پر کیا حد لگتی ہے ذرا یہ بھی بتا دیں اس بے شرم اور ڈھیٹ عورت کو۔" ان کی بات پر فرخندہ مزید تڑپی تھی۔
"نہیں پیر صاحب خدا کے لیے مجھ پر ایسی تہمت

مت لگائیں۔ میں زانیہ نہیں۔ معصوم ہوں۔ رحم کریں۔''
غوث علی شاہ نے اس کی گریہ وزاری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے یہ کہہ کر حقارت سے اس سے منہ پھیرا تھا۔
''شادی شدہ مرد و عورت کے لیے سنگساری کا حکم ہے، اور یہ سنگساری عبرت کے لیے کچھ لوگوں کے سامنے یعنی کھلے مجمع میں دی جائے گی۔ معظم علی کو سو کوڑے لگیں گے اور فرخندہ کو سنگسار کیا جائے گا، مگر فرخندہ تو ماں بننے والی ہے اور بچے کی پیدائش تک اسے ہم سنگسار نہیں کرسکتے۔'' سلطانہ نے سفاکی کی حد کردی تھی فرخندہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔
غوث علی شاہ نے اپنی سرخ آنکھیں نکالیں۔
''مجھے اس بچے سے کوئی سروکار نہیں۔ آج میں شہر سے باہر جارہا ہوں ایک ضروری کام سے۔ سلطانہ آپ انتظام کردیں، خاندان کے لوگ اور گاؤں کے کچھ لوگوں کو تیار کرلیجے یہ سزا کل ہی دی جائے گی۔ اس جیسی عورت کا انجام ہر کوئی دیکھے گا۔ جس نے ہمارے خاندان پر بٹا لگادیا۔ پیر خاندان کو سر اٹھانے کے لائق نہ چھوڑا۔ کل تک میں واپس آجاؤں گا انتظام ہر صورت کل ہونا چاہیے۔ میں مزید اسے اس حویلی میں برداشت نہیں کروں گا۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے جاچکے تھے۔
''میں اِس انجام کی حق دار نہیں۔ میرا یقین کریں۔ آپ چار گواہ لائے بغیر مجھ پر ایسا سنگین جرم ثابت نہیں کرسکتے۔ مت کریں ایسا۔ نفرت کی آگ خود پر اتنی مت حاوی کریں۔ روز حشر کیا جواب دیں گے اللہ کو۔ پلیز مجھے وقت دیں۔ یوں رسوا مت کریں مجھے۔ میں بری عورت نہیں ہوں۔'' وہ زاروقطار روتی واویلا مچا رہی تھی۔
سلطانہ بھی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

غوث علی شاہ جانے کی تیاریوں میں تھے، سلطانہ انھیں مصروف پاکر بڑی بی بی کے کمرے میں چلی آئیں۔ آج تو ان کا پتا صاف کردوں۔ آج یہ، کل فرخندہ۔ دونوں کانٹے نکل جائیں تو راستہ صاف ہوگا، پھر مجھے اور مظفر کو کوئی الگ نہیں کرسکے گا۔ یہ چھپ چھپ کر ملنا بھی ختم، میں اب تھک گئی ہوں۔ مزید یہ چھپن چھپائی نہیں کھیل سکتی۔ یہ کھیل اب ختم ہونا چاہیے۔'' وہ نیم اندھیرے میں تکیہ اُٹھا کر بڑی بی بی تک آئیں وہ سکون کی نیند سو رہی تھیں۔
''تمھارا پتا کٹ چکا بڑی بی، یہ آخری لمحے ہیں۔ اب آنکھ اگلے جہان ہی کھلے گی تمھاری۔'' وہ جھکی اس سے پہلے کہ تکیہ اُن کے منہ پر رکھتیں دروازے پر کھٹکا ہوا تھا۔ وہ سیدھی ہوئیں چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔
''ارے آپ...... اس وقت یہاں؟'' غوث علی شاہ کو دیکھ کر وہ سنبھلتے بولی تھیں۔
''جی میں فلائٹ کے لیے نکلنے ہی لگا تھا۔ سوچا بڑی بی بی سے مل لوں، سو رہی ہیں؟'' وہ آگے آئے تھے۔
''جی بس میں یہی دیکھنے آئی تھی، سکون سے سو رہی ہیں، میں نے وقت پر دوا کھلادی تھی۔'' وہ لہجے کو نارمل کرتے بولیں۔
ایک آپ ہی تو ہیں اس حویلی میں سب کا خیال رکھنے والی...... ہم تو خود سے بھی غافل ہیں۔'' وہ اداسی سے بولے اور ماں کے پاس آکر ان کا ماتھا چوما۔
''میں جارہا ہوں، کل صبح تک واپسی ہوگی، تب تک حویلی اور اُس میں رہنے والوں کا خیال رکھیے گا۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ نکل گئے، سلطانہ ان کے پیچھے لپکی تھیں۔
انھیں رخصت کر کے جب وہ اندر کی طرف آئیں تو فون بج رہا تھا۔ پوری حویلی میں ہُو کا عالم تھا، ہر طرف اُداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔
''اس وقت کون ہے؟'' انھوں نے فون اٹھایا۔
دوسری طرف سے مظفر تھا۔ وہ حویلی کے باہر کھڑا، اندر آنے کی اجازت چاہ رہا تھا۔
''تم واپس چلے جاؤ...... پہلے ہی ہم پر مصیبت آئی ہوئی ہے، دو تین دن تک مزید صبر کرلو۔ پھر انتظار ختم۔'' وہ کوفت سے بولی تھیں۔
''تم جانتی ہو میں ضد کا پکا ہوں، اور اب تو پیر غوث علی شاہ بھی چلا گیا، حویلی میں کوئی نہیں ہے جس کا ڈر ہو...... وہ دو کمزور عورتیں ہمارا کیا بگاڑ لیں گی؟'' وہ

بشاش لہجے میں بولا تھا۔
''کچھ دن انتظار نہیں کر سکتے تم؟'' وہ ڈانٹتے ہوئے بولیں۔
''نہیں...... کچھ دن تو کیا ایک لمحہ، ایک پل بھی نہیں۔ یہ صرف خالی خولی دھمکی نہیں۔ بھلے تم فون بند کر لو۔ دروازہ مت کھولو۔ مگر میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہلوں گا۔ پھر دیتی رہنا لوگوں کو جواب۔ میں کون ہوں اور تم سے میرا کیا تعلق ہے۔'' اس نے لاڈ سے کہتے قہقہہ لگایا تھا۔
''ذلیل انسان رکو وہیں رہنا، میں آ کر دروازہ کھولتی ہوں، جانتے ہو تمہاری کوئی بات رَد نہیں کرتی...... اس لیے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو میری محبت کا۔'' اُس نے مصنوعی غصہ دکھایا دو تین باتیں کیں اور فون بند کر کے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتی داخلی دروازے کی طرف آئیں۔
بہت راز داری سے محتاط سی وہ اُسے اپنے کمرے تک لائی تھیں۔ وہ پہلی بار نہ آیا تھا وہ حویلی کے ایک ایک چپے چپے سے واقف تھا۔ پچھلے برسوں میں کئی بار وہ یہاں آ چکا تھا۔
مگر آج کی رات کچھ عجیب سی تھی، سلطانہ اس کی آمد سے خوش تھیں مگر عجیب سی بے چینی نے دل کو گھیر رکھا تھا۔ ظاہری طور پر تو وہ مظفر کی سحر انگیز شخصیت کو دیکھ کے بہل گئی تھیں۔
اچانک سے موسم کے تیور بدلے تھے، بادل گرجنے لگے، بجلی کی چمک کانوں کے پردے تک چیر رہی تھی۔
''دیکھو ذرا...... میں اتنے ظالم موسم میں اپنی محبت سے ملنے آیا ہوں، وہ دیکھو بارش شروع ہو گئی۔ کتنی طوفانی بارش ہے یہ۔ جان ہتھیلی پہ رکھے میں سر پر کفن اوڑھے بغیر اپنی پرواہ کیے تم تک آ گیا، تم مجھے ٹالتی رہیں مگر میں آ ہی گیا۔ بہت گلہ ہے تم سے۔ بدلنے لگی ہو اب تم، کہیں مجھے چھوڑ کے اُس غوث علی شاہ سے تو محبت نہیں ہو گئی تمھیں؟'' موسم نے اس کے شاعرانہ مزاج پر اثر کیا تھا۔
''غوث علی شاہ سے محبت کرنے لگیں میرے دشمن۔ آئندہ مجھے ایسی گالی مت دینا۔'' سر سے دوپٹہ گرایا اور وہ ان کے گھنے لمبے بالوں کی چوٹی کے بل کھولنے لگا۔
''مجھے تمہارے ساتھ ساتھ، تمہارے بالوں سے بھی عشق ہے۔ آج تک میں نے کسی عورت کے اتنے حسین بال نہیں دیکھے، یا شاید تم ہو ہی اتنی خوب صورت کہ مجھے مبہوت کر دیتی ہو۔'' اس کا لہجہ بدلنے لگا۔
''تمہاری یہ دیوانگی ہی تو ہے، جس نے مجھے باندھ رکھا ہے، وگرنہ میرے بال آج تک پیر غوث علی شاہ تک نے نہیں دیکھے، تمہارا میرے لیے جنون ہی دراصل میرا عشق ہے، میری آج تک کسی نے ایسی تعریف نہیں کی۔ نہ ہی کسی نے ایسا حق جتایا۔ جیسے تم میری ذات کو معتبر کر دیتے ہو، میرے لیے والہانہ پن جھلکاتے ہو، میں اول روز کی طرح آج بھی صرف تمہاری ہوں۔ تمہاری سنگت مجھے وہی کم عمر سلطانہ محی الدین بنا دیتی ہے۔'' وہ سرشار تھی۔
''ہم نے یہ حق کسی کو دیا ہوتا تو حق جتاتا وہ بیچارہ۔'' مظفر نے ان کی چوٹی کا آخری بل کھولا اور جھٹکا دے کر بالوں کو بکھرا دیا۔
گھنے لمبے بالوں نے ان کے پورے وجود کو ڈھانپ لیا۔
''آج میں بڑی بی بی کو ختم کرنے لگی تھی کہ عین ٹائم پر غوث علی شاہ پہنچ گئے اور میں ہاتھ ملتی رہ گئی۔ تمہاری محبت نے مجھے کتنا ظالم بنا دیا ہے۔ فرخندہ بھی کل سنگسار ہو جائے گی، مجھ سے مقابلہ کرنے چلی تھی۔ پیر خاندان کا وارث کیا پیدا کرتی میں نے اُسے کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ چھوڑا۔ پھر ہم دونوں ہی ہوں گے، پیر صاحب اپنے زخم اکیلے بیٹھ کر چاٹتے رہیں گے۔'' انھوں نے قہقہہ لگایا۔
''اور وہ فرخندہ کا منگیتر جسے تم نے اس کے پیچھے لگایا تھا؟'' مظفر کو یاد آیا معظم علی؟
''اس کو تو میں نے بھاری معاوضہ دے کر فرار کروا دیا ہے۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو آ جائے گا۔'' پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ سب کا منہ بند ہو جائے گا۔'' وہ اپنی ہی زعم میں مبتلا تھیں۔

''بے چاری فرخندہ کے ساتھ تم نے بڑی زیادتی کی، جو گناہ تم کرتی رہی ہو وہ سب اس کے سر منڈھ دیا۔ بڑا قابل رحم ہے پیر غوث علی شاہ کہ تم جیسی ناگن ناک کے نیچے کیا کیا کرتی رہی اور وہ ساری زندگی بے خبر رہا۔ اس کے رشتوں، اس کی دولت اور اس کے بھروسے کا خون کرنے والی سلطانہ ہی اس کے گھر اور ہر شے کی مالک بنی بیٹھی ہے، واہ مالک۔ تیرے رنگ نرالے۔'' وہ مکاری سے بولا تھا۔

''کمینے (موٹی سی گالی) میرا کھاتے ہو اور مجھ پر ہی بھونکتے ہو، نمک حرام!'' سلطانہ نے ہنستے ہوئے اس کے سینے پر مکا مارا۔

''تو کیا میں نے جھوٹ بولا؟ یہ سارے کارنامے تمہارے نہیں؟'' اس نے بھی ہنس کر جواب مانگا تھا۔

''مانتی ہوں اور اعتراف کرتی ہوں یہ سب میں نے کیا۔ اب خوش؟'' سلطانہ نے لاڈ سے اس کے کندھے پر سر رکھا تھا۔

''ہاں خوش ہوں میں بہت خوش۔ تم بری عورت ہو اور مانتی بھی ہو، بڑا دل گردہ ہے تمہارا۔'' اسے اعتراف کرنا پڑا۔

ہاں مگر صرف تمہارے سامنے۔ باقی دنیا تو مجھے بہت اچھا انسان سمجھتی ہے حالانکہ میں ایک بری عورت ہوں۔ بہت بری۔'' وہ مظفر کے قربت میں آنکھیں بند کرتی بہت جذب سے بولیں تھی۔

پیر غوث علی شاہ جو کچھ دیر پہلے سلطانہ کے کمرے میں کیس کی ضروری فائل بھول گئے تھے سن کر کھڑے کھڑے مر گئے تھے۔

اتنا دھوکا...... اتنی مکاری...... اتنی برائی۔ ان پر اک پل میں قیامت گزر گئی تھی۔

ان کے وقار اور عزت کو مجروح کر کے سلطانہ نے انھیں کسی قابل نہ چھوڑا تھا۔ وہ عورت جس کی ہر بات کو انھوں نے بند آنکھوں سے تسلیم کیا تھا۔ وہ اس قابل تھی ہی نہیں کہ اُس پر بھروسہ کیا جاتا۔ ساری دنیا مل کر بھی سلطانہ کے خلاف کھڑی ہو جاتی' پیر غوث علی شاہ دنیا کو جھٹلا دیتا مگر اپنے کانوں سے سنا ان کا ہر اعتراف وہ نہیں جھٹلا سکتے تھے۔

ہمت کر کے انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ دھکیلا اور جو منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی تکلیف اور ذلت کے لیے دنیا کا بڑے سے بڑا لفظ بھی چھوٹا تھا۔

بساط اُلٹ چکی تھی، جو کنواں انھوں نے فرخندہ کے لیے کھودا تھا وہ خود اُس میں جا گری تھیں۔

مظفر جھٹکے سے سلطانہ سے الگ ہوا اور اپنا سامان اٹھا کر کھڑکی سے کود گیا۔ ساری ذلت سلطانہ کا مقدر بن گئی۔ جس عشق کو وہ سب کچھ سمجھتی تھیں اپنا نجات دہندہ کھو چکی تھی۔

''اپنی صفائی میں تم کچھ نہیں کہو گی۔ کیونکہ تمہارے پاس کچھ کہنے کو بچا ہی کب ہے؟ مجھے اللہ نے سبق سکھایا ہے۔ اس رات کی مہلت فرخندہ کی خوش نصیبی نہیں تمہاری بد نصیبی کے لیے تھی۔

مجھے اللہ نے اک معصوم کے قتل سے بچالیا۔ میری نسل کو ختم ہونے سے بچالیا۔ تم بری عورت ہو، خود اپنی زبان سے تم نے اقرار کیا ہے، میں تمھیں مزید برا بھلا نہیں کہنا چاہتا۔

تمہاری ذات اب قابلِ رحم ہے۔ آج کی اس طوفانی رات میں، تم میرے سامنے بے نقاب ہوئی ہو...... کل کی ذلت ابھی باقی ہے۔ جب دن کے اُجالے میں لوگ تمہاری اصلیت سے واقف ہوں۔ تم نے مجھے ہی نہیں یہاں کے سادہ لوح انسانوں کو بھی دھوکا دیا ہے۔ ہمارے بھروسے کا خون کیا ہے، کل کے دن کی رسوائی ہی تمہاری سزا ہے، اس سے بڑی موت کیا ہو گی۔ جب سنگساری کا حکم دھڑلے سے سنانے والی پیر محی الدین کی بیٹی خود یہی سزا جھیلے گی۔ تم کیا تھیں اور کیا بننے کی کوشش کرتی رہیں۔ نہ اس دنیا کی رہتی اور نہ اُس جہاں کی۔ ظلم کی مدت جتنی بھی ہو۔ سزا کڑی اور طویل ہوتی ہے۔''

سلطانہ بیگم کے ہونٹ سل چکے تھے، اور رسوائی کے خوف نے ان کے لبوں کو مقفل کر دیا تھا۔ کل کے کوڑے انھیں آج ہی اپنی پیٹھ پر برستے محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆

چوتھی طویل سچ بیانی

پتھر میرا نصیب

نائلہ طارق

اُس عورت کی درماندگی کا قصۂ الم، جسے ہر بار قدرت نے زیر کر دیا تھا

میں نے جب بھی کوثر بی بی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ہمیشہ ہلکورے لیتا درد محسوس کیا۔ میں سوچتی کہ اس عورت کو آخر ایسا کون سا غم ہے جس کا اظہار اُس کی آنکھیں کرتی ہیں۔ میں سوچ کر بھی اُس سے پوچھ نہ سکی تھی۔

آخر کار مجھے یہ موقع قدرت نے دے ہی دیا، ہوا یوں کہ میرا ٹیلی فون ڈیڈ ہو گیا۔ مجھے بہت اہم فون کرنا تھا، سو مجبوراً مجھے کوثر بی بی کے گھر فون کے لیے جانا پڑا۔

دروازہ خود انہوں نے کھولا۔ مجھے دروازے پر دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں حیرت اُبھر آئی۔ مگر لمحہ بھر میں وہ حیرت پھر سے اُداسی میں بدل گئی۔ میرے ذہن میں آواز گونجی۔

'اُف کیسی ہیں اِن کی آنکھیں، پل میں رنگ بدلنے والی'

مجھے ٹھٹھک کر کھڑا دیکھ کر وہ بولیں۔

''ارے آپ......؟ آیئے آیئے آپ کا اپنا گھر ہے۔''

''کوثر باجی مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے اگر آپ کا فون......؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تو اِس میں اتنا شرمانے کی کیا بات ہے؟ تم فون کرو اتنی دیر میں میں تمہارے لیے چائے بنا لیتی ہوں۔''

میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود باجی کوثر چائے بنانے چلی گئیں۔ میں فون کر کے فارغ ہوئی تھی کہ وہ چائے لے کر آ گئیں۔ چائے پینے کے دوران ہم اِدھر اُدھر کی گپ لگاتی رہیں۔ آخر کار کوثر باجی مجھ سے بولیں۔

''سنا ہے تم رسالوں میں کہانیاں لکھتی ہو؟''

''جی ہاں لکھتی تو ہوں لیکن صرف سچی کہانیاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر میں تمہیں ایک سچی کہانی سناؤں تو کیا تم لکھو گی؟''

''کیوں نہیں لکھوں گی۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں آپ مجھے بتائیں۔''

''آج نہیں بلکہ کل چار بجے میرے پاس آنا پھر میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گی۔''

''میں نے کچھ لمحے سوچا اور پھر کہا کہ ٹھیک ہے میں کل چار بجے آؤں گی۔'' اگلے دن پورے چار بجے



میں کوثر باجی کے گھر میں موجود تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ یوں مخاطب ہوئیں۔

''میں سیٹھ عابد کی بیٹی ہوں۔ پتا نہیں میرے والد کو سیٹھ کس نے کہنا شروع کیا تھا۔ لیکن میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے والد کو سیٹھ کے روپ میں ہی دیکھا۔

'میری ماں غلام فاطمہ ایک سیدھی سادی اور ملنسار عورت تھی۔ میں اور میرا بھائی عباس سارا دن کھیلتے اور رات کو نیندوں کے لمبے سفر پر چلے جاتے۔'

'وہ رات بھی ایک ایسی ہی رات تھی جب میری آنکھ کھل گئی۔ میری ماں اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔'

''ماں...... ماں کہاں ہو تم؟'' میں نے ڈر کر پکارا۔

میرے بار بار پکارنے پر بھی جواب نہیں ملا۔

عباس جو کہ برابر والے بیڈ پر سویا ہوا تھا، میں نے اُسے اٹھایا۔

''بھائی او بھائی اُٹھو ماں اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔'' عباس میری پکار پر فوراً اٹھا۔

ہم ابھی مخمصے میں پھنسے بستر پر بیٹھے، باہر نکلنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں سسکیوں کی آواز سنائی دی۔

''ارے کوثر یہ تو ماں کی آواز ہے۔'' عباس بولا۔

ماں کی آواز سیڑھیوں سے آ رہی تھی، جلد ہی ہم سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئے۔

''ماں تم کیوں رو رہی ہو؟'' عباس بولا۔

ماں نے گھٹنوں سے چہرہ اٹھایا تو اک لمحے کو میں کانپ گئی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ سرخ اور

آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ یوں لگا جیسے ماں کافی دیر سے رو رہی ہے۔

"تم؟ تم اس وقت کیوں اُٹھ گئے۔"

"اِس کوثر کی بچی نے مجھے اٹھادیا اور بولی کہ ماں اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔" عباس نے تفصیل سے جواب دیا۔

"ماں تم رو کیوں رہی ہو؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ عباس بھی سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔

"میں کب رو رہی ہوں...... وہ تو مجھے اپنے بستر پر نیند نہیں آرہی تھی تو میں نے سوچا کہ سیڑھیوں پر آبیٹھوں، یہاں خوب ہوا ہے نا؟" ماں جلدی جلدی بولی۔ میں نے تو خیر یقین کرلیا لیکن عباس کی آنکھوں میں اُلجھن تھی۔

"ماں تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟" عباس بولا۔

"دیکھو اگر تم نے سب کچھ مجھے سچ سچ نہیں بتایا کہ تم کیوں رو رہی تھی تو میں کچھ بھی کر بیٹھوں گا۔" عباس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ ماں چونک گئی۔

"میں تمہیں بتانا چاہتی تھی لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تمہیں بتانا پڑے گا۔" ماں دھیمے لہجے سے بولی۔

"تمہارے ابو نے دوسری شادی کرلی ہے۔"

"کیا......؟ کیا کہا...... ابو نے دوسری شادی کرلی ہے؟" میں اور عباس دونوں چونک گئے۔

"ہاں میرے بچو میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" ماں روتے ہوئے بولی۔

"بس آج کے بعد مت رونا، میرے ہوتے ہوئے تمہیں رونے کی ضرورت نہیں ہے۔" مجھے یوں لگا جیسے عباس مجھ سے بڑا ہے۔ اُس کے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ میں اُس سے بڑی ہوتے ہوئے بھی یکدم سہم سی گئی۔ اسی دن سے عباس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ اور زمینیں سنبھال لیں۔ وہ یکدم سے جوان ہوگیا تھا۔

ابو نئی شادی کے بعد عباس سے جھجکنے لگے تھے۔ اور میں تو انہیں دیکھ کر ہی کمرے میں چھپ جاتی۔ نجانے وہ کیسا خوف تھا جو میرے اندر جم سا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب عباس ابو کے سامنے کھڑا ہوا تو وہ کچھ نہ بول سکے اور چپ کرکے پچاس مربعے بھائی کے حوالے کردیے۔

عباس کو اِک چپ سی لگ گئی تھی۔

میں بھائی کی حالت دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ ابو ہمیں چھوڑ کر نئی بیوی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔

پہلے تو وہ ہماری خیر خبر بھی رکھا کرتے تھے۔ لیکن جب سے عباس نے اپنی زمینیں سنبھالی تھیں وہ ہم سے بالکل لاتعلق ہوگئے تھے۔ اور وقت پَر لگا کر اڑتا جا رہا تھا پھر اُن کی بیوی سے بھی ایک بیٹا ہوگیا۔

میرے سوتیلے بھائی کا نام علی رضا رکھا گیا۔ مجھے تو علی رضا بھی اتنا ہی پیارا لگتا جتنا کہ عباس۔ میرے لیے تو دونوں بھائی برابر تھے۔

وہ بھی عام دنوں جیسا ایک دن تھا جب میری شادی کی بات ہونے لگی۔ میری پھوپو کا ہمارے گھر کافی آنا جانا شروع ہوگیا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اتنا کیوں آتی تھیں۔

میری ماں نے بھائی عباس سے مشورہ کرکے اُن کو ہاں کہہ دی تھی اور وہ دھوم دھام سے میری برات لے آئیں۔ دلہن بن کر میں خود کو ہوا اڑتا میں محسوس کر رہی تھی۔ رخصتی کے وقت میں روتی بھی جا رہی تھی اور موقع پاتے ہی اپنے شوہر احمد عباس کو بھی کن انکھیوں سے دیکھ لیتی تھی۔ وہ مجھے بہت پیارا لگ رہا تھا۔

میں بہت خوش تھی کہ برادری میں سب سے زیادہ خوبصورت اور ذہین نوجوان میرا ہم سفر بنا ہے۔ میری شادی پہ میرے بھائی عباس نے بہت پیسہ خرچ کیا تھا جبکہ ابو مہمان بنے رہے تھے کیونکہ وہ دوسری بیوی کے اشاروں پر ناچتے تھے۔

میں اپنی آنکھوں میں نئے خواب اور دل میں نئی امنگیں سجا کر سسرال پہنچی۔ احمد عباس بہت اچھا انسان تھا۔ دوستوں کا دوست، ہمدرد اور نیک طبیعت کا مالک، لیکن کانوں کا ذرا کچا تھا۔ ماں کی ہر بات کو حدیث سمجھتا

تھا۔ میں نے کچھ ہی دنوں میں جان لیا کہ دیور فضل عباس انتہائی لالچی، مطلب پرست اور خودغرض انسان ہے۔ جبکہ نند بختاور فضل عباس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اب انہی کے ساتھ گزارا کرنا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے سمجھوتا کرلیا تھا۔

وقت کا کام ہے گزرنا، گزرتا رہا مگر احساس بھی دلاتا رہا کہ زندگی بڑی کٹھن ہے۔ اس دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ ساس کی آواز آئی۔

''کوثر اری او کوثر، کم بخت ماری ایک پکار پر جواب نہیں دیتی ہے۔''

''آئی پھوپو!'' میں بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔

''حرامزادی کسی یار کے پاس تھی جو میری آواز سنائی نہیں دی۔'' وہ چیخیں۔

میں اس الزام پر تڑپ کر رہ گئی اور امداد طلب نظروں سے دیور کی طرف دیکھا جو مجھے بھرپور نظروں سے گھور رہا تھا۔

''اب کھڑی کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہے، جا جلدی سے جا کر میرے لیے دودھ پتی بنا کر لا۔''

گھر میں کئی نوکر تھے۔ لیکن پھوپو ہر کام مجھ سے کرواتیں۔

''اس بار احمد عباس آجائے تو اُس سے میں کھل کر بات کروں گی کہ اس کی رکھوالی اب ہم سے نہیں ہوتی ہے۔'' پھوپو کی بڑبڑاہٹ میں نے کچن تک سنی اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

احمد شکار کھیلنے سندھ کے جنگلوں میں گئے ہوئے تھے۔ موقع دیکھ کر میں نے پھوپو سے کہا۔

''پھوپو اگر آپ کی اجازت ہو تو میں امی اور بھائی سے مل آؤں؟'' دراصل اس روز میرا دل بہت اُداس تھا اسی لیے میں نے ساس سے اجازت مانگی تھی۔

''جانا ہے تو چلی جاؤ لیکن یہ سوچ کر جانا کہ پھر اِدھر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اللہ کے واسطے پھوپو مجھ پر یہ ظلم تو نہ کرو۔ مجھے ایک بار اپنے بھائی سے ملنے دو۔'' میں روتے ہوئے بولی۔

''میرے آگے بکواس کرتی ہے، بھونکتی ہے میرے آگے۔ ذلیل، کمینی، ٹھہر میں تجھ سے ابھی پوچھتی ہوں۔'' میری ساس نے یہ کہہ کر مجھے چٹیا سے پکڑ لیا اور مارنا شروع کردیا۔ میری نند بختاور بھی اُن کے ساتھ شامل ہوگئی۔

''میں رو رہی تھی، چلا رہی تھی لیکن میری فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ نوکروں کے کان بہرے ہوگئے تھے۔ میں خاموشی سے پٹ رہی تھی کہ ایک لات میرے پیٹ پر لگی اور مجھے یوں لگا جیسے میرا کلیجہ منہ کے ذریعے باہر نکل آئے گا۔ پھر ایسا لگا کہ خون کا دریا بھر اُٹھا اور اس گھر کی وہ آس جو چار ماہ سے قائم تھی ٹوٹ گئی۔ گھر میں کلکاری گونجنے سے پہلے ختم ہوگئی۔

اس ظلم پر بھی نہ آسمان ٹوٹا اور نہ ہی زمین پھٹی۔ بس میں بے ہوش ہوگئی تھی اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں موجود تھی۔

مجھ میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہ تھی۔

اُسی رات احمد عباس آگئے۔ میری حالت دیکھ کر وہ بھی سکتے میں رہ گئے۔

''کوثر میری جان! یہ کیا حالت تم نے بنا رکھی ہے؟'' احمد مجھے اپنی بانہوں میں لے کر بولے۔

میں نے جو ذرا سا ہمدرد لہجہ سنا تو بکھر گئی اور پھر میں یوں تڑپ تڑپ کر روئی کہ خدا کی خدائی بھی جوش میں آجائے۔ میرے رونے کی آواز سُن کر ساس میرے دروازے تک آگئی اور پھر اُس نے فوراً ہی احمد کو بلا لیا کہ اسے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ احمد کو جاتے دیکھ کر میرا دل کانپ کر رہ گیا کہ اب میری ساس نہ جانے کیا لگائی بجھائی کرے گی۔ اُن کی باتیں سننے کے لیے میں دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اُن کے کمرے تک پہنچ گئی اور دروازے پر کھڑی ہو کر اندر کی باتیں سننے لگی۔ پھوپو کہہ رہی تھیں۔

''احمد میں تمہاری ماں ہوں تم میری بات کا کہاں تک یقین کرو گے؟''

''امی جان خدا کے بعد میں آپ کا مقام سمجھتا

ہوں۔ آپ میری ماں ہیں۔'' احمد کی مودب آواز سنائی دی۔

'' تو میری بات غور سے سنو، کوثر اب تمہارے قابل نہیں ہے۔'' ساس کی آواز مجھے تڑپاتی ہوئی محسوس ہوئی۔

'' یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان!'' احمد کی آواز میں حیرت تھی۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں احمد عباس! میں نے سوچا تھا کہ کوثر کے ساتھ تمہاری جوڑی خوب رہے گی۔ تم دونوں مل جل کر رہو گے۔ لیکن مجھے افسوس ہے بیٹا کہ میں تمہیں اچھی بیوی نہ دے سکی۔ کوثر کے ایک شخص سے ناجائز تعلقات ہیں اور وہ شخص عباس کے پاس آتا جاتا ہے۔''

'' یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان؟''

'' ہاں میرے بیٹے، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آج جب کوثر نے مجھ سے اپنے میکے جانے کی اجازت مانگی تو میں نے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ احمد آجائے تو اُس کے ساتھ چلی جانا لیکن کوثر نے میری ایک نہ مانی اور مسلسل ضد پر جمی رہی۔ میرے انکار پر اُس نے مجھے بچہ ضائع کرنے کی دھمکی اور آخر کار اُس نے پتا نہیں کیا چیز کھالی جس سے بچہ ضائع ہو گیا۔ مجھے کتنی حسرت تھی کہ میرے بیٹے احمد کے بچے ہوں اور میں انہیں کھلاؤں۔'' یہ کہتے ہی پھوپو نے رونا شروع کر دیا۔

'' ماں اسلام میں حکم ہے کہ اگر تمہاری بیوی تمہارے قابل نہیں ہے یا وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو پھر اُس کی مرضی کے مطابق اسے طلاق دے دو بجائے اُس کے کہ تم سے کوئی غلطی ہو جائے۔ بے شک اللہ تعالیٰ عادل ہے۔'' اس سے پہلے کہ احمد مزید کچھ بولتے پھوپو نے اُسے روک دیا۔

''بس چپ ہو جاؤ۔ میں مزید کچھ نہیں سن سکتی۔ اگر تم نے کوثر کو طلاق دے دی تو پھر میرا مرا ہوا منہ دیکھنا۔''

'' پلیز ماں ایسا مت کہو بھلا میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں۔ جیسے تم کہو گی میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔'' احمد جیسے رو دیے۔

'' جاؤ تم اپنے کمرے میں...... اور سنو احمد کوثر سے کچھ بھی مت کہنا۔ میں اپنے طور پر یہ معاملہ سنبھال لوں گی۔''

میں ایسی حالت میں بھی تیزی سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ دونوں کمرے برابر برابر میں تھے۔ مگر یہ فیصلہ بھی میں نے بہ مشکل طے کیا تھا۔ احمد کمرے میں آ کر خاموشی سے لیٹ گئے تھے۔ میری زبان پر حیرت نے قفل لگا دیا تھا۔ پھوپو ہو کر بھی انہوں نے روایتی ساس جیسا انداز اپنایا تھا تو مجھے اتنی حیرت نہیں تھی۔ مگر آج انہوں نے جو جو کچھ کہا تھا اس نے مجھے سکتے میں ڈال دیا تھا۔ اب میں احمد کے ردعمل کی منتظر تھی۔ میں خود سے انہیں چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔ بس دیکھے جا رہی تھی۔ رات کے بعد صبح ہو گئی مگر وہ کچھ نہ بولے بس ان کا رویہ سرد رہا۔ بالآخر میں نے اُن سے پوچھ لیا۔

'' آپ مجھ سے ناراض ہیں احمد؟''

''نہیں تو بھلا میں تم سے ناراض کیوں ہونے لگا؟''

'' پلیز احمد اب اور دکھ اور رویے میں آئی سرد مہری کو ختم کر دو...... اب اور مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں تم سے صرف تم سے محبت کرتی ہوں احمد۔ مجھے خود سے دور نہ کرو۔'' میں بے اختیار رو پڑی۔

'' بس اب چپ کر جاؤ، مت رو مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔'' احمد کا قُرب پا کر اگلے ہی لمحے میں خود سے بھی بے گانی ہو گئی۔

حالات ایک ہی دھارے پر رہے۔ میں بھی زبان پر قفل لگائے رہی۔ پھوپی زیب النساء اور دیور فضل میرے سکون کو حیرت بھری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں احمد کو ایک بار پھر شکار کا شوق چڑھا اور وہ سب کچھ بھلا کر اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر چلے گئے۔

انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ میں پھر اُمید سے ہوں۔ اس بار میں نے کسی کو بھی ہوا نہ لگنے دی۔

جب چوتھا مہینہ شروع ہوا تب میری ساس کو پتا چلا اور انہوں نے کہا۔

"کوثر یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟"
میں کچھ بھی نہ بول سکی، بس نظریں جھکا کر رہ گئی۔
"یہ میرا حکم ہے کہ تو یہ بچہ گرا دے۔"
"نہیں پھوپو جان مجھ پر یہ ظلم نہ کریں، میں احمد کے بچے کو جنم دینا چاہتی ہوں۔" میں روتے ہوئے بولی۔
"بس زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔" وہ ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بولیں۔
"اور ہاں رحمت بوا کو کہو کہ دائی کو بلوا لائے تا کہ تم اس بوجھ سے آج ہی نجات پا سکو۔"
اس سے پہلے کہ میری ساس رحمت بوا کو بلواتی وہ خود ہی چلی آئی۔
"بیگم صاحبہ بہو کے بھائی صاحب آئے ہیں۔"
"کیا کہا عباس آیا ہے؟" میں دوسرے ہی لمحے گیٹ کی طرف بھاگی۔
عباس مجھے اس طرح سے آتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔
"کیا ہو گیا ہے کوثر اس طرح سے کیوں بھاگ رہی ہو؟"
"عباس اگر تمہیں میرا تھوڑا سا بھی خیال ہے تو مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلو ورنہ پھوپو اس آنگن میں پھول کھلنے سے پہلے ہی اسے مسل دے گی۔" میں روتے ہوئے بولی۔
"حوصلہ کرو کوثر! میں ہوں ناں پھر تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"
"پلیز عباس مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"
"چلو ٹھیک ہے آؤ میرے ساتھ۔"
اور یوں عباس مجھے اپنے گھر لے آیا۔
میں نے راستے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ تو غصے میں بھر اٹھا تھا مگر میں نے اسے اپنی قسم دے دی۔
مجھے میکے آئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ مگر احمد مجھے لینے نہ آئے اور وہ وقت بھی آ گیا جس روز میں نے بہت خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔ یہ خبر پھوپو کو بھی دی گئی۔ بیٹے کی پیدائش کا سُن کر احمد بھی چلے آئے۔ میری قسم کی لاج رکھتے ہوئے عباس بھائی نے خوش دلی سے اُن کا استقبال کیا۔ پھر انہیں میرے پاس تنہا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔
"آپ کو اب میری یاد آئی، میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔
"یاد تو روز آتی تھی لیکن شاید تم نے قسم کھائی تھی مجھ سے نہ ملنے کی؟"
"میں نے قسم کھائی تھی؟ آپ سے ملنے کی قسم کھائی تھی؟"
"ارے کوئی اپنی جان سے بھی علیحدہ رہ سکتا ہے؟"
"پھر تم اپنا گھر چھوڑ کر کیوں آ گئیں؟"
"میں اس لیے آ گئی تھی احمد کہ مجھے وہاں اپنے بچے کے لیے خطرہ تھا۔ پھوپو نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں یہ بچہ ضائع کروا دوں۔ اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے عباس بھائی کے ساتھ چلی آئی۔"
آہستہ آہستہ میں نے ساری بات احمد کو سنا دی۔
سب کچھ سن کر بھی وہ خاموش رہے صرف اتنا بولے۔
"ٹھیک ہے تم اِدھر ہی رہو میں آہستہ آہستہ سب سنبھال لوں گا۔"
احمد نے مجھے گلے سے لگا لیا تو میں اپنے سارے غم بھول گئی۔ بیٹے کا نام انہوں نے ہی یوسف رکھا۔
یوسف بہت پیارا بچہ تھا۔ لوگوں نے دباؤ ڈالا تو پھوپو بھی آ گئیں۔ انہوں نے یوسف کو پیار کیا اور پانچ ہزار میرے ہاتھ پر رکھ کر چلی گئیں۔
مجھے تو اب کھیلنے کو اک خوبصورت سا کھلونا مل گیا تھا۔ سارا دن بس یوسف میں ہی مست رہتی۔ بعض دفعہ احمد میرے پاگل پن پر خوب ہنستے۔
یوسف ابھی چار ماہ کا تھا کہ میں دوبارہ امید سے ہو گئی۔
"اُف احمد اب کیا ہو گا؟"
"ارے ہو گا کیا جانِ من اک پیاری سی بیٹی ہو گی اور بس۔"

"لیکن احمد ابھی تو یوسف بہت چھوٹا ہے۔"
"ارے بابا چھوٹا ہے تو کیا ہوا؟ اب یہ تو خدا کی مرضی ہے۔ ہم تم کون ہوتے ہیں اُس کی مرضی میں دخل اندازی کرنے والے۔" احمد مسکراتے ہوئے بولے۔
میں چپ رہ گئی کیونکہ احمد کے ساتھ بحث فضول تھی۔ وقت گزرتا رہا اور خدا تعالیٰ نے میری گود میں بیٹی دے دی۔ بیٹی کی پیدائش پر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ اس بار ہم دونوں میاں بیوی کو بیٹی کی خواہش تھی، سو اللہ نے ہماری خواہش پوری کردی۔
میں نے اس کا نام معارج رکھا۔
یوسف کے مقابلے میں معارج کافی کمزور پیدا ہوئی تھی۔ اسے پیدا ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ مگر میری ساس نہیں آئی تھی۔
"احمد! مجھے لگتا ہے کہ پھوپو کو بیٹی کی خوشی نہیں۔"
"نہیں، نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، اصل میں اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ورنہ وہ ضرور آتیں۔"
میں سمجھ گئی کہ احمد مجھے بہلا رہے ہیں، سو چپ رہ گئی۔
ابھی ہم آپس میں باتیں کر ہی رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ میری ساس اور میرا دیور فضل عباس اور نند بختاور آئے ہیں۔ احمد کو میرے پاس دیکھ کر میری ساس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔
"تم ہر وقت اِدھر ہی گھسے رہتے ہو یا زمینوں پر بھی جاتے ہو؟" پھوپو دھاڑیں۔
"ارے امی جان دیکھیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتنی پیاری پوتی دی ہے۔" احمد نے ماں کا دھیان بٹانے کو کہا۔
پھوپو نے معارج کو گود میں اُٹھا کر سینے سے لگالیا۔ احمد بھی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اپنے بھائی فضل کو لے کر باہر چلے گئے۔
پھوپو اور بختاور کافی دیر تک بیٹھی رہیں۔
امی اور عباس بھائی نے کھانا پکوایا اور کئی طرح کی ڈشیں پکوائیں۔
پھوپو نے رغبت سے کھانا کھایا میں بھی دل میں شکر ادا کرنے لگی کہ اللہ کرے ایسا ہی امن رہے۔
شام کو پھوپو واپس جانے کو تیار ہوگئیں۔
میری گود سے معارج کو لیا اور ڈھیر سارا پیار کر کے مجھے واپس کر دیا۔
پھوپو کے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری بیٹی معارج ٹھنڈی ہوتی جارہی ہے۔ میں نے شور مچا کر پورا گھر اکٹھا کرلیا۔
سب سے پہلے بھائی عباس کو ہوش آیا، اُس نے لپک کر مجھ سے معارج کو چھینا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ باہر مردانے میں اُن کا دوست گاڑی اسٹارٹ کیے کھڑا تھا۔
آندھی طوفان کی طرح عباس ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور اُسے ساری صورت حال سمجھائی۔
ڈاکٹر فوراً معارج کو آپریشن تھیٹر میں لے گیا۔ پورا ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد ڈاکٹر معارج کو بچانے میں کامیاب ہوا۔
"پتا نہیں اس بچی کو ایسی کون سی چیز دی گئی تھی کہ آہستہ آہستہ زہر اس کے بدن میں پھیل رہا تھا۔ اگر اسے بروقت نہ لاتے۔ تو یہ مرجاتی۔" ڈاکٹر نے کہا۔
"ڈاکٹر عباس بھائی کا دوست تھا اس لیے پولیس کیس نہ بنا۔
مجھے جب ساری صورتِ حال کا پتا چلا تو میں تڑپ گئی۔ عباس مرنے مارنے پر تل گیا تھا کہ امی نے واسطے دے دے کر اُسے دھیما کیا۔
"پھوپو نے آخر ایسا کیوں کیا؟" میں اور عباس سوچتے رہے۔
ان باتوں کا ذکر جب میں نے احمد سے کیا تو وہ مجھ سے اور عباس سے لڑ پڑے کہ تم دونوں بہن بھائی میری ماں پر الزام لگا رہے ہو۔ بھلا کوئی ماں اپنے بیٹے کے ساتھ ایسی زیادتی کر سکتی ہے کہ اُس کی اولاد کو مار دے۔ تم یہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہو، میں چپ رہا۔ بلکہ ہر ماہ خرچہ بھی دیتا رہا۔ تم نے جیسا کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ اُدھر میری ماں مجھے بہت کچھ کہتی رہی اور میں چپ رہ کر سنتا رہا صرف اس لیے کہ ہمارا تماشا نہ بنے۔ لیکن اب حد ہوگئی ہے کہ میری ماں پر یہ الزام کہ اس نے بیٹی کو زہر دیا ہے۔"
عباس اور میں بالکل چپ بیٹھے رہے۔ آخر کار

عباس بولے۔

''احمد بھائی میں بھی چپ رہ کر حالات کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ میری بہن کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں وہ سب میرے علم میں ہیں۔ میری بہن مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ میں ساری زندگی اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ لیکن اگر بہنیں اپنے پاس ہی بٹھانی ہوں تو پھر اُن کی شادی کرنے کا کیا فائدہ؟''

اگر پھوپو کے پاس میری بہن محفوظ رہتی تو میں کبھی بھی اسے وہاں سے نہ لاتا، رہ گئی الزام کی بات تو بھلا مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں الزام لگاؤں جو حقیقت تھی سو کہہ دی۔'' وہ سانس لینے کے لیے رُک کے پھر بولے۔

''اب بھی میرا مشورہ ہے کہ تم عورتوں کی نظر سے حالات کو مت دیکھو بلکہ اپنی سوچ کی گہرائیوں سے حالات پر نظر رکھو پھر حقیقت کیا ہے تمہیں خود ہی احساس ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے اب میں ہی کوئی فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' احمد یہ کہہ کر چلے گئے۔

پورا ہفتہ اسی کش مکش میں گزر گیا کہ احمد کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ عباس بھائی بالکل چپ تھے اور میں اپنی قسمت کے فیصلے کی منتظر تھی۔

آخر ایک دن احمد مسکراتے ہوئے آئے۔

بھائی عباس نے بڑی گرمجوشی سے اُن کا استقبال کیا۔

''عباس! تمہاری باتیں مجھ پر اثر کر گئی تھیں اور میں نے تنہائی میں بارہا سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کیسا باپ ہوں کہ اپنی اولاد کی حفاظت نہیں کر سکتا اور میں کیسا شوہر ہوں کہ اپنی بیوی کی بھی حفاظت نہ کر سکا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو علیحدہ رکھوں گا۔ میں نے علیحدہ گھر لے لیا ہے۔ کوثر اور میرے بچے علیحدہ رہیں گے۔ اُن کے ساتھ دو ملازمائیں بھی رہیں گی، جبکہ گیٹ پر ایک اور ملازم پہرہ دے گا۔'' احمد مضبوط لہجے میں بولے۔

میں احمد اور عباس بھائی کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ میری ماں نے مجھے آنسوؤں کے سنگ دوبارہ رخصت کیا۔

اب میں تھی احمد کی محبت تھی اور دور دور تک پھولوں کی راہ گزر تھی۔

میری ساس نے پہلے تو احمد کو خوب باتیں سنائیں، دودھ نہ بخشنے کی دھمکی بھی دی۔ پھر تھک ہار کر چپ ہو گئی۔

احمد نے حالات کو بخوبی سنبھال لیا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے قطع تعلق کر رکھا تھا اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا کہ ایک روز پھوپو میرے گھر آ گئیں۔ انہوں نے رو رو کر مجھ سے فریاد کی کہ میں احمد کو سمجھاؤں۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ احمد بھی اب خوش رہنے لگے تھے کہ اُن کی ماں مان گئی ہے۔

میرے اللہ نے ایک بار پھر مجھے خوشی دکھادی میں دوبارہ امید سے تھی۔ یوسف زیادہ تر بھائی عباس کے پاس رہتا۔

جیسے جیسے میرے دن قریب آ رہے تھے۔ میں گھبرا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

احمد مالٹوں کے ٹرک سندھ کی طرف بھیجتے تھے۔ حیدر آباد اور سانگھڑ میں تو ہمارا مالٹا خوب فروخت ہو جاتا تھا۔ کراچی میں البتہ دیر ہو جاتی۔ احمد نے فیصلہ کیا کہ اس بار وہ خود ٹرک کے ساتھ کراچی جائیں گے۔

آخر کار احمد چلے گئے اور جاتے جاتے مجھے خوب حوصلہ دے گئے۔ میری ساس اور نند میرے پاس تھیں۔ بھائی عباس بھی اپنے دوستوں کے ساتھ مری کی سیر کو گئے ہوئے تھے جبکہ امی اپنے گھر پر ہی مصروف تھیں۔

میں دن رات دعائیں مانگتی کہ اللہ تعالیٰ مجھے خیر و خوشی کے ساتھ فارغ کر دے۔ مجھے رات کو تکلیف ہو گئی۔ میری ساس کی نوکرانی بھاگ کر اپنی پرانی دائی کو بلا لائی۔ ساری رات میری تکلیف میں ہی گزر گئی۔ صبح کو میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔

دائی نے جلدی سے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر میری چارپائی کے نیچے پھینک دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو دائی ماں تم نے بچہ نیچے کیوں پھینک دیا ہے؟'' میں نے نقاہت سے پوچھا۔

"تم نے مردہ بچے کو جنم دیا ہے کوثر بی بی اس لیے میں نے بچہ چارپائی کے نیچے پھینک دیا ہے۔ تم اٹھنا مت میں ذرا تمہاری ساس کو خبر کر آؤں۔"

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ میں بے آواز رو رہی تھی، جب میری ساس اور اُس کی نند اندر کمرے میں داخل ہوئیں۔ پیچھے پیچھے دائی بھی تھی۔

"یہ بچہ ہے بیگم صاحبہ۔" دائی نے بچے کو چارپائی کے نیچے سے نکالتے ہوئے کہا۔

"اِدھر مجھے دو۔" جب پھوپو نے اپنے پوتے کے اوپر سے کپڑا اٹھایا تو دیکھا کہ بچہ سانس لے رہا تھا۔ مجھے بھی محسوس ہو گیا تھا کہ میرا بچہ زندہ ہے۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھائے تاکہ پھوپو مجھے بچہ دیں۔ میں جیسے جیسے ہاتھ آگے کرتی وہ بچے کو پیچھے کر لیتیں۔

"تمہیں بیٹا چاہیے کوثر؟ بھلا تمہاری شکل ایسی ہے کہ تم بیٹا پیدا کر سکو۔" پھوپو خونخوار لہجے میں بولی۔ میں کانپ کر رہ گئی۔

"پلیز پھوپو میرا بچہ مجھے واپس کر دیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ میرا بیٹا مجھے دے دیں۔" میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں بہو یہ لو اپنا بیٹا......" پھوپو نے بچے کو میری طرف بڑھایا جیسے ہی میں تھامنے لگی اُس نے فوراً ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں رو پڑی۔

"ابھی سے کیوں روتی ہو بہو ابھی تو تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہ ایک نظارہ دیکھو۔" یہ کہتے ہی میری ساس نے میری آنکھوں کے سامنے میرے بچے کو ایک ہاتھ سے پکڑا اور اس کا گلا اپنی گرفت میں لے کر بچے کی سانسیں ختم کر دیں۔ میرا بیٹا میری آنکھوں کے سامنے ختم کر دیا گیا۔ میری ظالم ساس نے اپنے ہی پوتے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا۔

فضا خاموش تھی، ہوائیں ساکت ہو چکی تھیں اور تو اور خدا کی خدائی بھی چپ تھی۔ میں تو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

"ٹائیگر او ٹائیگر......" میری ساس نے اپنے پالتو کتے کو آواز دی۔ دوسرے ہی لمحے کتا حاضر تھا۔

پھر میری آنکھوں کے سامنے ہی پالتو کتا بھیڑیے جیسی مالکن کا حکم مان چکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہاں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے۔ میری ساس فاتحانہ انداز سے میری طرف مڑی اور بولی۔

"تم نے مجھ سے میرا بیٹا چھینا اور میں نے تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا ہے، حساب برابر ہو گیا ہے۔"

"پھوپو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو، وہ عادل ہستی تم سے میرا انصاف کرے گی۔ تم نے اک ماں کی گود اجاڑی ہے۔ میری بددعا ہے کہ تمہاری گود بھی اُجڑ جائے۔ جن لوگوں کو خدا کا خوف نہیں ہوتا ہے، خدا اُن کی رسی بھی دراز رکھتا ہے۔ اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ جب خدا رسی کو کھینچے گا تو پھر اُن کا کیا حال ہوگا۔" میں روتے ہوئے انہیں کوس رہی تھی لیکن وہ ایسا چکنا گھڑا تھی کہ اس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"بولتی رہو میری چندا تم بولتی ہوئی اچھی لگ رہی ہو۔" میری ساس مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں نے کیا بولنا ہے پھوپو...... میں تو تب بولوں گی جب میرا خدا تم سے میرا بدلہ لے گا۔ میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا ہے۔" میں روتے ہوئے بولی۔

"ضرور ضرور بولو مجھے خوب بددعائیں دو۔" میری ساس ہنستے ہوئے بولی اور پھر وہ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ اُس کی نند اور دائی بھی مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ جبکہ میں اپنی قسمت پر رونے کو تنہا رہ گئی۔

جب احمد سندھ سے واپس آئے تو انہیں ساری صورتِ حال کا پتا چلا۔ تب پہلی بار انہیں دل کا دورہ پڑا۔

بھائی عباس فوراً لاہور لے گئے۔ ڈاکٹرز نے فوراً اسپتال میں داخل کر لیا۔ امی اور میں بھی اپنی گاڑی پر لاہور پہنچ گئے۔

میرا تو رو رو کر برا حال تھا۔ احمد تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے تھے۔ اس طرح انہیں بے بسی

کی حالت میں دیکھ کر میرا کلیجہ کانپ کر رہ گیا۔
ہم اسپتال میں پندرہ دن رہے اور جب احمد پوری طرح سے صحت مند ہو گئے تو ہم واپس آئے۔ گھر آ کر احمد نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔
"کوثر مجھے معاف کر دینا کہ میری ماں ایک بار پھر اپنا وار کر گئی ہے۔ اور میں کتنا مجبور ہوں کہ ماں کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ ہاں بس اتنا کر سکتا ہوں کہ ساری زندگی ماں کو اپنا منہ نہیں دکھاؤں گا۔" بھائی عباس اور میں چپ کر کے بیٹھے رہے۔ پھوپو نے اس بار اپنا وار خوب کیا تھا۔ میں نے اپنا معاملہ خدا کو سونپ دیا تھا۔ احمد جب بالکل ٹھیک ہوئے تو اپنے بھائی فضل عباس کے پاس گئے اور زمینوں کے بٹوارے کی بات کی۔
"بھائی احمد مجھے امی نے منع کر دیا ہے کہ احمد کو ایک مرلہ زمین کا بھی نہیں دینا ہے پھر میں کیسے آپ کو سارا حصہ دے دوں؟" فضل کمینگی سے بولا۔
احمد نے بہت زور لگا کر دیکھا لیکن انہیں زمین نہ ملی برادری نے بھی بہت زور لگایا لیکن پھوپو نہ مانی۔
ہم صبر کر کے بیٹھ گئے۔ فضل عباس کی موج ہو گئی کہ مالٹے کے باغات اور ساری زمینیں اُسے مفت میں مل گئیں۔
ایک بار پھر عباس بھائی نے مجھے سہارا دیا۔ انہوں نے میرے حصے کی زمین تین مربع اور مالٹے کا باغ میرے نام کر دیا۔ میں نے مختار نامہ احمد کو دے دیا۔
احمد کافی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ وقت اور حالات نے وہ گھاؤ لگائے کہ کبھی بھی ختم نہ ہوں۔ سب دوست اور شوق ختم ہو گئے تھے۔ سارا دن اپنے رقبے پر گزارتے اور شام کو گھر آ جاتے۔ یوسف اور معارج میں تو گویا اُن کی جان تھی۔ وقت پَر لگا کر اڑتا رہا احمد اپنے قول پر جمے رہے۔ اس دوران میرے جڑواں بچے ہوئے۔
بیٹے کا نام میں نے یونس رکھا اور بیٹی کا نام مائدہ رکھا۔ میرے بچوں کی پیدائش پر میرے سسر چھپ کر آئے۔ میں تو پھر بھی اُن سے بول پڑی لیکن احمد بالکل بھی نہ بولے اور اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ میرے سسر تھوڑی دیر بیٹھے اور واپس چلے گئے۔

پھوپو کا اپنے میاں پر بھی خوب رعب تھا۔ وہ بیچارے کچھ بھی نہ کہہ سکتے تھے بس ایک خاموش تماشائی تھے۔ باہر البتہ وہ خوب گل کھلاتے تھے۔ جائیداد وہ اپنی بیوی کے نام کر چکے تھے۔ اس لیے کسی بھی معاملے میں وہ نہ بولتے۔ زیب پھوپو نے اپنی شادی کے کچھ عرصے بعد اُن کی ساری دولت جائیداد اپنے نام کروالی تھی۔
کچھ دنوں سے میں عباس کا رویہ بھی بدلا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ بھائی جو میری ہر بات پر سر جھکاتا تھا اب اُس کے تیور بدلے سے نظر آ رہے تھے۔ میں پریشان تھی کہ عباس کیوں بدلا سا لگتا ہے۔ ایک روز مجھے موقع ملا تو میں نے بھائی سے پوچھا۔
"عباس کیا بات ہے تمہارا رویہ مجھے تبدیل سا لگتا ہے؟"
"نہیں تو کوثر میں بھلا کیوں تبدیل ہوں گا۔ بس سارا دن اپنی زمینوں پر رہتا ہوں اُسی کی ٹینشن رہتی ہے۔" عباس دھیمے لہجے سے بولا۔
"میں نہیں مانتی عباس تمہاری اس بات کو، تم پہلے بھی مصروف رہتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ میرا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ اور اب تو کئی کئی دن گزر جاتے ہیں تمہاری صورت ہی نظر نہیں آتی ہے۔ اور تو اور بچے بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔ تم اپنی مصروفیت میں انہیں بھی بھول گئے ہو۔" میں نے بھائی سے شکوہ کیا۔
"میں شرمندہ ہوں کوثر کہ بچوں سے غافل ہوا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ بچے کہاں ہیں؟"
"ہم یہاں ہیں ماموں جان۔" یوسف کی آواز دروازے سے آئی۔ معارج بھی ساتھ تھی۔
"آؤ میرے یار کہاں تھے تم؟" عباس مسکراتے ہوئے بولے۔
"میں تو یہیں پر ہوتا ہوں ماموں جان لیکن لگتا ہے آپ کسی اور جہاں میں گم ہیں۔" یوسف شرارت سے بولا۔
"بڑا شیطان ہو گیا ہے یار تُو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟"
"بس سو سو ماموں جان...... ویسے ایک بات

بتاؤں میرا پڑھائی میں بالکل بھی دل نہیں لگتا ہے۔''

''بُری بات یوسف! ایسا نہیں کہتے۔ تمہیں پڑھنا ہے اور بہت زیادہ پڑھنا ہے۔ معارج کا بھی خیال رکھا کرو تا کہ اُس کی پڑھائی بھی خوب ہو۔'' عباس سنجیدگی سے بولے۔

''میری پڑھائی کو چھوڑیں ماموں آپ بھی تو آج کل خوب پڑھ رہے ہیں۔'' یوسف نے شوخی سے کہا۔

''میں پڑھ رہا ہوں؟ وہ کیسے بھلا؟'' عباس نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ ایسے کہ آپ آج کل نزہت اکیڈمی میں کچھ زیادہ ہی پڑھ رہے ہیں اور باقاعدگی سے وہاں جا رہے ہیں۔'' یوسف کی بات سُن کر عباس گھبرا گیا، جبکہ میں چونک گئی۔

''آؤ یار باہر بیٹھتے ہیں تھوڑی سی گپ شپ لگائیں۔'' عباس یوسف کو باہر لے کر چلا گیا، جبکہ میں نزہت میں کھو گئی تھی۔

''نزہت رشتے میں میری کزن لگتی تھی۔ میری ساس کی نند کی اکلوتی بیٹی۔ میری ساس کی وہی نند جس نے میری ساس کے ساتھ مل کر میرے بیٹے کا قتل کیا تھا۔ لیکن عباس وہاں کیوں جاتا ہے؟'' میں سوچنے لگی۔

اب یوسف آئے تو میں اُس سے سارا حال پوچھوں۔ یوسف کے آنے تک میں کئی چکر گیٹ کے لگا چکی تھی۔ اور جب وہ آیا تو میں تھک کر برآمدے میں بیٹھی تھی۔ عباس باہر سے ہی چلا گیا تھا۔

''یوسف تم کپڑے تبدیل کر کے میرے پاس آؤ۔ مجھے تم سے کچھ اہم اور ضروری بات کرنی ہے۔''

''جی امی میں ابھی پانچ منٹ میں آیا۔'' یوسف کے آنے تک میں نے کمرے میں کافی چکر لگا لیے تھے اور جب وہ میرے پاس آیا تو میں صوفے پر بیٹھی تھی۔

''جی امی فرمایئے کیا بات کرنی ہے؟''

''یوسف بیٹا مجھے یہ بتاؤ کہ یہ نزہت والی کیا بات ہے؟'' یوسف نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''ایسی تو کوئی بھی بات نہیں ہے امی جان۔'' مجھے یوں لگا جیسے میرا بیٹا مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔

''دیکھو بیٹا تم مجھے سب کچھ بتا دو جو کچھ بھی تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔'' میں نے قدرے تلخی سے پوچھا۔ یوسف میرے قدموں تلے بیٹھ گیا اور بولا۔

''امی جان میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ماموں عباس آج کل نزہت آنٹی کے گھر بہت چکر لگا رہے ہیں۔ اور میں نے خود کئی بار انہیں وہاں پر دیکھا ہے۔''

''لیکن تم وہاں کیا لینے جاتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا دوست حمزہ وہاں رہتا ہے، نزہت آنٹی کے پڑوس میں اُن کا گھر ہے۔ میں حمزہ سے ملنے جاتا ہوں اس لیے آتے جاتے میں نے کئی بار ماموں کی گاڑی وہاں کھڑی دیکھی ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ اور سنو کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ مت کرنا۔''

''جی بہتر امی جان۔'' یوسف سر جھکائے باہر نکل گیا۔ میرا بھائی تو ایسا بالکل بھی نہیں تھا پھر وہ وہاں کیسے پھنس گیا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ نزہت کی ماں اور میری ساس نے مل کر مجھ پر کتنے ظلم کیے ہیں؟ وہ تو سب کچھ جانتا ہے پھر وہاں کیوں جاتا ہے۔'' میں پریشان ہوگئی۔ چند دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔

عباس آیا تو میں نے اُس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''مجھے سچ سچ بتاؤ عباس تم نزہت کے گھر کیا لینے جاتے ہو؟'' میرے اس طرح پوچھنے سے عباس گھبرا گیا۔

''میں نے بھلا وہاں کیا لینے جانا ہے۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔''

''مجھے کسی نے بھی غلط اطلاع نہیں دی ہے بلکہ میں خود رانا نگر گئی تھی۔ میری ایک ملنے والی نے مجھے میلاد شریف پر بلوایا تھا، تب میں نے وہاں تمہاری گاڑی دیکھی تھی اور وہیں سے مجھے پتا چلا کہ تم وہاں روزانہ جاتے ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''اصل میں کوثر بات یہ ہے کہ میں نزہت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' عباس نے نظریں جھکاتے

ہوئے کہا۔
میرے بھائی نے بات نہیں کی اک دھماکہ کر دیا تھا جو سیدھا میرے دل پر ہوا۔
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو عباس......؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اُس کی ماں نے میری ساس کے ساتھ مل کر مجھ پر کتنے ظلم کیے ہیں۔'' میں روتے ہوئے بولی۔
''معاف کرنا کوثر...... میں اب کوئی بھی گزری بات نہیں دہرانا چاہتا اور پھر اس معاملے میں بیچاری نزہت کا کیا قصور ہے؟ اُس نے تو کسی کو بھی نہیں سکھایا کہ تم پر ظلم کیا جائے۔ وہ اچھی لڑکی ہے اور پھر اپنے خاندان کی ہے اس لیے میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں امی جلد ہی وہاں جانے والی ہیں۔'' عباس مضبوطی سے بولا۔
مجھ پر تقدیر ایک بار پھر وار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میں جان گئی تھی کہ عباس کو پھنسانے میں کس کا ہاتھ ہے، لیکن افسوس کہ اب معاملہ کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ میرا بھائی مجھ سے اتنا دور ہو جائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔
شام کو جب احمد گھر آئے تو میں نے انہیں ساری صورتِ حال بتائی۔
''تم پریشان نہ ہو کوثر میں عباس کو ضرور سمجھاؤں گا اور مجھے سو فیصد اُمید ہے کہ وہ میری بات مان جائے گا۔'' احمد مجھے دلاسا دیتے ہوئے بولے۔
''اور اگر وہ نہ مانا تو......؟'' میں پریشان ہوئی۔
''میرے خیال میں وہ میری بات مان جائے گا تم تو اچھی طرح سے جانتی ہو کہ عباس میرا بہت لحاظ کرتا ہے اور میری ہر بات مانتا ہے۔ یقیناً وہ میری بات سمجھ جائے گا اور پھر نزہت میں ہے کیا کہ وہ اُس کے لیے پاگل ہو رہا ہے؟ امی جان پہلے میری شادی نزہت سے کرنا چاہتی تھیں لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ میں جیسی بیوی چاہتا تھا وہ ویسی نہیں تھی۔ اور پھر دل جس پر آ جائے وہی زندگی کا ساتھی بنتا ہے اور چونکہ میرا دل تم پر آ گیا تھا اس لیے میں نے نزہت کو ٹھکرا کر تمہارا ہاتھ ممانی سے مانگا تھا۔'' احمد جب شرارت سے بولے تو مجھے شرم آ گئی۔

''چھوڑیے بھی آپ تو ہر بات میں اپنی اور میری بات لے آتے ہیں۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔
جواب میں احمد کا بھرپور قہقہہ فضا میں پھیل گیا۔
☆......☆......☆
الیکشن قریب آ چکے تھے احمد کے دوست بڑے پُرجوش تھے کیونکہ اُن کا ایک قریبی دوست ایم این اے کی سیٹ پر الیکشن لڑ رہا تھا۔ احمد سارا دن مصروف رہتے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا اور نہ ہی کچھ پینے کا ہوش تھا۔ میں بعض دفعہ مذاق کرتی۔
''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آپ کا دوست الیکشن نہیں لڑ رہا بلکہ آپ خود الیکشن لڑ رہے ہیں؟''
''بس یوں ہی سمجھو کہ میں خود الیکشن لڑ رہا ہوں۔'' وہ مسکرائے۔
''ارے ہاں کوثر تم شام کو ذرا تیاری رکھنا اور بچوں کو بھی تیار کر لینا۔ ہم سب آج عباس سے ملنے جائیں گے۔''
''کیوں جناب خیریت تو ہے۔ میری ماں اور بھائی سے ملنے کا خیال کیسے آ گیا ہے؟'' میں نے قدرے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔
''جی جناب بالکل خیریت ہے آپ اپنی والدہ سے مل لیجیے گا اور میں ذرا اپنے سالے صاحب سے دو دو ہاتھ کر لوں گا۔ سنا ہے موصوف میرے مخالف گروپ میں ہیں۔'' احمد شرارت سے بولے۔
''مخالف گروپ......؟'' میں کچھ سمجھی نہیں۔
''ایک تو تم بہت بھولی ہو کوثر...... مخالف گروپ کا مطلب یہ ہے کہ عباس ہمارے مخالف امیدوار سے مل گیا ہے۔ وہ اور اُس کے تمام دوست ہمارے خلاف محاذ بنا چکے ہیں۔ ہر جگہ پر ہماری مخالفت کر رہے ہیں، حالانکہ عباس اچھی طرح سے جانتا ہے کہ جس شخص کا وہ ساتھ دے رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ کئی بار وہ جیل کی سیر کر چکا ہے اس کے باوجود وہ اُس کے ساتھ ہے۔''
''میں حیران ہوں احمد کہ عباس ایسا کیوں کر رہا ہے...... حالانکہ وہ کبھی بھی ہمارا مخالف نہیں ہوا ہے بلکہ اُس نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے۔'' میں دکھ سے بولی۔

"بس تم پریشان مت ہو شام کو تیار رہنا اکٹھے چلیں گے اور اُسے سمجھانے کی کوشش کریں گے دیکھو شاید سمجھ جائے۔"

شام کو میں تیار تھی بچے بھی تیار ہو چکے تھے اب ہمیں صرف اور صرف احمد کا انتظار تھا۔ رات گئے احمد آ تو گئے لیکن چار بندوں کے کندھوں پر سوار ہو کر۔ خون میں لت پت جسم دیکھ کر میں تو ہوش گنوا بیٹھی۔

"بھابی حوصلہ کریں خدا کو یہی منظور تھا۔ احمد گھر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں فائرنگ ہو گئی اور ایک ظالم گولی احمد کے سر میں لگ گئی جس سے احمد موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔" احمد کا ایک دوست روتے ہوئے بولا۔

"بھیا یہ فائرنگ کس نے کی ہے؟" میں نے تڑپتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں بھابی مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ فائرنگ کس نے کی ہے؟" خضر بھائی مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے جلدی سے بولے۔

مجھے یوں لگا جیسے خضر بھائی مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔

"آپ کو اللہ کا واسطہ ہے بھائی جان مجھے بتا دیں کہ فائرنگ کس نے کی ہے؟ ورنہ میں اپنے ساتھ کچھ کر لوں گی۔" میں روتے ہوئے بولی۔

"بھابی آپ تو جانتی ہیں کہ آج کل الیکشن کا زور ہے، شہر میں دو گروپ بن چکے ہیں۔ ہم سب دوست سیاسی جلسے سے ہو کر آ رہے تھے کہ بازار کی طرف سے فائرنگ ہونے لگی اور اُن فائرنگ کرنے والوں میں عباس بھی شامل تھا۔ اب پتا نہیں کس کی گولی احمد کو لگی ہے۔"

"عباس...... عباس......" میں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری دنیا ہی اُجڑ چکی تھی۔ کافی عرصے تک میری پاگلوں جیسی حالت رہی۔ آخر ایک روز عباس میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"کوثر میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں افسوس کر سکوں۔ تمہارا دکھ بہت بڑا ہے اور میرے الفاظ بہت کم...... بس اتنا کہوں گا کہ تم صبر کرو اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی تھی۔"

"اللہ تعالیٰ کی تو جو مرضی تھی سو تھی لیکن تمہاری یہی مرضی تھی کہ تم احمد کو راستے سے ہٹا دو، وہ تمہاری راہ میں روڑے کی طرح اٹک رہے تھے۔ تم نے انہیں مارا ہے وہ تمہارے ہاتھوں سے قتل ہوئے ہیں۔" میں نے عباس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے کوثر کہ میں نے احمد بھائی کو قتل کیا ہے۔ میں بھلا اپنے بہنوئی کو کیوں قتل کروں گا۔ بے شک اُس دن میں بھی جلسے میں تھا لیکن میں نے فائرنگ بالکل نہیں کی ہے۔ بلکہ اُس وقت میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ ہوٹل پر چائے پی رہا تھا جب فائرنگ ہوئی تھی۔ پولیس بھی اپنی تفتیش کر چکی ہے میں ہر طرح سے بے قصور ہوں پھر بھی اگر تمہارا دل مجھے قاتل مانتا ہے تو اٹھاؤ پستول اور مجھ پر فائر کر دو۔ میں اُف بھی نہیں کروں گا۔" نہ جانے عباس کے لہجے میں کیا تھا کہ میں اُس کے سینے سے لگ کر زور زور سے رو پڑی۔ عباس بھی رو رہا تھا۔

احمد کی وفات کے بعد میں نے لوگوں کی بہت ساری باتیں سنیں۔ ہر موقع پر عباس مجھے دلاسا دیتا۔ اُس نے نزہت کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُس نے کسی سے سُن لیا تھا کہ نزہت کی ماں لوگوں سے کہتی پھر رہی ہے کہ کوثر نے احمد کو مروایا ہے۔ الغرض ایسی باتیں سُن کر عباس کو کافی تکلیف ہوئی، سو اُس نے اُن کے گھر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

میری ساس بھی کچھ دن رو کر چپ ہو گئی۔ سسر البتہ نیم پاگل سے ہو گئے تھے۔ میں اپنا انصاف خدا پر چھوڑ چکی تھی۔

کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ عباس کی حالت ڈھیلی ڈھیلی سی ہے۔ وہ کام میں بھی دل نہیں لگا رہا۔

"عباس کیا بات ہے آج کل تم کافی ست سے لگ رہے ہو؟"

"بس موسم کی تبدیلی ہے اور تو کوئی بات نہیں ہے۔" عباس بولا۔

میرے دل میں پھانس سی اٹک گئی یوں لگا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ میں اُس وقت تو چپ کر گئی لیکن

رات کو میں نے یوسف سے بات کی اور اُس نے مجھے جو جواب دیا اُس سے میں تڑپ اٹھی۔

''میرا بھائی نشہ کرتا ہے۔ عباس وائٹ پاؤڈر کا عادی ہے۔'' میں رونے لگ پڑی میرا اتنا سمجھدار بھائی نشے کا عادی کیسے ہوگیا ہے۔ عباس چونکہ اب میرے ہی پاس رہتا تھا اس لیے میں نے اُس پر دن رات نظر رکھنی شروع کردی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اپنا علاج کروائے اور اس سلسلے میں، میں نے اُس سے بات بھی کی۔

''عباس بھائی تم اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے ہو؟''

''علاج......کیسا علاج کوثر۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ تم نشہ کرتے ہو؟''

''کس نے بتایا ہے آپ کو......؟'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''ایسی باتیں بھلا کہاں چھپتی ہیں، مجھے بھی خبر ہوگئی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں اپنا علاج کرواتا ہوں۔'' عباس یہ کہہ کر باہر چلا گیا اور میں گہری سانس لے کر رہ گئی۔

عباس اب بہت بدل گیا تھا۔ میں کچھ کہتی تو لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا۔ امی بھی اُس کی حالت سے کافی پریشان تھیں۔ ہم ماں بیٹی کچھ بھی نہ کرسکتی تھیں۔ ابو تو بہت پہلے سے ہی ہمیں چھوڑ چکے تھے۔ میں نے کافی عرصہ سے اپنے چھوٹے بھائی علی رضا کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں نئی امی نے اُسے کہاں چھپا کر رکھ دیا تھا۔

ہم سب عباس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے لیکن وہ نہ سمجھا۔ اب تو اُس نے اپنی زمینیں بھی فروخت کرنی شروع کردی تھیں۔ کچھ زمینیں تو وہ پہلے ہی فروخت کرچکا تھا۔

''آخر کب تک ایسے گزر بسر ہوگی عباس......؟'' ایک روز میں نے پوچھا۔

''تم مسلسل اپنی زمینیں فروخت کررہے ہو آخر یہ زمینیں کب تک ساتھ دیں گی؟'' عباس خاموشی سے ناشتا کرتا رہا جواب میں کچھ نہ بولا۔

''ماموں امی آپ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔'' میرے چھوٹے بیٹے یونس نے ماموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''امی تمہاری تو بس ایسے ہی بولتی رہتی ہیں۔'' عباس ناشتا چھوڑ کر چلا گیا جبکہ میں رونے لگی تھی۔ عباس کی حالت پر میرا دل روتا تھا۔

انہی دنوں عباس کا دوست محمود لندن سے آگیا۔ اُسے لندن عباس نے ہی بھیجا تھا۔

مجھ سے بھی ملنے آیا تو میں نے اُسے سارا حال دیا۔ وہ کافی دیر تک مجھ سے حالات پر افسوس کرتا رہا اور پھر عباس کو سمجھانے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ مجھے بھی امید ہوگئی کہ عباس اپنے دوست محمود کا کہنا ضرور مانے گا۔

محمود بھائی نے اس طرح سے عباس کو سمجھایا کہ وہ ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ بلکہ اُس کے ساتھ لندن جانے کو تیار ہوگیا۔

''محمود تم عباس کو اپنے ساتھ لندن لے کر جارہے ہو؟''

''جی ہاں باجی میں اُسے لے کر جارہا ہوں۔ عباس میرے ساتھ لندن میں رہے گا تو نشہ بھی چھوڑ دے گا اور میرے ساتھ مل کر کام بھی کرے گا۔'' محمود مسکراتے ہوئے بولا۔

''اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا بھائی سمجھ گیا ہے اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں محمود بھائی۔''

''اس میں شکریہ والی کون سی بات ہے کوثر باجی یہ تو میرا فرض تھا۔'' میں محمود کو دعائیں دینے لگی۔

پندرہ دن بعد محمود اور عباس کی فلائٹ تھی۔ میں سب کی نظر بچا کر رو پڑتی۔

امی کی حالت تو مجھ سے بھی بری تھی لیکن بیٹے کی صحت کی وجہ سے وہ اپنے دل کو مضبوط کرلیتیں۔

پورے خاندان میں یہ خبر گردش کررہی تھی کہ عباس لندن جارہا ہے۔ عباس باری باری سب سے مل رہا تھا۔ سب دوست احباب اُس کے ساتھ تھے۔

میرا بیٹا یوسف اور معارج کافی پریشان تھے کیونکہ اُن کا عباس سے کافی پیار تھا۔ البتہ یونس اور

مائدہ خوش تھے کہ اُن کا ماموں لندن جا رہا ہے۔

وہ اک خوشگوار صبح تھی۔ صبح سے آسمان پر کالے کالے بادل تھے اور خوب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، موسم یکدم اچھا ہو گیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بجھا بجھا سا تھا۔ عباس اپنے چند دوستوں کے ساتھ سیر کرنے گیا ہوا تھا۔ آج کل اُس نے نشہ چھوڑ رکھا تھا اس لیے اُس کے دوست اُس کا دھیان بٹانے کو کہیں نہ کہیں لے جاتے تھے۔

میں اور امی باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک گیٹ زور سے بجا...... یا الٰہی خیر میرا دل زور سے دھڑکا۔

میری نوکرانی نوراں گیٹ کھولنے گئی دوسرے ہی لمحے وہ بھاگتی ہوئی واپس آئی۔

''باجی باجی وہ عباس بھائی۔'' اُس نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا ہوا عباس کو......؟'' میں اور امی گیٹ کی طرف بھاگ پڑیں۔ عباس کے دوست چارپائی پر اُسے لے کر اندر داخل ہوئے۔ عباس بالکل ساکت تھا۔

''اُسے کیا ہوا ہے محمود بھائی؟'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔

''کوثر باجی ہم سیر کر کے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک برف خانے پر عباس رُک گیا اور ہم سے بولا کہ یہاں اُس کا ایک دوست رہتا ہے اُس سے بھی مل لیا جائے۔ ہم سب مل کر برف خانے چلے گئے اور وہاں گھنٹہ بیٹھے رہے، پھر پتا نہیں عباس کے من میں کیا سمائی کہ اُس نے برف خانے کے سرد پانی میں نہانا شروع کر دیا۔ ہم سب نے منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ نہانے کے دوران ہی اُسے کچھ ہو گیا۔ ہم فوراً عباس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے لیکن ڈاکٹر نے ہمیں جواب دے دیا ہے اُس کا کہنا ہے کہ اُس کا دل بالکل سرد ہو گیا ہے، اندر خون جم گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔''

''نہیں نہیں ایسا مت کہو۔ اللہ کرے میرے بھائی کو کچھ نہ ہو۔'' میں رونے لگی۔ امی تو نجانے کب بے ہوش ہو چکی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بھائی عباس میرے سامنے دم توڑ گیا میں کچھ بھی نہ کر سکی۔

لوگوں کا ایک ہجوم ہمارے گھر میں اکٹھا تھا۔ سب ہی عباس کی جواں مرگی پر رو رہے تھے۔ میری اور امی کی تو حالت ہی خراب تھی۔ میرا چھوٹا بھائی علی اور میرے ابو ہمارے پاس ہی رہ رہے تھے، جبکہ چھوٹی امی روز آتی تھی اور رات کو واپس چلی جاتی تھیں۔

امی ابھی تک کومے میں تھیں اور دن رات انہیں مختلف ڈاکٹرز اٹینڈ کر رہے تھے۔ اُن کی حالت بے حد سیریس تھی۔ آخر ایک دن مسلسل بے ہوشی میں رہتے ہوئے وہ بھی انتقال کر گئیں۔ مجھ پر تو یکے بعد دیگرے ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

میں بھی کتنی بدقسمت تھی کہ کوئی بھی رشتہ مجھے راس نہ آ سکا۔ امی کے چہلم کے بعد میں نے ابو کے پاس رہنے کی خواہش کی۔

''نا...... بابا نا...... ہم تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتے ہیں۔'' نئی امی چمک کر بولی۔

''جو بھی تمہارے پاس رہا ہے یا پھر جس نے بھی تمہارا ساتھ دیا ہے وہ مر گیا ہے۔ تم منحوس ہو سبز قدم ہو۔ ہم تمہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے لیے مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ ہم سے جہاں تک ہو سکا ہم تمہاری مدد کر دیا کریں گے۔'' میری چھوٹی امی یہ سب کہہ کر ابو اور علی کو لے کر چلتی بنیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور میں اکیلی جان

عباس کی سب زمینوں پر میرے ابو قبضہ کر چکے تھے۔ میرے حصے کی وہی زمین تھی جو عباس نے میرے نام کی تھی۔

ایک دن میں ہمت کر کے اپنے سسرال جا پہنچی۔

میری ساس اپنے کمرے میں ہی موجود تھیں۔ میں چپ کر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

میری ساس کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی وہ چیخ پڑی۔

''اری منحوس اِدھر کیا کرنے آئی ہے؟ تیرے قدم جہاں بھی پڑتے ہیں وہاں موت پھیرا مارتی ہے اِدھر کیا لینے آئی ہے؟''

''پھوپو آپ کو اللہ کا واسطہ ہے ایسا مت کہیں۔

میں آپ کی بہو ہوں، آپ کی بھتیجی بھی ہوں۔ آپ نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ میں نے صبر سے کام لیا لیکن اب میں تھک گئی ہوں۔"

"میں کہتی ہوں یہاں سے دفع ہو جا ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گی۔"

"پھوپو میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں میرے بچے بھٹک جائیں گے۔ آپ کے احمد کے بچے بھٹک جائیں گے۔" میں رونے لگی۔

"میں کہتی ہوں میرا تیرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جہاں گیا احمد وہیں گئی اُس کی اولاد۔" زیب پھوپو سختی سے بولی تھیں۔ آخر کار میں وہاں سے مایوس لوٹ آئی۔

اب میں تھی اور میرے بچے۔ اس صورت حال میں سب مجھے چھوڑ چکے تھے۔

میں نے اپنی زمینوں پر خود ہی کاشت کاری کرنے کا سوچا۔ اس سلسلے میں جب میں اپنی زمینوں پر گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہاں پر تو میرے دیور فضل عباس کا قبضہ ہے۔ وہ بھی وہیں پر موجود تھا۔

"فضل تم میری زمینوں پر کیا کر رہے ہو؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"تمہاری زمینیں......؟ بھلا تمہاری زمینیں کہاں سے آئیں......؟"

"یہ تو میری ہیں۔" فضل مکاری سے بولا۔

"اپنی زندگی میں ہی عباس یہ زمینیں مجھے فروخت کر چکا تھا۔"

"لیکن یہ تو میرے نام تھیں۔" میں نے پریشانی سے کہا۔

"آج کل بھلا کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ ہم نے بھی تھوڑا سا پیسہ خرچ کیا اور سب کچھ ہمارے نام ہو گیا۔"

"یہ دھوکہ ہے، فراڈ ہے۔" میں روتے ہوئے بولی۔

"اگر یہ دھوکہ ہے فراڈ ہے تو عدالت میں ثابت کرو یہاں پر کیا لینے آئی ہو۔" فضل عباس ہنستے ہوئے بولا۔

میں اکیلی عورت بھلا میری کس نے سننی تھی میں ایک بار پھر اکیلی ہو گئی تھی۔

بچوں کی خاطر میں نے لوگوں کے کپڑے سینا شروع کر دیے۔ اُن کا روزگار بھی تو بنانا تھا۔ میں دن رات محنت کر رہی تھی تاکہ میرے بچے پڑھ لکھ سکیں۔

اس دوران میری ساس نے مجھ پر ہزاروں الزام لگائے۔ ہر آئے گئے کو میرے بارے میں فرضی کہانیاں سناتی رہتی۔ جو عورتیں مجھ سے کپڑے سلوانے آتی تھیں وہ مجھے سارے حال کہہ دیتی تھیں۔ میں صبر و شکر سے وقت گزار رہی تھی۔ مجھ پر جتنے بھی ظلم ہوئے تھے میں نے اُن کا حساب اپنے خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا بڑا بیٹا یوسف میٹرک میں تھا، معارج نہم جماعت میں تھی، جبکہ یونس اور مائدہ آٹھویں جماعت میں تھے۔ وقت کا کام ہے گزرنا سو گزرتا رہا۔

مجھے اپنے سسرال اور میکے کی کچھ خبر نہ تھی۔ نہ ہی اُن لوگوں نے میری کوئی خبر رکھی اور نہ ہی میں نے اُن کی کوئی خبر رکھی۔

ایک دن رانا نگر سے مجھے ایک عورت ملنے آئی۔ وہ میری ساس کی کوئی ملنے والی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔

"کوثر بیٹی مجھے تمہاری نند نے بھیجا ہے۔ اُس نے تمہیں بلایا ہے۔"

"مجھے بلایا ہے......لیکن کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری ساس بہت بیمار ہیں اور اُس کی حالت ایسی ہے کہ اُس کا دم اٹک گیا ہے۔ وہ نہ مر رہی ہے اور نہ ہی جی رہی ہے۔ تم اک بار اُس کے سامنے چلی جاؤ ہو سکتا ہے تمہیں دیکھ کر وہ سکون سے مر سکے۔"

میں نے لوگوں سے سنا تو تھا کہ زیب پھوپو بیمار ہیں لیکن ایسی حالت میں ہوں گی یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں دم بخود تھی۔ آج وقت میرے ہاتھ میں تھا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں؟

"کوثر کیا سوچ رہی ہو......؟" ماسی سکینہ بولی تو میں چونک پڑی۔

"میں رانا نگر نہیں جا سکتی ہوں جس جگہ سے میں دھتکاری گئی ہوں وہاں نہیں جاؤں گی۔ چاہے جو کچھ

بھی ہو جائے۔'' ماسی سکینہ آخر مایوس واپس چلی گئی۔

پھر اُس کے بعد میرے پاس کئی لوگ آئے لیکن میں نہ گئی۔

ایک دن میرے سسر آ گئے اور میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے سامنے میں مجبور ہو گئی اور اُن کے ساتھ رانا نگر چل پڑی۔

جب میں پھوپو کے گھر پہنچی تو برادری کے سب لوگ موجود تھے۔

میں سیدھی پھوپو کے سامنے پہنچی۔ چارپائی پر یہ بیمار عورت قطعاً میری پھوپو نہیں لگ رہی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی عورت تھی۔ پھوپو سر سے بالکل گنجی ہو چکی تھیں پلکیں اور بھنویں بھی غائب تھیں۔ سارے جسم میں کیڑے پڑ چکے تھے، اس قدر بدبو تھی کہ لوگ دور دور ہو کر بیٹھے تھے۔ پھوپو نے مجھے دیکھا تو میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں تو خدا کا انصاف دیکھ رہی تھی۔ قدرت نے پھوپو کو عبرت کا نشان بنا دیا تھا۔

مجھے رہ رہ کے اُس کی زیادتیاں یاد آ رہی تھیں۔ پھوپو نے شاید میرے چہرے سے میرے دل کا حال پڑھ لیا تھا، اُس نے ایک بار پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں خوف خدا سے کانپ اٹھی۔

اگلے ہی لمحے میں کھڑی ہو گئی اور بلند آواز سے بولی۔

''پھوپو آپ نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا اُس کے لیے میں آپ کو اس جہان میں معاف کرتی ہوں، اُس جہان میں بھی معاف کیا۔''

میری اتنی کہنے کی دیر تھی اور پھوپو کا دم نکل گیا۔ میں سر جھکائے وہاں سے نکل آئی کیونکہ اب وہاں کوئی کام نہیں تھا۔

میری سلائی کا زور تھا۔ میری محنت کا مجھے خوب پھل مل رہا تھا۔ میں تمام رشتے داروں سے علیحدہ بس اپنے بچوں میں ہی مصروف تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میرے بچے اس معاشرے میں اپنا ایک علیحدہ مقام حاصل کریں۔

میرے پاس ایک لڑکی طاہرہ کپڑے سلوانے آتی تھی۔ میں اگر فارغ ہوتی تو اُس کے ساتھ خوب گپ شپ لگا لیتی۔

اب کچھ دنوں سے طاہرہ کا والد قادر بھٹی آتا اور کپڑے لے جاتا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ طاہرہ بیمار ہے۔ ایک دن میں جلدی کام سے فارغ ہو کر طاہرہ کے گھر چلی گئی وہ مجھے باہر صحن میں ہی مل گئی۔

''ارے آنٹی آپ......؟ زہے نصیب زہے نصیب۔'' طاہرہ مجھے دیکھ کر خوش دلی سے بولی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم بیمار ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بس ایسے ہی کچھ دنوں سے بخار ہو گیا تھا اور آپ کو تو علم ہے کہ میری والدہ موجود نہیں ہیں، میں چھوٹی سی تھی جب وہ فوت ہو گئی تھیں اس لیے کام کا سارا بوجھ مجھ پر ہے۔ برادری والے اس مشکل گھڑی میں ساتھ چھوڑ چکے ہیں، اس لیے بعض دفعہ آنٹی کام کے بوجھ سے میں تھک سی جاتی ہوں۔'' طاہرہ رنجیدگی سے بولی۔

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ آگے بڑھ کر میں نے طاہرہ کو سینے سے لگا لیا۔

''نہ اُداس ہو میری بچی...... مجھے اپنی ماں کی طرح سمجھو۔''

''ہائے سچ آنٹی۔ بالکل سچ طاہرہ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نجانے کیوں مجھے اُس وقت طاہرہ پر بے حد پیار آ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری بیٹی معارج میرے سامنے موجود ہے۔

اب طاہرہ مجھ سے دنیا جہان کی باتیں کرتی اور مجھے بھی اُس کی باتوں میں مزہ آتا۔

آہستہ آہستہ میں قادر بھٹی سے بھی بات چیت کرنے لگی۔ اُس کی اپنی زمینیں تھیں۔ پیسے کی تنگی انہیں بالکل بھی نہیں تھی۔ طاہرہ اب مجھے اور بھی زیادہ پیاری لگتی تھی۔

وہ مجھ سے کپڑے سینا سیکھ رہی تھی۔ صبح کو قادر بھٹی اُسے میرے پاس چھوڑ جاتا اور رات کو واپس لے جاتا۔

یوسف اور قادر بھٹی کی آپس میں خوب دوستی تھی۔ دونوں کا مشترکہ شوق تھا کبڈی۔ قادر بھٹی خود بھی کبڈی

کا بہترین کھلاڑی تھا۔ یوسف بھی کبڈی کا شوقین تھا اس لیے دونوں کی آپس میں خوب دوستی ہوگئی تھی۔
معارج اور مائدہ البتہ اُس سے جھجکتی تھیں۔ رہ گیا یونس تو اُسے اپنی پڑھائی سے ہی فرصت نہیں تھی۔
مجھے پتا بھی نہ چلا اور قادر بھٹی میرے حواسوں پر سوار ہوگیا۔ اب میں دن رات اُس کے خیالوں میں ہی کھوئی رہتی۔ میری اس کیفیت کو سب سے پہلے معارج نے محسوس کیا۔
"امی جی خیریت تو ہے، آپ آج کل بڑی گم سم سی رہتی ہیں؟" اب ہم پر بھی وہ توجہ نہیں ہے۔ خیریت تو ہے؟"
"ہاں بیٹا خیریت ہے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بس آج کل طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"
"امی جی ہمارا آپ کے علاوہ کون ہے، ہماری خاطر آپ اپنا خیال رکھا کریں۔" معارج نرمی سے بولی تو مجھے اُس پر بے اختیار پیار آ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔
میں قادر بھٹی کو بھول نہیں پا رہی تھی۔ وہ میرے لیے اہم ستون بنتا جا رہا تھا۔ میں اپنی عمر کا سوچتی تو شرم سے پانی پانی ہو جاتی کہ دل مجھے کن راہوں پر لے چلا تھا۔
میری اس بدلی کیفیت کو شاید قادر بھٹی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اب اُس کی نگاہیں مجھے پیغام دیتی نظر آتیں۔ ایک دن دروازہ بجا میں دروازے پر گئی تو آگے قادر بھٹی کھڑا تھا۔
بچے اسکول گئے ہوئے تھے، جبکہ یوسف اور معارج کالج میں تھے۔
"آپ اس وقت......؟ خیریت تو ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں بالکل خیریت ہے، میں نے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی اس لیے حاضر ہوا ہوں۔" وہ انکساری سے بولا۔
"اِس وقت میں گھر پر اکیلی ہوں بھٹی صاحب آپ پھر کسی وقت تشریف لے آئیں۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"دیکھیے محترمہ میں بھی ایک شریف اور عزت دار آدمی ہوں۔ مجھے خود سے زیادہ آپ کی عزت پیاری ہے۔ میں آپ سے جو بات کرنا چاہتا ہوں اُس کے لیے مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ آپ مجھ پر مکمل بھروسا رکھیں اور آرام سے میری بات سُن لیں۔" میں نے قادر بھٹی کی طرف ایک نظر ڈالی اور پھر کچھ سوچ کر راستہ دے دیا۔
"ہاں اب بولیں مجھ سے کون سی ضروری بات کرنی ہے......؟" قادر بھٹی جب کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"بات یہ ہے کوثر صاحبہ کہ میں آپ سے خلوصِ دل سے شادی کرنا چاہتا ہوں......" قادر بھٹی نے گویا میرے سر پر دھماکہ کیا۔
"جی......؟" میں لڑکھڑا گئی۔
"میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے اس معاملے میں بات کروں لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ بس آج ہمت کر کے چلا آیا ہوں۔ اصل بات کچھ یوں ہے کہ آپ مجھے اچھی لگی تھیں۔ میں دل سے آپ کی عزت کرنے لگا۔ جب مجھے طاہرہ کے ذریعے آپ کے حالات کا پتا چلا تو میرے دل میں آپ کے لیے اور بھی عزت بڑھ گئی۔ میری بیوی کو فوت ہوئے دس سال ہو گئے ہیں، میں نے اپنی بیٹی کو ماں اور باپ کا پیار دیا ہے۔ اُس کی ہر بات مانی ہے۔ لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ میری بھی کوئی ساتھی ہو جو میرے دکھ سکھ بانٹے، میرا خیال رکھے، مجھے پیار کرے۔ میں نے جب بھی اپنی ساتھی کے بارے میں سوچا آپ چھم سے میری نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔ میں نے دن رات آپ کے بارے میں سوچا ہے اور اب طاہرہ سے مشورہ کر کے آپ کے پاس آیا ہوں۔"
میں جو قادر بھٹی کی باتوں میں گم تھی آخری بات پر چونک گئی۔
"جی کیا کہا آپ نے......طاہرہ سے مشورہ۔"
"ارے آپ تو گھبرا گئی ہیں، اصل میں طاہرہ کو جلدی ہے کہ آپ اُس کی امی بن جائیں، مجھ سے پہلے اُس نے اپنی اس خواہش کا اظہار مجھ سے کیا ہے۔"
"لیکن بھٹی صاحب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ایک بیوہ عورت ہوں اور میرے چار بچے بھی ہیں جو کہ ماشاء

اللہ اب جوان ہیں۔ میں دوسری شادی کیسے کر سکتی ہوں اور وہ بھی اس عمر میں......؟''

''عمر کی تو آپ بات چھوڑیں۔ ہمارے مذہب اسلام میں شادی کی ضرورت کو اہم سمجھا گیا ہے عمر کو نہیں اور پھر کس جگہ پر لکھا ہے کہ بیوہ عورت شادی نہ کرے......؟ شادی آپ کی بھی ضرورت ہے اور میری بھی۔ میں آپ کی اور بچوں کی کفالت کر سکتا ہوں۔ میں نے اسلام کے حکم کے مطابق جائز طریقے سے آپ کا ہاتھ مانگا ہے۔'' قادر بھٹی سنجیدگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے بھٹی صاحب میں اس معاملے میں سوچوں گی اور پھر آپ کو جواب دوں گی۔''

''ضرور سوچیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن فیصلہ میرے ہی حق میں ہونا چاہیے۔'' قادر مسکراتے ہوئے بولا اور مجھے اُس سے بے اختیار شرم آ گئی۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ واپس چلا گیا، جبکہ میں سوچوں کے گہرے سمندر میں ڈوب گئی۔

میری حالت بالکل دیوانوں والی ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں آخر کیا کروں کدھر جاؤں، کس سے مشورہ مانگوں؟'' بھٹی دوبارہ میرے پاس نہیں آیا تھا۔

خاندان میں بھی کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس سے میں مشورہ کر لیتی۔ میرے تو دن رات سخت پریشانی میں گزر رہے تھے۔ ابھی میں نے کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ قادر بھٹی آ گیا۔

''ہاں کوثر اب بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے......؟''

قادر بھٹی اندر کمرے میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے بھٹی صاحب، مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی۔'' میں بے بسی سے بولی۔

''آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے......؟'' اس نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''مسئلہ تو کوئی بھی نہیں ہے بھٹی صاحب، اصل میں، میں بچوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرا دل پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ اب بڑے سارے ہیں میرے بارے میں کیا سوچیں گے......؟ یوسف تو کافی جذباتی ہے وہ تو مرنے مارنے پر تل جائے گا۔'' میں نے انتہائی پریشانی سے کہا۔

''دیکھو کوثر تم کوئی بھی غلط کام نہیں کر رہی ہو۔ جائز اور حلال طریقے سے نکاح کر رہی ہو اور نکاح کرنا کوئی جرم نہیں ہے، کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں کوثر اور ہمیشہ تمہارا ساتھ دوں گا۔ رہ گئی بچوں کی بات تو میں خود اُن سے بات کر لوں گا۔ یوسف اور معارج بڑے ہیں، وہ یقیناً میری بات سمجھ جائیں گے۔ باقی رہ گئے یونس اور مائدہ تو اُن سے بعد میں بات کر لیں گے۔'' قادر بھٹی بڑے اطمینان سے بولا۔

میں اُس کی تمام باتوں پر ایمان لے آئی اور شادی کے لیے رضامندی دے دی۔

ٹھہرا ٹھہرا میرا اقرار سنتے ہی قادر بھٹی خوشی سے ناچ اٹھا، جبکہ میں شرم سے سرخ ہو گئی۔

اُسی شام میں نے قادر بھٹی سے نکاح کر لیا۔ قادر اپنے تین دوستوں کے ساتھ آیا۔ مولوی صاحب بھی ساتھ تھے، ہمارا نکاح ہو گیا تو سب رخصت ہو گئے۔ کمرے میں قادر اور میں رہ گئے۔ بچے ٹیوشن پڑھنے گئے ہوئے تھے اس لیے میں تسلی سے بیٹھی تھی۔

قادر نے میرے گلے میں سونے کی چین پہنائی اور تا عمر ساتھ دینے کا وعدہ کیا، کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلا گیا کیونکہ بچوں کے آنے کا ٹائم ہو گیا تھا۔ قادر کی قربت میں میں بہت خوش تھی۔ جب بچے پڑھنے چلے جاتے تو وہ میرے پاس آ جاتا۔ ہم ایک دوسرے میں مست ہو جاتے۔ اور جب مجھے ہوش آتا تو میں قادر سے کہتی۔

''تم نے یوسف سے بات کی ہے......؟''

''جلدی بھی کیا ہے جانِ من میں کوئی دور بھاگا جا رہا ہوں۔ بس جلد ہی کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر اُس سے بات کر لوں گا۔'' قادر مجھے تسلی دیتا۔

''دیر نہ کرو بھٹی...... جلد ہی یوسف اور معارج سے بات کر لو۔ اب تو تمہاری آمد پر آس پاس پڑوس والے بھی باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں ایسی صورت حال سے پریشان ہوں۔''

''تم پریشان نہ ہو میں جلد ہی اُن سے بات کرتا ہوں۔'' قادر بھٹی مجھے تسلی دیتا ہوا چلا گیا۔

بھٹی سے شادی کرنے کے بعد میں کچھ زیادہ ہی

پریشان رہنے لگی تھی۔ پڑوسنیں بھی مجھ پر باتیں کرنے لگی تھیں۔ میں بھٹی کے عشق میں مگن سب کچھ بھلائے ہوئے تھی۔

بھٹی میرے پاس روز ہی آتا تھا۔ طاہرہ بھی اکثر آتی تھی۔ اُسے ہماری شادی کا پتا تھا۔ بعض دفعہ مجھے طاہرہ سے بھی شرم آجاتی۔

ایک دن بھٹی میرے پاس آیا تو میں اُس سے لڑ پڑی۔

"مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ تم میرے ساتھ دھوکہ کرو گے۔"

"دھوکہ......؟ کون سا دھوکہ کوثر؟" وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

"تم نے مجھے کہا تھا کہ تم جلدی بچوں سے بات کرو گے لیکن تین مہینے گزرنے کے بعد بھی تم نے بات نہیں کی ہے۔ مجھے تو اب خود سے بھی شرم آنے لگی ہے۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"ارے تم تو واقعی رونے لگی ہو۔ پلیز رومت دیکھو میں آج ضرور ہی کچھ کرتا ہوں۔ یوسف کو کسی ہوٹل پر لے جاؤں گا اور پھر اُس سے تسلی کے ساتھ بات کرتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ قادر مجھ سے کوئی اور بات کرتا۔ دھڑام سے دروازہ کھلا۔ میں اور قادر دونوں چونک پڑے، دروازے پر یوسف کھڑا تھا۔

یوسف کو دیکھتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں جلدی سے بھٹی سے علیحدہ ہوگئی۔

"تم ...... ذلیل انسان میرے ہی گھر میں نقب لگادی۔ میں تم سے کبڈی سیکھتا تھا اور تمہیں اپنا دوست سمجھتا تھا اور تم نے میری دوستی کو داغ لگا دیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یوسف نے بڑے خونخوار لہجے میں کہا اور قادر پر حملہ کر دیا۔

"میری بات سنو یوسف پہلے تسلی سے میری بات سن لو۔" قادر نے یوسف کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

اور پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ پلک جھپکتے میں ہی یوسف نے چھری کے وار سے قادر بھٹی کو ڈھیر کر دیا۔

میں جو پہلے ہی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی یہ صورتِ حال دیکھ کر مزید ڈر گئی اور ڈر کے مارے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میری چیخوں سے پورا محلہ اکٹھا ہوگیا۔ یوسف پچھلے دروازے سے بھاگ گیا تھا۔ قادر کو فوراً اسپتال میں داخل کروادیا گیا۔ ڈاکٹرز کی مسلسل محنت بھی رنگ نہ لائی اور قادر بھٹی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہیں اسپتال میں انتقال کر گیا۔

میرے سب محلے داروں کو میرے نکاح کا پتا چل گیا تھا۔ میری حالت سب سے بری تھی۔ تقدیر ہر بار مجھ پر ہی کیوں وار کرتی ہے۔

معارج اور مائدہ مجھ سے بولنا چھوڑ گئی تھیں جبکہ یونس گھر سے غائب تھا۔ میرے دونوں بیٹے غائب تھے۔

پھر مجھے کسی نے بتایا کہ یوسف اپنے ساتھ یونس کو لے گیا ہے۔ اور وہ دونوں ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔

معارج اور مائدہ مجھے چھوڑ کر اپنی پھوپو کے پاس چلی گئیں۔ پتا نہیں کب سے وہ دونوں اپنی پھوپو کے پاس جانے لگی تھیں۔ میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ جاتے جاتے معارج مجھ سے بولی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماں ایسی ہوتی ہے۔ آپ نے قادر بھٹی سے شادی کر کے ہمارے منہ پر کالک تھوپ دی ہے۔ ہم کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہیں۔ دونوں بھائی تو ویسے بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں اب ہمارا اور کون ہے جو ہمیں سہارا دے۔ اس مشکل گھڑی میں پھوپو نے ہمیں سہارا دیا ہے۔ وہ ہم دونوں بہنوں کو اپنی شفقت میں لینے کو تیار ہیں۔ اس لیے ہم دونوں رانا نگر جا رہی ہیں اپنی پھوپو کے پاس۔ اور ہاں آج سے ہمارا آپ سے ہر رشتہ ختم ہوگیا۔ ہم سمجھیں گی کہ ہماری پیدائش پر ہماری ماں مر گئی تھی۔"

قدرت کے اس ستم ظریف کھیل پر میں اب تنہا بچی تھی۔ سسکتی بلکتی اپنی زندگی گزارنے کے لیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ قدرت نے مجھ سے کس بات کا انتقام لیا تھا یا کہ یہ میرا امتحان تھا۔

☆☆......☆☆

پانچویں یادگار سچ بیانی

پھر صبح ہوگی!



محمد سلیم اختر

لیجنڈ لکھاری کی طرف سے، کشمیری پس منظر پر ایک یادگار داستان

کشمیر کی وادی اس دن سورج کی کرنوں سے منور تھی۔ ہر چیز صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔ کپواڑہ سے تین کلومیٹر پر ایک بڑا قبرستان ہے۔ جہاں سیکڑوں آزادی کے مجاہد شہادت کے درجات پا کر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ قبرستان کے اردگرد پہاڑیاں اور جنگل ہے۔ اکثر مجاہدین کا ٹھکانہ یہی جنگل اور پہاڑیاں ہیں۔ بھارتی فوجیوں سے اکثر جھڑپیں اسی علاقہ میں ہوتی ہیں۔ قبرستان کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ جو کبھی کبھی ہی آباد ہوتی ہے۔ جب مجاہدین اس مسجد سے آ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ بھارتی سورما مسجد میں بھی ان پر گولیاں برسانے سے باز نہیں آتے۔ مسجد کا امام امین نامی ایک شخص ہے۔ جو نہایت ہی منطقی محنتی اور بہادر انسان ہے۔ وہ مجاہدین کا ہمدرد اور ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ بھارتی فوج اکثر اس مسجد کو بھی مسمار کر جاتے ہیں مگر مولوی انھیں پھر سے خدا کے گھر کو آباد کر دیتا ہے۔

اس روز بھی مولوی امین مسجد کی مرمت میں مصروف تھا۔ وہ درود پاک کا ورد کرتا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ درود پاک کا ورد کرتا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ کہ کسی نے اسے پکارا۔ ”مولوی صاحب!“

اس نے اپنے ہاتھ روک لیے اور نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک خوب صورت اور نوجوان لڑکی اور بھارتی فوج کا کوئی میجر کھڑا تھا۔

”باوردی میجر! بھلا اس کا یہاں کیا کام؟“ مولوی امین نے سوچا۔

”مولوی صاحب! ہم ایک مجاہد یاسین کی قبر تک جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں بتا سکو گے کہ اس کی قبر کون سی ہے؟“ میجر نے مولوی امین کی الجھن دور کر دی۔

”وہ جو ایک ہفتہ قبل شہید ہوا ہے۔“ مولوی امین نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میجر نے جواب دیا۔

”میجر صاحب...... یاسین تو شہید ہو چکا ہے۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ خدا کے لیے۔ اسے اب اور اذیت مت دیجیے گا۔ اسے اب تو آرام کرنے دیں۔“ مولوی امین نے نہایت ہی دردناک لہجے میں کہا۔ تو میجر کے ساتھ کھڑی وہ حسین لڑکی رونے لگی تھی۔ مولوی کو حیرت ہوئی کہ یہ لڑکی کون ہے ا

دریاسین کی شہادت کا سن کر رونے کیوں لگی ہے۔

"مولوی صاحب! تم ہماری یہاں آنے کی وجہ کو غلط سمجھ رہے ہو۔ میں میجر راکیش ہوں اور یہ میری بہن ارچنا ہے۔ یاسین ہمارا محسن ہے ہم اس کا شکریہ ادا کرنے یہاں آئے ہیں۔

"ایک مجاہد، تمہارا محسن۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مولوی امین حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"یہ سچ ہے مولوی صاحب! آپ ہمیں اس کی قبر تک لے چلیں۔" میجر نے جواب دیا۔

مولوی امین نے چند لمحے سوچا اور پھر ان دونوں کو ساتھ لے کر ایک طرف چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ تین دن قبل ہی بھارتی فوج نے یاسین کو بڑی بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔ مولوی صاحب نے یاسین کی قبر کے سرہانے پہنچ کر ان کو بتایا کہ یاسین شہید کی قبر ہے۔ یہ کشمیر کے مجاہد کی آخری آرام گاہ ہے۔"

میجر کی بہن ارچنا قبر کے قریب بیٹھ گئی اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جبکہ میجر راکیش دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی تھی۔ مولوی امین حیران ہو کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا کہ یاسین نے ان لوگوں پر کون سا احسان کیا تھا کہ ایک ہندو میجر احترام کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے اور ایک ہندو لڑکی اس کی قبر پر بیٹھی رو رہی ہے۔ اسے یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لگ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہندو اور وہ بھی فوجی تمام کشمیریوں کے جانی دشمن ہیں۔ ان سے کسی قسم کے انصاف اور ہمدردی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی اسے ان دونوں بہن بھائی کا یہ انداز کوئی ڈرامہ ہی لگ رہا تھا۔ اس نے آج تک کسی بھارتی کی زبان سے کسی مجاہد کے لیے ایسے الفاظ سنے تھے۔ اس نے پوچھا۔

"میجر صاحب! میں جاننا چاہوں گا کہ یہ یاسین شہید نے آپ پر کون سا احسان کیا تھا کہ جن کا بدلہ



چکانے آپ قبرستان تک چلے آئے ہیں؟''
''مولوی صاحب! میں بتاتی ہوں کہ یاسین شہید نے مجھ پر کون سا احسان کیا ہے۔''
ارچنا بولی۔ پھر اس نے بتانا شروع کیا۔
☆☆☆
ہمارے پتا جی آرمی میں کرنل تھے۔ اب وہ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں ان کی اولاد میں ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ میں راکیش بھیا سے چھوٹی ہوں۔ ہم دونوں کو بڑے ناز و نعم سے پالا گیا۔ ہم دونوں کی ہر خواہش پوری کی گئی۔ راکیش میٹرک میں تھا اور میں مڈل میں تھی۔ جب ہمارے پتا جی کا تبادلہ کشمیر کر دیا گیا۔ ہمیں اور ماتا جی کو بھی ان کے ساتھ ہی آنا پڑا۔ کشمیر کے قدرتی حسین اس کی برف پوش چوٹیوں اور دلکش نظاروں کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ وہاں ہی ہم نے تعلیم بھی حاصل کی۔ اور کشمیر کے بارے میں بہت ساری معلومات بھی ملیں۔ پتا جی کی زبانی میں یہ ہی سنتی تھی کہ کشمیر میں دہشت گرد بستے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی جان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ وہ بہت ظالم اور بے رحم ہیں۔ وہ نہ صرف بھارتی فوج کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بلکہ وہاں کے مقامی باشندوں کو بھی لوٹتے اور مارتے ہیں۔
پتاجی کی باتیں سن کر اور وہاں کے مقامی لوگوں کو دیکھ کر میں سوچتی کہ یہ مٹھی بھر دہشت گرد کیوں ہماری فوج سے ٹکر لیتے ہیں اور وہ کیا سوچ کر جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ پتاجی مجھے ان مجاہدین کی بے رحمی کی ایسی کہانیاں سناتے کہ میں ان سے نفرت کرنے لگتی۔ میں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان مجاہدین پر تحقیقات کروں گی۔ اور اصل معاملہ تک پہنچ کر دم لوں گی۔
☆☆☆
یوں ہی برسوں گزر گئے۔ پتاجی ریٹائرڈ ہو گئے اور ہم لوگ بمبئی میں رہنے لگے۔ اس عرصہ میں راکیش بھائی بھی آرمی میں بھرتی ہو گئے تھے۔ پتاجی کے ایک دوست بھی کرنل ریٹائرڈ تھے۔ ان کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ کرنل مہتا کا ایک بیٹا بلرام بھی کیپٹن تھا۔ میں نے ایک دو بار ہی اسے دیکھا تھا۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس کی حرکات ہی ایسی تھیں۔ پتا جی میری شادی بلرام سے کرنا چاہتے تھے۔ مگر میں نے بلرام کے ساتھ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بلرام مجھے پسند کرتا تھا۔ اس لیے میرے انکار نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اور ایک روز سرِ بازار مجھے روک کر وارننگ دی کہ یہ اس سے شادی سے انکار مجھے بہت مہنگا پڑے گا۔
مگر میں نے اس کی کسی دھمکی اور دھونس کی پرواہ نہ کی اور سر بازار اس کے چہرے پر تھپڑ جڑ دیا۔ اور غصہ سے بل کھاتی ہوئی گھر لوٹ آئی۔
راکیش اور بلرام کی یونٹس الگ الگ تھیں۔ پھر بھی ان میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان دنوں دونوں کی یونٹس کشمیر میں ہی موجود تھیں اور آج بھی ہیں۔ میں نے اپنی تعلیم مکمل کی تو مجھے شملہ اور کشمیر کی سیر کا شوق چرایا۔ ساتھ ہی میں کشمیری مجاہدین کی زندگی کے بارے میں بھی جاننا چاہتی تھی۔
پتا جی سے بڑی مشکل سے اجازت ملی تھی۔ مگر انھوں نے گاڑی اور ڈرائیور میرے ہمراہ کر دیا اور راکیش بھائی کو بھی اطلاع کر دی کہ میں کشمیر آ رہی ہوں۔ وہ میرا خیال رکھے۔ اور مجھے اکیلا وادی میں نہ گھومنے دے کیونکہ مجاہدین نہ صرف دہشت گرد ہیں بلکہ ہماری عورتوں کی عصمتوں کے لٹیرے بھی ہیں۔
☆☆☆
گاڑی جب کشمیر کی حدود میں داخل ہوئی تو راستے میں کئی فوجی چوکیوں پر ہماری گاڑی کو روکا گیا۔ میں بھائی کا حوالہ دیتی تو ہمیں آگے جانے دیا جاتا۔ کشمیر کی وادی میں داخل ہو کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی اور دیس میں نکل آئی ہوں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اونچے اونچے پہاڑ اور ان پر چیڑ کے لمبے لمبے درخت، صاف ستھرا آسمان اور پھر جھاگ بناتی ہوئی ندیاں۔ کشمیر کے فطری لازوال حسن نے مجھے مسحور کر دیا۔ ہمارا ڈرائیور کشمیر ہی کا رہنے والا تھا۔ مگر وہ ہندو تھا۔ اسی لیے پتا جی

نے اسے میرے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ کشمیر اور وہاں کے باشندوں کے بارے میں معلومات رکھتا تھا۔ اس لیے میں خوش تھی کہ یہ مجھے کشمیر کی خوب سیر کرائے گا۔ ابھی ہم بیس کلومیٹر ہی آگے گئے تھے کہ ہمیں ایک فوجی چوکی پر روکا گیا۔ وہاں ایک فوجی جیپ کھڑی تھی۔ اس میں ایک کیپٹن اور پانچ مسلح فوجی بھی سوار تھے۔ کیپٹن کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ جب چوکی پر مجھ سے شناخت کرانے کو کہا گیا تو میں نے اپنے بھائی کیپٹن راکیش کا نام لیا تو جیپ میں سوار کیپٹن فوراً آمڑا۔ تو میں اس کو دیکھ کر گھبرا گئی وہ کیپٹن بلرام تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔

''اس کی شناخت کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے لڑکھڑاہٹ کے انداز میں کہا۔ میں پھر چونک گئی۔ اس نے تو پی رکھی تھی۔

''تم ہوش میں تو ہو بلرام۔ میں ارچنا ہوں۔ کیپٹن راکیش کی بہن۔'' میں غصہ سے بولی۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا۔ آج تو میں نے تم سے تھپڑ کا حساب چکانا ہے۔ جو تم نے مجھے سرِ عام مارا تھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ تمھیں یہ تھپڑ بہت مہنگا پڑے گا۔ اور وہ وقت آج خود ہی چل کر میرے قدموں میں آگیا ہے۔ آج رات تم میری مہمان بنو گی۔''

''بکواس بند کرو کیپٹن بلرام۔'' میں نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جانے دو ورنہ یہ تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔'' میں نے پھر دھمکی کے انداز میں کہا۔

''کیا اچھا ہوگا اور کیا برا؟ یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ ابھی تو تم میرے ساتھ چلو۔'' اس نے میری گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''ڈرائیور! گاڑی بھگاؤ۔'' میں پوری قوت سے چیخی۔

ڈرائیور نے گاڑی تیزی سے بھگادی۔ مگر بلرام نے بھی اپنی فوجی گاڑی پر ہمارا پیچھا شروع کر دیا۔ دونوں گاڑیوں کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ میں اس وقت بہت ہی پریشانی کا شکار تھی اور اس وقت کو کوسنے لگی۔ جب میں نے کشمیر کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔

''ڈرائیور گاڑی اور تیز چلاؤ۔ وہ حرام زادہ ہمارے قریب آچکا ہے۔'' میں نے کہا۔

ڈرائیور اپنی پوری کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اندھا دھند گاڑی چلانا بھی تو خطرناک تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف اتنی گہری کھائیاں تھیں کہ ان میں گر کر زندہ رہنا ناممکن تھا۔

''ارچنا جی اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ باقی ہے کہ ہم کسی گاؤں کے قریب گاڑی روک کر آبادی کی طرف بھاگ نکلیں۔ یوں ہمارے بچنے کی امید ہوسکتی ہے۔'' ڈرائیور نے مخاطب کر کے بولا۔

''ہم کو کون پناہ دے گا؟ اور ہم وہاں کیسے پہنچیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم کوشش اور ہمت سے کسی آبادی میں پہنچ سکتے ہیں۔ جو ہوگی تو مسلمانوں کی مگر وہ ہماری حفاظت کی حامی بھر لیں تو ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔ یہ ان لوگوں کی ریت ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے تم مناسب سمجھو۔'' میں نے سب کچھ ڈرائیور کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

اس عرصہ میں ہماری گاڑی کافی آگے نکل آئی تھی۔ تاہم فوجی گاڑی مسلسل ہمارے تعاقب میں تھی۔ ایک جگہ آبادی دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی کچے راستے پر اتار لی۔ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب اس نے گاڑی روکی۔ ہم اترے اور اندھا دھند آبادی کی طرف بھاگنے لگے۔ ہم تھوڑی ہی دور پہنچے تھے کہ پیچھے سے ایک فائر ہوا۔ میں نے دیکھا ڈرائیور خون میں لت پت ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مگر میں نہ رکی اور اپنی زندگی اور عزت بچانے کی خاطر بھاگتی رہی۔ مجھے یہ یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے زندہ پکڑنا چاہیں گے۔ آخر کار میں ایک بستی میں داخل ہوگئی۔ ایک گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا تو میں اس کے اندر جا گھسی سامنے ایک عورت بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔

''آپ...... مجھے پناہ دے دو۔ بھگوان کے لیے میری زندگی خطرے میں ہے۔'' میں کہتے ہوئے اس عورت کے پاس جا کر گر پڑی۔ اس عورت نے مجھے اٹھایا۔ تسلی دی اور پوچھا۔

''کیا بات ہے بیٹی! اتنی بدحواس کیوں ہو؟''

''وہ...... مم...... میرے پیچھے۔'' میں نے بدحواسی سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اتنے میں سامنے والے کمرے کے اندر ایک بزرگ نکلے اور بولے۔

''کون ہے تمہارے پیچھے بیٹی؟''

''وہ ...... بلرام...... فوج کیپٹن۔'' میں نے بوکھلاہٹ میں جواب دیا۔

'''تم اب کوئی فکر مت کرو بیٹی۔'' انھوں نے مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تم ہماری مہمان ہو ہماری پناہ میں ہو۔ اب ہم یوں تمھیں کسی کے حوالی نہیں کریں گے۔ ہم گھر آئے مہمان کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا۔''

اتنے میں ایک دوسرے کمرے سے ایک نوجوان لڑکی نکلی اور میری اور اپنے باپ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کے باپ نے اسے بتایا کہ بیٹی! یہ ہماری مہمان ہے۔ فوج اس کے پیچھے لگی ہے تم اسے اندر گودام میں جاکر چھپادو۔''

وہ لڑکی آگے بڑھی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے کے اندر لے گئی اور پھر وہاں سے ایک تنگ اور تاریک راستے کے ذریعے ایک اندھیرے کمرے میں داخل ہوگئی۔ جہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اس لڑکی نے چراغ جلایا تو میں نے دیکھا کہ وہاں غلے کی بہت سی بوریاں پڑی تھیں۔ اس لڑکی نے مجھے ان بوریوں کے پیچھے چھپنے کو کہا۔ کہ جب تک میں نہ کہوں باہر نہیں نکلنا اور نہ ہی آواز نکالنی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے چراغ بجھایا اور وہاں سے چلی گئی۔

میں پریشان سی ہوگئی اور سوچنے لگی کہ کیا یہ لوگ واقعی میری حفاظت کریں گے؟ کہیں میں کسی نئی مشکل میں تو نہیں پھنس گئی؟ پھر میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور دل ہی دل میں بھگوان سے خیریت کی دعائیں مانگتی رہی۔ کچھ دیر ہوگئی تو باہر سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی۔ تو میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوگئی۔

''یہاں ایک لڑکی آئی تھی بڈھے! وہ کہاں ہے؟'' مجھے بلرام کی زوردار کرخت آواز سنائی دی اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

''کپتان صاحب! آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں تو کوئی لڑکی نہیں آئی۔'' بوڑھے نے کہا۔

''جھوٹ مت بول بڈھے۔ مجھے پکی اطلاع ملی ہی کہ وہ لڑکی اس گھر میں داخل ہوئی ہے۔''

بلرام کی آواز سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے میری جان مٹھی میں لے لی ہو۔

''کپتان صاحب! آپ تسلی کرلیں۔ یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔'' بوڑھے نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

''میں نے وائرلیس پر اطلاع دے دی ہے۔ مزید فوجی پہنچنے والے ہیں۔ پھر میں دیکھوں گا کہ لڑکی یہاں سے کیسے برآمد نہیں ہوتی۔'' بلرام کی غصہ بھری آواز سنائی دی۔

کچھ ہی دیر بعد کوئی اس اندھیرے کمرے میں آیا۔ اس نے چراغ روشن کیا تو میں نے دیکھا کہ یہ وہی بوڑھی عورت تھی جس نے مجھے اٹھایا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک وجیہہ، دراز قد اور نہایت ہی خوب صورت نوجوان تھا۔

''بیٹی! اُس کمینے کو معلوم ہوگیا ہے کہ تم یہاں ہو۔'' اس عورت نے کہا۔

''اب کیا ہوگا؟'' میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بیٹی تم بے فکر ہوجاؤ۔ ہم وعدہ نبھانے والوں میں سے ہیں۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے یاسین۔ یہ تمھیں گھر کے عقبی دروازے سے نکال کرلے جائے گا۔ کیونکہ یہاں اب شدید خطرہ ہے۔'' اس بوڑھی عورت نے کہا۔

''مگر آپ لوگ میری خاطر اتنا بڑا خطرہ کیوں مول رہے ہیں۔ آپ مجھ اجنبی کے لیے اپنی زندگی خطرے میں کیوں ڈال رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آئی ہوں؟'' میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

''بیٹی! ہمیں ان باتوں کی پروا نہیں ہے۔ ہم

نے تمھیں پناہ دی ہے۔ اب اگر ہماری بوٹیاں بھی نوچ لی جائیں تو ہم تمھیں کسی کے حوالے نہیں کریں گے۔'' اس بوڑھی عورت کا لہجہ مضبوط اور اٹل تھا۔ پھر وہ اپنے بیٹے سے کہنے لگی۔

''بیٹا یاسین! اس لڑکی کی حفاظت اب ہماری ذمہ داری ہے تم نے اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرنی ہے۔ اس لڑکی پر آنچ آئی تو سمجھ پورے کشمیر کی مہمان نوازی پر داغ لگ جائے گا۔ یہ بھی یاد رکھو۔ اگر اس لڑکی کو کچھ ہوگیا اور تم زندہ بچ کر لوٹ آئے تو میں اپنا دودھ تمھیں کبھی نہ بخشوں گی۔''

''آپ فکر نہ کریں ماں جی! میں اپنی ریت نبھانا خوب جانتا ہوں۔ میں نے اس اجنبی بہن کو اس کے ٹھکانے پر پہنچا کر ہی لوٹوں گا۔'' یاسین نے تسلی دیتے ہوئے ماں سے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا اور کہنے لگا۔

''جلدی کرو بہن! اس سے پہلے کہ بھارتی فوج کی کمک پہنچ جائے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' یاسین نے اپنی رائفل اٹھائی اور مجھے چلنے کو کہا۔

''جاؤ بٹیا! میں تمھیں اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔'' اس کی ماں نے کہا۔

ہم بڑی احتیاط کے ساتھ گھر کے عقبی دروازے سے باہر نکلے۔ تھوڑی آگے جا کر یاسین نے چلتے چلتے پوچھا۔ ''کہاں جاؤ گی؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھر بولا۔ ''تم نے جواب نہیں دیا کہ تم نے کہاں جانا ہے؟''

''میں ہندو ہوں اور ایک بھارتی کیپٹن راکیش کی بہن ہوں۔ وہ کپواڑہ میں رہتا ہے۔ میں نے اس کے پاس جانا ہے۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تو تم اب کپواڑہ جاؤ گی؟ تمہارے پاس بھائی کا پتا ہے؟'' یاسین نے بے نیازی سے پوچھا۔ جیسے ایک کیپٹن کی بہن ہونا اس کے لیے حیرت کی کوئی بات ہی نہ ہو۔

''ہاں میں بھائی کے پاس کپواڑہ جانا چاہتی ہوں اس کا پتا مجھے معلوم ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''چلتی رہو تم میرے ساتھ۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ باڑیاں'' وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں اس سے گھوڑا ادھار لے کر تمھیں کپواڑہ چھوڑ آؤں گا۔'' یاسین نے کہا۔

''یاسین بھائی! اب اگر تم چاہو تو بھارتی فوجیوں کی زیادتیوں کا بدلہ ایک کیپٹن کی بہن سے لے سکتے ہو۔ مجھے یرغمال بنا کے۔''

''ارچنا بہن! شاید تمھیں معلوم نہیں کہ ہم ایک باوقار اور اصول پسند قوم ہیں۔ ہم مر تو سکتے ہیں لیکن دشمن کی ہستی خواتین اور بچوں کو قتل کرنا ہمیں کسی حال میں بھی منظور نہیں۔ ہمارا مذہب اور ہمارا معاشرہ اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔''

میں مطمئن اور خاموش ہوگئی۔ ہم چلتے رہے۔ شدید سردی اور بھوک کی وجہ سے میری رفتار دھیمی پڑنے لگی تھی کہ یاسین بولا۔

''جلدی چلو۔ ہمیں رات کی تاریکی میں ہی کپواڑہ پہنچنا ہے۔'' یاسین نے میری سست رفتار دیکھ کر کہا۔ پھر اس نے اپنا کوٹ اتار کر مجھے پہنا دیا۔ کیونکہ میرے پاس تو دوپٹہ تھا۔ جس وجہ سے میں سردی سے کانپنے لگی تھی۔ ہم کچھ دیر بعد ایک پکی سڑک پر آگئے۔ اب میں آسانی سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ کافی آگے جا کر ہمیں دو بھارتی فوجیوں نے روک لیا۔ تو میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''تم لوگ کون ہو؟ اور اس وقت کہاں جا رہے ہو؟'' انھوں نے ہمیں روک کر پوچھا۔

مہاراج! یہ میری پتنی ہے شدید بیمار ہے نزدیکی قصبے دوائی لینے جا رہا ہوں۔'' یاسین نے بہانہ بنایا۔

''اچھا۔ میں بھی ذرا دیکھو تمہاری پتنی کو۔'' ایک فوجی شیطانی لہجے میں بولا۔ اور میری طرف بڑھنے لگا۔ یاسین کو غصہ آگیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی رائفل کا بٹ اس کے سر پر مارا۔ اس فوجی کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

''ارچنا! اب جلدی سے یہاں سے بھاگ نکلو۔'' یاسین نے کہا تو ہم نے سڑک چھوڑی اور جنگل میں گھس گئے۔ بھاگتے ہوئے دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پیچھے سے فائرنگ شروع ہوگئی۔

شاید ان لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ یاسین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم بھاگتے رہے۔ میں بدحواس ہو کر پتھریلے راستے پر گر پڑی مگر پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

یاسین کہنے لگا۔ ''اس طرح تو ہم مارے جائیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے کندھے پر لادا اور بھاگنے لگا۔ بھارتی فوجی کتوں کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جب فائرنگ بڑھی تو ہم ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہوگئے۔

''اب تو ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔'' یاسین نے یہ کہہ کر رائفل لوڈ کرنے لگا اور پھر بولا۔ ''ارچنا! تم فکر مت کرو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔''

پھر وہ ٹیلے کی اوٹ سے جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ دس منٹ گزر گئے تھے اچانک ایک گولی اس کا دایاں کندھا چیرتے ہوئے نکل گئی۔ لیکن وہ بہادری سے لڑتا رہا۔ پھر اس نے فائرنگ کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنے کی ترکیب اپنائی۔ وہ جوابی فائرنگ کرتا ہوا آخر ٹیلے تک جا پہنچا میں بھی اس کے ہمراہ تھی۔ میں نے دیکھا۔ ڈھلوان کی طرف نیچے کسی آبادی کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یاسین کا جسم خون سے تر ہوگیا تھا۔ اس کی ساری قمیض خون سے بھیگ گئی تھی۔ اوپر سے سردی۔

''بھائی۔ یہ خون۔'' میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' وہ اپنی تکلیف چھپاتے ہوئے بولا۔ ''ہم اب آبادی کی طرف جائیں گے۔'' اس نے روشنی والی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے اسے اپنی مطلوبہ شے مل گئی ہو۔ بھارتی فوجیوں کی فائرنگ بدستور جاری تھی کہ اچانک ایک اور گولی اس کے بازو میں پیوست ہوگئی۔ اس کے حلق سے آہ نکل گئی لیکن اس نے اپنی چیخ دبالی۔

''ارچنا بہن!'' اس نے سرگوشی کے انداز مین کہا۔ ''میرے پاس گولیاں بہت کم رہ گئی ہیں۔ میں ان کو روک رکھتا ہوں۔ تم اس گاؤں چلی جاؤ۔ جہاں روشنیاں نظر آرہی ہیں۔ وہاں مسجد کی پشت پر میرے دوست جمیل کا گھر ہے۔ اسے یہ ریشمی رومال دے دینا اور کہنا کہ مجھے یاسین نے بھیجا ہے۔'' اس نے جیب سے ایک کڑھائی والا رومال نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہ رومال دیکھ کر جان جائے گا اور تمھیں تمہارے بھائی کے پاس پہنچا دے گا۔'' اس نے نحیف آواز میں کہا۔

''لیکن یاسین بھائی۔ آپ تو زخمی ہیں۔ میں آپ کو چھوڑ کر۔۔۔۔''

''تم میری فکر مت کرو۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ جاؤ۔ دیر مت کرو۔ میرے پاس اب مزید وقت نہیں ہے۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''میں اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت فائرنگ مزید بڑھ گئی۔ یاسین کے اصرار پر مجھے اٹھنا پڑا مگر میرے پاؤں تو جیسے وہاں ہی چپک گئے تھے۔

''جاؤ ارچنا جاؤ۔ ورنہ تم بھی یہیں ماری جاؤ گی۔ دیر مت کرو۔ جاؤ۔''

☆☆☆

میں اسے خون میں لت پت چھوڑ کر گاؤں جا پہنچی۔ یاسین کے دوست جمیل نے جب اس رومال کو دیکھا اور میری بپتا سنی تو وہ سب سمجھ گیا۔ اس نے بھی میری حفاظت کی اور مجھے راکیش بھائی کے پاس پہنچا دیا۔

☆☆☆

ارچنا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''مولوی صاحب! یاسین ایک عظیم مجاہد تھا۔ میں اس کی ماں کے کہے ہوئے الفاظ کبھی نہ بھول پاؤں گی۔ آہ۔ کتنے عظیم ہیں یہ لوگ جو اپنا عہد نبھانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں۔ یہ دہشت گرد نہیں ہیں بھگوان کی سوگند۔ یہ عظیم انسان ہیں۔'' ارچنا کی ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کیپٹن راکیش کی آنکھیں بھی برسنے لگی تھیں۔ وہ بھی سسکیاں لیتے

ہوئے بولا۔

"مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ دہشت گرد یہ لوگ نہیں بلکہ ہم ہیں۔ کشمیری خواتین کے ساتھ زیادتی کرتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر یہی سب کچھ ہماری بہن، بیوی یا بیٹی کے ساتھ ہو تو تب ہمیں کیسا لگے گا۔ آہ یاسین! آج تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور مجھے بھی میرا اصلی چہرہ دکھا دیا ہے۔ تم لوگ حق پر ہو۔ کشمیر تمہارا ہے۔ اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہ بہت جلد آزاد ہوگا۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"مولوی صاحب! آج سے میں نے فوج کی نوکری چھوڑ رہا ہوں۔ میں اور ارچنا دونوں مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اسلام میں داخل کریں اب ہم لوٹ کر نہیں جائیں گے۔ اب ہمارا جینا مرنا کشمیریوں کے ساتھ ہے۔"

مولوی امین نے ان دونوں بہن بھائیوں کو کلمہ پڑھایا اور ان کے نام بھی مسلمانوں والے رکھ دیے۔ اس کے بعد کیپٹن راکش نے فوجی انداز میں تن کر یاسین کی قبر کو سلوٹ کیا اور تھوڑی دیر اسی حالت میں کھڑا رہا۔ جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔ اس نے پھر اپنے سر سے فوجی ٹوپی اتاری اور یاسین کی قبر کے قدموں میں رکھ دی۔ پھر اس نے مولوی صاحب کا دیا ہوا کشمیری لباس پہنا۔ اس کے بعد اس نے فوجی وردی اور ٹوپی کو ایک طرف رکھ کر آگ لگا دی۔

راکیش۔ ارچنا اور مولوی امین۔ وردی کو جلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ اتنے میں بلرام اور پانچ سپاہیوں کے ہمراہ جیپ میں سوار وہاں پہنچا۔ انھوں نے بغیر کوئی بات کیے۔ بندوقوں کے منہ کھول دیے گولیوں کی بوچھاڑ نے راکیش، ارچنا اور مولوی امین کی زندگیاں چھین لیں۔ اور کپواڑہ کے قبرستان میں تین شہیدوں کی قبروں کا اضافہ ہوگیا۔ دھند چھٹنے لگی تھی۔ سورج نکل آیا تھا اور اس کی کرنیں اعلان کررہی تھیں کہ غلامی کی دھند بہت جلد چھٹنے والی ہے۔

☆☆☆

چھٹی طویل سچ بیانی

چندر سے عبدالرحمن تک...

نفیسہ سعید

اُس نوجوان کا قصہ ”عجب“ جسے قدرت گمراہی سے حق کی جانب لے آئی تھی

”کوئی بھی انسان خود بُرا نہیں ہوتا۔ بُرے تو اس کے وہ اعمال ہوتے ہیں جو اسے بُرا بنا دیتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ بڑائی سے نفرت کرو۔ بُرے انسان سے نہیں اور یہ ہی ہمارے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں انسانوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ نفرت نہیں۔“

عبدالرحمن بڑے جذب کے عالم میں درس دے رہے تھے۔ بولتے بولتے ان کی آواز میں رقت آ گئی اور یاد اللہ میں ان کی آنکھ سے بہنے والے آنسو اُن کی سفید داڑھی کو بھگو گئے۔ درس سننے والے تمام افراد نہایت ہی ادب اور عقیدت و احترام سے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے عبدالرحمن کے سانولے سلونے چہرے پر دکھ اور کرب کے گہرے سائے نظر آتے۔ لیکن اندر بیٹھی فاطمہ کو اپنے بھائی کے لہجے میں بولتا دکھ اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”تیرا کاکھ نہ رہے بدذات، تُو بل کی رقم بھی چرس بھی پی گیا۔ اب جو بجلی کٹ گئی تو میں کرم جلی کہاں دھکے کھاتی پھروں گی۔“ سکھاں نے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

”کس کو سنا رہی ہے اماں۔ وہ تو بے سدھ پڑا ہے، کیا فائدہ تیرے رونے پیٹنے کا، خوامخواہ ہلکان ہو رہی ہے۔ اسے دیکھ سارے غموں سے بے فکر کیسے نشے میں دھت ہے۔“ شانتی نے ماں کو چپ کرواتے ہوئے بے زاری سے کہا۔ جبکہ اس سارے ہنگامہ سے بے خبر چندر فرش پر ہی لڑھک گیا تھا۔ اب پتا نہیں یہ نیند کا غلبہ تھا یا نشے کا، جو بھی تھا وہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر فرش پر دھت پڑا تھا۔

”اسے کیا پتا کس طرح میں دن رات محنت مزدوری کر کے ان کا پیٹ کا دوزخ بھر رہی ہوں۔ یہ بے غیرت تو جہاں موقع ملتا ہے میری محنت کی کمائی چرس میں اڑا دیتا ہے۔ ایسی اولاد سے تو میں بے اولاد ہی اچھی تھی۔“

سکھاں دیوار سے ٹیک لگا کر وہیں فرش پر ہی ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئی۔ تھکاوٹ اس کے لہجے میں عیاں تھی۔

”میں نے نورین بی بی کے سارے کپڑے سلائی کر دیے ہیں۔ کام پر جاتے ہوئے لے جانا اور جو سلائی کے پیسے ملیں ان کا بل جمع کروا دینا۔ اب اِس چرسی کے ہاتھ میں کوئی پیسہ نہ دینا۔ خوامخواہ برباد کرنے کے لیے۔“

شانتی نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے اک نفرت بھری نگاہ اپنے بھائی پر ڈالی اور مشین ڈھک کر رکھ دی۔ سارے بکھرے ہوئے کپڑے سمیٹے اور برآمدے ہی

کے کونے میں بنی چھوٹی سی رسوئی کی جانب چل دی تا کہ روٹی پکا کر گھر کے باقی افراد کے پیٹ کو ایندھن فراہم کر سکے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی ماں نے صبح تک اسی طرح فرش پر بیٹھ کر اپنا غم غلط کرنا ہے اور مشکل ہی تھا جواب سکھاں کے حلق سے ایک نوالہ نیچے اترتا۔

☆☆☆

''ماں مجھے پچاس روپے دے دے صرف پچاس



روپے۔'' چندر جانے کب سے سکھاں کی منت ساجت کر رہا تھا۔ اس کا مطالبہ دو سو سے شروع ہوا تھا اور آہستہ آہستہ وہ پچاس روپے پر آ گیا تھا۔ اور اب باقاعدہ اپنی ماں کے پاؤں پکڑے بیٹھا تھا۔

''میرے پاس ایک دس روپے نہیں ہیں میں تجھے پچاس روپے کہاں سے لا دوں؟'' سکھاں نے بے بسی سے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''شانتی سے لے دے۔ شام کو اس کی سلائی کے پیسے آئے ہیں۔ میں اسے واپس کر دوں گا۔''

چندر نے بہن کی جانب دیکھتے ہوئے حتیٰ الامکان اپنی آواز کو دھیما کرتے ہوئے کہا۔ چندر کی بات سنتے ہی شانتی کا مشین چلاتا ہاتھ ذرا سی دیر کو ست پڑا اور اس نے مڑ کر ایک تیکھی نظر چندر پر ڈالی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی کیونکہ وہ اس وقت کسی قسم کا کوئی لڑائی جھگڑا نہ چاہتی تھی۔

''ان پیسوں کا میں گھر کے لیے راشن لے آئی جو تیرے نشے سے زیادہ ضروری تھا۔'' سکھاں نے رکھائی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھ مائی یہ تو اچھا نہیں کر رہی میرے ساتھ۔ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔'' سکھاں کے جواب سے یک دم ہی چندر غصہ میں آ گیا۔

''کیا اچھا نہیں کر رہی، بول کیا اچھا نہیں کر رہی میں

تیرے ساتھ۔ بڑا آیا بڑا آیا میرے ساتھ بُرا کرنے والا۔" سکھاں نے غصہ سے اسے پرے کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے پیٹ کا دوزخ میری جان سے زیادہ ضروری ہے۔ کیسی ماں ہو تم! بیٹا مر رہا ہے اور تمہیں احساس نہیں۔" اب وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور غصہ کی زیادتی سے اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کچھ ہو اور وہ اپنی ماں کو دے مارے۔ شانتی اس کا غصہ دیکھ کر گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مبادا کہیں وہ غصہ میں کوئی حرکت ہی نہ کر دے۔

"یہ تُو ہی ہے جس نے ماں کو سکھا سکھا کر میرے خلاف کیا ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ اب چندر اس کی جانب غصہ سے دیکھ کر پھنکارا۔

"مجھ پر تیری اس بکواس کا کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ جا اتنی غیرت ہے تو کما کر دکھا پھر میں تجھے مانوں، نکمے کو ہاتھ پھیلانے والا اتنی باتیں کرتا اچھا نہیں لگتا۔" شانتی نے اسے دوبدو جواب دیتے ہوئے کہا۔ چندر کچھ دیر خاموش کھڑا رہ کر شانتی کو خونخوار نگاہوں سے گھورتا رہا اور پھر پھنکارتا ہوا بولا۔

"تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔" ساتھ ہی ماں کو دھکا دیتا ہوا وہ نہایت ہی جارحانہ انداز سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پھر اگلی آنے والی صبح اس گھر کے لیے ایک نئی آفت لے کر آئی۔ صبح اٹھتے ہی شانتی نے دھائی مچا دی کیونکہ اس کی سلائی مشین اپنی جگہ پر نہ تھی۔ جانے چندر ظالم رات کس وقت آیا اور اس کی مشین اٹھا کر لے گیا۔ شانتی کا روزمرہ کا معمول تھا۔ صبح سویرے اُٹھ کر بھگوان کی پوجا کرتی اور پھر اپنی مشین کو صاف کرنے کے بعد گھر کا کوئی اور کام کرتی، آج بھی ایسا ہی ہوا جب وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر مشین کی جانب آئی تو خالی جگہ سے منہ چڑا رہی تھی۔ شانتی تو مانو تڑپ ہی اٹھی۔ مشین میں تو اس کی جان تھی۔ اس کے بنا تو وہ بالکل بے کار تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ سوائے رونے پیٹنے کے وہ ماں بیٹیاں کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ سارا دن ہی غم اور دکھ کی کیفیت میں نکل گیا۔ مشین کے غم میں ان دونوں نے کچھ نہ کھایا اور نہ ہی معذور روشن کو بھوک لگی۔ حالانکہ وہ تو بھوک کا بہت ہی کچا تھا یہاں تک کہ دونوں چھوٹوں نے بھی کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ غرض سارا ہی گھر ایک سوگ کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ایسے جیسے ان کا کوئی پیارا مر گیا ہو لیکن کب تک پیٹ تو آخر ایندھن مانگتا ہے۔ یہاں تو مرنے والوں کا صبر آ جاتا ہے۔ یہ تو پھر ایک بے جان مشین تھی۔ رات تک شانتی کو خود ہی احساس ہوا کہ باپ اور چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے دکھ میں بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ لہٰذا خاموشی سے اٹھی، ڈبے میں موجود چاول ابالے اور اچار کے ساتھ سب کو کھانے کے لیے دیے۔ لیکن اس کا اپنا دل بالکل نہ چاہ رہا تھا۔ اسے تو صرف یہ احساس مارے ڈال رہا تھا کہ اب مشین کے لیے اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ اور جو کپڑوں کا ڈھیر لگا ہے وہ کیسے سلے گا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھلے سکھاں کام کر کے گھر واپس لوٹی تو ہاتھ میں پکڑے شاپرز جو مختلف گھروں سے لائی تھی۔ ننھی کے حوالے کر دیے۔

"شانتی کہاں ہے۔" سکھاں نے یہاں وہاں نظر دوڑاتے ہوئے ننھی سے سوال کیا۔

"صبح سے ہی اندر تخت پر لیٹی ہیں۔ نہ کچھ کھایا اور نہ ہی پیا۔" ننھی جواب دے کر جلدی جلدی تھیلیوں میں جھانکنے لگی تاکہ اپنی من پسند کھانے کی چیز پہلے ہی الگ کر سکے۔ سکھاں تھکی ماندی اندر جا کر شانتی کے پاس بیٹھ گئی۔ جس نے ماں کو دیکھتے ہی کروٹ بدل لی۔

"کپڑے واپس کر آئی ہے اماں۔" شانتی نے دھیرے سے سوال کیا اس کے لہجے کا دکھ سکھاں کا دل زخمی کر گیا۔

"ہاں باجی نورین نے تیرے لیے ایک کام بتایا ہے۔ اگر تُو نے کرنا ہو تو۔ اب مشین تو ہے نہیں جو سلائی کرے گی۔" اتنا کہہ کر سکھاں نے شانتی کے چہرے پر اِک نظر ڈالی جہاں کوئی بھی تاثر نہ تھا۔ بالکل سپاٹ اور بے تاثر چہرہ تھا۔

"کیا کام بتایا ہے وہ بتاؤ۔" چارپائی پر بیٹھتے

ہوئے وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوئی۔

''نورین بی بی کی جاننے والی کسی اسکول میں استانی ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بچہ ہے۔ بس وہ ہی سنبھالنا ہے۔ صبح سات بجے سے چار بجے تک۔ تنخواہ بھی مناسب ہے اور پھر کام بھی زیادہ نہیں۔ لوگ بھی اعتماد والے ہیں۔ نورین بی بی انھیں بہت عرصے سے جانتی ہیں شاید وہ نورین بی بی کے ہی رشتہ دار ہیں۔ کہے تو حامی بھرلوں؟ اب یہ تیری مرضی پر ہے میری کوئی جور زبردستی نہیں۔''

سکھاں نے امید بھری نظروں سے شانتی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شانتی منہ سے تو کچھ نہ بولی۔ بس صرف گردن اثبات میں ہلادی اور سکھاں کے لیے یہ بھی کافی تھا۔

☆☆☆

اور پھر زندگی اسی مقام پر آ گئی۔ جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ تو بچپن سے ہی اپنی ماں جیسی محنتی تھی۔ آٹھ سال کی عمر سے ماں کے ساتھ کام پر جارہی تھی اور اپنے شوق کی بنا پر تیرہ سال کی عمر میں کام کے ساتھ ساتھ قریبی سرکاری مرکز سے سلائی بھی سیکھنے لگی تھی اور پھر ایک بیگم کی کوششوں سے اسے فلاحی مرکز کی جانب سے مفت سلائی مشین بھی مل گئی۔ مانو اس کی تو ساری مرادیں ہی پوری ہوگئیں اور پھر جو اس نے مشین سنبھالی تو کبھی نہ تھکی۔ ماں کے کام پر جاتے ہی ننھی اور مٹھو کو ناشتا کرواکر قریبی سرکاری اسکول بھیجتی۔ ابا کو ناشتا کرواکر پورا گھر صاف کرتی، جلدی جلدی کپڑے، برتن دھوتی اور پھر جو سلائی مشین سنبھالتی تو اس وقت چھوڑتی جب سب گھر آجاتے۔ جلدی جلدی روٹی ڈالتی اور رات کے سالن کے ساتھ سب کو کھانا دے کر پھر مشین سنبھال لیتی۔ رات کا کام سکھاں کی ذمہ داری تھا۔ مکان کا کرایہ بھی تھا۔ بجلی، گیس کے بل نے الگ کمر توڑ رکھی تھی اوپر سے پانچ سال سے روشن کی معذوری نے اخراجات میں اور اضافہ کردیا تھا۔ اس کی دوا دارو کا خرچہ اضافی تھا۔ جب تک روشن تندرست تھا سب ٹھیک تھا لیکن اس کے معذور ہوتے ہی نہ جانے کیسے چندر کو نشے کی لت لگ گئی۔ اچھا بھلا سرکاری اسکول جاتا تھا باپ کے حادثے کے بعد ماں نے اسکول چھڑوا کر میکینک کی دکان پر بیٹھا دیا۔ اور یہیں سے اُسے چرس پینے کی لت لگ گئی۔ جس نے چندر کے ساتھ ساتھ سارے گھر والوں کی زندگی کو بھی جہنم بنادیا۔ جب اسے نشے کے لیے کہیں سے پیسہ نہ ملتا تو وہ گھر میں اک ہنگامہ کھڑا کردیتا۔ گالی گلوچ کرتا یہاں تک کہ ماں اور بہن پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتا۔ چرس کے علاوہ وہ کچھ اور منشیات کا استعمال بھی کرنے لگا تھا۔ وہ خود تو نشہ کرکے دنیا جہاں سے بے خبر ہوجاتا اور گھر والوں کو ایک عذاب میں مبتلا کردیتا۔ اس نے خود تو اپنے حالات کو نشہ میں گھول کر پی لیا تھا۔ لیکن اس کی اس عادت نے ماں، باپ اور بہن بھائیوں کی زندگی کو مزید اجیرن کردیا تھا۔ جس کا اُسے کوئی احساس نہ تھا۔ ایک شانتی بھی جس کا ارمان تھا کہ پیسے جمع کرکے ایک سلائی مرکز کھولے گی لیکن دوسرے ادھورے خوابوں کی طرح اس کا یہ خواب بھی ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ خواب دیکھنا ہر انسان کا حق ہے۔ لیکن ان کی تعبیر ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔

☆☆☆

پانچ دن تک چندر کا کوئی پتا نہ چلا سب جانتے تھے کہ مشین بیچ کر جو پیسے ملے ہوں گے اس کی چرس خرید کر کسی درگاہ کے باہر پڑا ہوگا۔ جہاں دی جانے والی خیرات کی دیگوں کے چاول کھا کر وہیں احاطے میں اپنے جیسے دیگر چرسیوں کے ساتھ وہ دنیا مافیہا سے بے خبر ہوگا۔ روشن جو ایک رات چندر کے گھر نہ آنے پر پریشان ہوا اٹھتا تھا۔ اس بار بالکل خاموش تھا۔ ہاں کبھی کبھی سکھاں کو جو یاد آجاتا تو اس کے منہ سے کوسنے ہی نکلا کرتے۔ سوائے بددعاؤں کے اس کی زبان پر کبھی بھی چندر کے لیے کوئی الفاظ نہ آئے اکثر بیٹھے بیٹھے وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی اور پھر کہتی۔

''تیرا ناس جائے چندر! تو نے ہمیں کسی جوگا نہ چھوڑا۔ اور رہی بے چاری شانتی اس کے دل سے تو اپنی مشین کا غم ہی نہ جاتا تھا باقی وہ چندر کو کیا یاد رکھتی۔ اس کے روز و شب تو پھر گزرے برسوں جیسے ہوگئے تھے۔ وہ ہی صبح سویرے اُٹھ کر کام پر جانا چار پیسوں کے لیے لوگوں کی باتیں سننا جو بھی استانی جی خوش ہتی تو وارے نیارے اور اگر جو موڈ خراب ہوا تو بے چاری شانتی کی

شامت۔ پانچ بجے شام جب وہ سکھاں کے ساتھ گھر آتی تو کسی سے بات کرنے کو بھی من نہ کرتا۔ سر شام ہی خاموشی سے منہ سر لپیٹ کر پڑ جاتی اور سکھاں اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی اور یہ ہی وقت ہوتا جب وہ چندر کو جھولیاں بھر بھر بد دعائیں دیا کرتی اور پھر خود ہی رونے لگتی۔ وہ جانتی تھی شانتی کو سلائی مشین سے عشق تھا۔ اور اب جو مشین ہی نہ رہی تو جانو دنیا میں اس کے جینے کا کوئی مقصد ہی نہ رہا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب باہر سے آنے والے شور کی آواز سے شانتی کی آنکھ کھل گئی وہ یک دم گھبرا کر تخت سے اُٹھی۔ پہلا خیال اس کے دل میں روشن کا آیا کہیں ابا کو کچھ نہ ہو گیا ہو۔ نیچے فرش پر مٹھو اور ننھی بچپن کی بے خبر نیند سو رہے تھے۔ شانتی احتیاط سے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے کمرے کے دروازے تک جا پہنچی۔ ٹاٹ کا پردہ اٹھاتے ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے رات کے اس سمے اسے خاصا بدمزہ کیا۔ سامنے ہی چندر کھڑا تھا۔ جسے ابا اپنی بے ساکھی سے خوب پیٹ رہا تھا اور وہ چپ چاپ پٹ رہا تھا۔ حیرت شانتی کو چندر کے پٹنے پر نہ تھی بلکہ روشن کے پیٹنے پر تھی۔ چندر تو ایسا ہی تھا نشے کی حالت میں بھیگی بلی بن جاتا اور جو نشہ ٹوٹنے لگتا تو الامان لیکن روشن تو پچھلے پانچ سالوں سے معذوری کے بعد کبھی اونچی آواز میں نہ بولا تھا۔ چہ جائیکہ اس قدر غصہ کا اظہار...... غصہ کی شدت سے وہ ہانپ رہا تھا اور پاس ہی کھڑی سکھاں جھولیاں بھر بھر کر بیٹے کو بددعائیں دے رہی تھی کچھ دیر تو شانتی نے خاموشی سے کھڑے ہو کر اس ہنگامہ کو دیکھا آخر کار اس سے برداشت نہ ہوا خاموشی سے آگے بڑھ کر اس نے روشن کا بیساکھی والا ہاتھ تھام لیا۔

”جانے دے ابا! تُو کیوں اپنا آپ خراب کرتا ہے۔ چھوڑ اسے اپنے کیے کی خود بھگتے گا۔“ روشن ہانپتا کانپتا شانتی کے سہارے پاس پڑی چارپائی پر گر گیا۔ شانتی نے ایک حقارت بھری نگاہ اپنے بھائی پر ڈالی اور قریب ہی موجود مٹکے سے کٹورا بھر کر باپ کو پانی دیا جو وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

”اس بے غیرت سے کہہ ابھی نکل جائے میرے گھر سے اور دوبارہ کبھی یہاں واپس نہ آئے مر گیا یہ ہمارے لیے۔“

”رات رہ لینے دے ابا میں اتنی رات کو کہاں جاؤں گا۔ بس ایک رات رحم کر دے۔“ چندر نے گھگھیاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”وہیں جا...... جہاں اتنے دنوں سے پڑا تھا۔ میرے گھر سے چلا جا۔ ہمیں تیری ضرورت نہیں۔“ روشن نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”درگاہ پر تو پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر نکلا ہوں۔ رات رہ لینے دے ابا۔ میں دن چڑھتے ہی نکل جاؤں گا۔ اماں تو ہی سمجھا ابا کو۔ ابھی باہر نکلا تو پولیس پکڑ لے گی۔ سب کو اٹھا کر لے گئی ہے۔“ باپ سے بات کرتے کرتے اُس نے اپنا رخ ماں کی جانب موڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ماں کو بلیک میل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن جانے کیوں آج تو سکھاں کا دل بھی پتھر ہو چکا تھا۔

”تیرا ابا ٹھیک کہتا ہے۔ تو جا یہاں سے۔ اب ہمارے گھر میں کچھ نہیں ہے سوائے ان بچوں کے اور تیرے جیسا کم ظرف شیطان صفت شخص کسی کا سگا نہیں ہوتا۔ جانے تُو کیا سوچ کر آج گھر آیا ہے۔ جا چلا جا چندر۔ میں سمجھوں گی تو مر گیا کیونکہ اگر تو زندہ رہا تو ہم سب کو مار دے گا تو، تو۔ میرے بچے اپنے نشے کے لیے بیچ دے گا۔ چلا جا ورنہ میں خود تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“ روتے روتے سکھاں وہیں فرش پر بیٹھ گئی چندر نے ایک نظر ماں اور باپ کی طرف دیکھا اور پھر ایک امید بھری نگاہ بہن پر ڈالی لیکن ہر طرف واضح انکار دیکھ کر نشے کی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

وہ کتنی دیر سے پیدل چل رہا تھا اسی طرح چلتے چلتے وہ قبرستان سے ملحق خالی میدان میں پہنچ گیا۔ یہ غالباً کھیل کا میدان تھا۔ تھک ہار کر اس نے قبرستان کی دیوار سے ٹیک لگائی اور ٹانگیں لمبی کر کے سو گیا۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا جب کسی نے اُسے آواز دے کر جگایا وہ

نیند میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔
"بابا کھانا کھالو۔" نہ جانے وہ کون تھی جو چندر کی بڑھی ہوئی شیو سے دھوکا کھا گئی۔ چندر نے چندھی چندھی آنکھیں کھول کر اس کی جانب تکا۔ ایک عورت تھی ہاتھ میں رکابی لیے ہوئے کھڑی تھی۔ یکا یک چندر کو بھوک کا احساس ہوا اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ تھام لی۔ میٹھے چاول شاید کسی نذر و نیاز کے تھے، وہ خاموشی سے کھا گیا۔ اور اب یہ اس کا معمول بن گیا۔ صبح اُٹھتا یہاں وہاں پھرتا کبھی کسی مین ہول کا ڈھکن چراتا، کبھی کسی کھمبے سے بلب اتار لیتا، کبھی کسی کے گھر کے باہر سے جالی کا ڈھکن نکال لیتا، اور بیچ کر نشہ پورا کرتا لیکن شام ہوتے ہی اپنی مخصوص جگہ آجاتا جہاں کوئی نہ کوئی کھانا دے جاتا۔ اب وہ درگاہ جانے سے ڈرتا تھا کہیں جو اگر پولیس پکڑ کر لے گئی تو پیچھے آنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ یہ سوچ اُسے درگاہ کی جانب جانے سے روکتی تھی اور اب تو اسی جگہ اُسے اپنے مقدر کا رزق بیٹھے بٹھائے ہی ملنے لگا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی کہیں اور دھکے کھانے کی اسی طرح نہ جانے کتنے دن بیت گئے۔

ایک دن جب وہ عورت کھانا لائی تو کچھ پریشان تھی۔ کھانا رکھتے ہی وہ چندر کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ "بابا جی میرے لیے دعا کریں اللہ میری پریشانی دور کرے۔" وہ رو رہی تھی۔

"حق اللہ...... جا اللہ نے تیری سن لی۔" چندر نے بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے درگاہ سے سیکھا ایک نعرہ بلند کیا اور خدا کی کرنی صبح ہوتے ہی اس عورت کا شوہر جیل سے رہا ہو گیا۔

اب تو جیسے بابا جی کے نام کا ڈنکا پورے محلے میں بج اٹھا۔ اس عورت کی زبانی چار سو بابا جی کے کارناموں کی کہانیاں پھیل گئیں۔ شام ہوتے ہی چندر کے واپس آنے پر آس پاس سے کچے ایمان والی اندھی عقیدت مند عورتیں اس کے گرد جمع ہو جاتیں اور اپنے لیے دعاؤں کا کہتیں۔ وہ تو اس وقت چرس کے نشے میں سرشار ہوتا خود کو کوئی (نعوذ باللہ) پہنچی ہوئی ہستی سمجھتا۔ خوب حق اللہ کے نعرے لگاتا اور دعائیں دیے جاتا۔

"جا اللہ تجھے چاند سا بیٹا دے۔ اللہ تیری بیٹی کا نصیب جلد کھولے۔ تیرے میاں کی نوکری جلد ہی لگے گی۔ تیرا بیٹا بہو کو چھوڑ دے گا۔"

غرض اسی طرح کے بے شمار مسائل عورتوں کے پاس ہوتے جنھیں سن کر بابا جی دعائیں دیتے نہ تھکتے اب اللہ کی کرنی جو کام ہونے والا ہوتا وہ ضرور ہو جاتا اور اسی نہ ائی کام میں نام بابا چندر کا آجاتا، جس کی ماں اسی دن کو کوستی تھی جس دن اس نے یہ بیٹا جنم دیا تھا۔

آہستہ آہستہ میدان والا بابا آس پاس مشہور ہوتا گیا۔

ایک دن میونسپلٹی والے آئے میدان خالی کروانے چندر کے عقیدت مندوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا لیکن "بابا" کو وہاں سے نہ جانے دیا۔ یہاں تک کہ بابا کے کسی عقیدت مند نے اسے دھوپ سے بچانے کے لیے ایک سائبان سا بھی بنا دیا۔ جو پہلے تو کالے کپڑے کا تھا۔ پھر جانے کس نے کالے کی جگہ سائبان کا کپڑا ہرا کر دیا اور قریب ہی ایک جھنڈا بھی گاڑ دیا۔ چندر کی بدحالی جاہل عقیدت مندوں نے خوش حالی میں تبدیل کر دی۔ اب وہ ہر وقت ہرا چوغا پہنے رہتا۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا جو وہ عبداللہ شاہ غازی سے لایا تھا۔ سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح جس کے دانوں پر سوائے حق اللہ کے وہ کچھ پڑھنا نہ جانتا تھا اور یہ حق اللہ بھی اس نے مختلف درگاہوں پر رہ کر سیکھا تھا۔ آہستہ آہستہ اسی جیسے چند دوسرے لوگ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کوئی اس کے ہاتھ دابتا کوئی پاؤں یہاں تک کہ اب اسے چرس کی خاطر چھوٹی موٹی چوری بھی نہ کرنی پڑتی۔ وہ بھی یہیں مل جاتی۔ غرض یہ کہ صحیح معنوں میں آسمان سے "دھن" برسنے کا نظارہ چندر نے بھی اپنی زندگی میں دیکھ ہی لیا تھا۔ آہستہ آہستہ چندر کا چھپر ایک چھوٹی سی درگاہ میں تبدیل ہو گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتی گئی۔ چندر کے پاس ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم جمع رہتا۔ کوئی تعویذ لینے آتا، تو کوئی دم کروانے، کبھی کوئی جن بھی اتروانے آجاتا۔ حجرے کے باہر ہی ایک صندوقچی رکھ دی گئی جہاں لوگ نذر و نیاز کے لیے پیسے ڈالا کرتے۔ ہر ماہ کی آخری جمعرات یہاں خوب میلا لگتا ساری رات قوالیاں ہوتیں اور خسرے ناچتے۔ وہ

لڑکیاں جن پر بقول ان کے گھر والوں کے جنات آتے تھے وہ بھی اس جمعرات احاطے میں لائی جاتیں۔ جہاں وہ خوب دھمال ڈالتیں۔ غرض ایک عجیب سا منظر ہر طرف دکھائی دیتا۔ چندر اپنی مطلب براری کے لیے نہ جانے کتنی ایسی ہی لڑکیوں کو استعمال کر چکا تھا۔ جس کا علم کسی کو نہ تھا۔ کوئی لڑکی چندر کے خوف سے زبان نہ کھولتی اور اگر جو کھول بھی لیتی تو ان کی کس نے سننی تھی۔ اور نہ جانے کتنے برس اسی طرح گزر گئے۔

ان گئے برسوں میں چندر کو کبھی اپنے گھر والے یاد نہ آئے اور نہ ہی کبھی اس نے پلٹ کر پیچھے کی جانب دیکھا وہ تو گمراہیوں کے راستہ پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سچ ہے گناہ کی لذت جو پڑ جائے تو پیچھا چھڑوانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے۔

☆☆☆

شانتی تقریباً تیس برس کی ہو چکی تھی۔ ننھی کی شادی کو بھی دوسرا برس تھا اور وہ ایک بچے کی ماں بھی بن گئی تھی۔ روشن کو فوت ہوئے بھی سال بھر سے اوپر ہی ہو گیا تھا۔ مٹھو سکھر اپنی خالہ کے پاس رہتا تھا۔ مہینے کے مہینے آتا ماں بہن سے مل جاتا اور اپنی کمائی بھی دے جاتا لیکن سکھاں اپنا گھر چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ نا جانے اُسے کس کا انتظار تھا اور اس کا ساتھ دینے کو آج بھی شانتی موجود تھی جس کا نصیب جانے کیوں سویا ہوا تھا۔ ایسے مایوسی کے عالم میں جب سکھاں کو کسی نے میدان والے بابا کا بتایا تو وہ فوراً ہی شانتی کو لے کر وہاں جا پہنچی۔

جس دن سکھاں وہاں گئی جمعرات کا دن تھا اور مزار پر خوب ہی رش تھا۔ مزار کے احاطے میں ایک مصنوعی قبر بنا دی گئی تھی جہاں ویسے تو ہر وقت زائرین کا رش ہوتا لیکن جمعرات کا دن یہ رش عام دنوں سے زیادہ ہو جاتا۔ آج بھی وہاں خوب رش تھا۔ مزار کے ایک طرف ہار پھول والوں کی دکانیں تھیں اور کچھ بدمست لوگ احاطے میں بیٹھے اپنے اپنے پسندیدہ نشوں میں ڈوبے ہوئے ہر دو سیکنڈ کے بعد حق ہو کا نعرہ لگاتے جس سے ماحول میں اور ہیبت طاری ہو جاتی۔ درگاہ میں آنے والے عقیدت مند ان کے آگے رکھے کشکول میں کچھ پیسے حسب استطاعت ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔ سکھاں بھی شانتی کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی اور بابا جی کے حجرے کے سامنے لگی لمبی قطار میں بیٹھ گئی۔ اپنی باری کے انتظار میں دوپہر سے شام ڈھل گئی، بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی۔ لیکن اُس نے امید کا دامن نہ چھوڑا آخر کار شانتی سے برداشت نہ ہوا اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چل اماں گھر چلیں، پھر آ جائیں گے۔ تھک گئی ہوں میں۔'' اس سے قبل کہ سکھاں، شانتی کی اس بات پر غور کرتی چادر میں ملبوس ایک موٹی سی عورت ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور سکھاں کے نزدیک ہوتے ہوئے بولی۔

''بابا جی سے ملنا ہے۔''

''جی!'' سکھاں نے مختصر جواب دیا۔

''ایسے تو تمہارا نمبر نہیں آنے والا ساری رات نکل جائے گی۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیسے آئے گا یہاں تو سب اسی طرح لائن میں بیٹھے ہیں۔'' سکھاں نے حیرت سے جواب دیا۔

''ایسا کر حجرے کے باہر موجود خاکی کپڑوں والے مجاور سے بات کر، اسے کچھ دے دلا کر جلدی کا ٹائم لے لے، ورنہ یہاں ہی رات ہو جائے گی اور عشاء کے بعد تو بابا جی ویسے بھی کسی کو نہیں دیکھتے، پھر سمجھو بات کل پر گئی۔'' اس عورت نے اپنے تئیں مخلصانہ مشورہ دیا اور پھر اس عورت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سکھاں نے قمیض سے بٹوا نکال کر دیکھا۔ بیس روپے اور کچھ سکے بٹوے میں رکھے تھے اس نے ایک لمحے کو سوچا اور شانتی کو بیٹھا چھوڑ کر اس عورت کے ساتھ چل دی۔

حجرے کے باہر دو تین مجاور موجود تھے جن کے ڈنڈوں پر گھنگھرو لگے ہوئے تھے۔ وہ زور سے اپنا ڈنڈا زمین پر مارتے اور رات کے سمے میں ایک عجیب سی دل ہلا دینے والی آواز سنائی دیتی۔ سکھاں کی ساتھی عورت نے اپنے مطلوبہ مجاور سے آہستہ آہستہ کچھ بات کی اس کی بات کے جواب میں مجاور سر ہلاتا گیا پھر اس نے ایک نظر سکھاں پر ڈالی اور دوسری نظر ذرا دور بیٹھی شانتی پر اور یک دم اُٹھ کر حجرے میں داخل ہو گیا اور چند ہی سیکنڈ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ وہ مجاور سیدھا سکھاں کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں منرل واٹر کی ایک چھوٹی بوتل تھی، جس

میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی بوتل سکھاں کے ہاتھ میں دے دی۔

''چل جلدی سے پی لے اور آخری ایک گھونٹ اپنی بیٹی پر ڈال دے۔''

''لیکن سائیں میں تو بابا جی کے پاس اپنی بیٹی کے لیے آئی ہوں پھر پانی کی بوتل میرے لیے کیوں۔'' سکھاں نے حیران ہوتے ہوئے مجاور سے دریافت کیا۔

''او مائی بابا جی کو سب پتا ہے لیکن اب عشاء ہوگئی ہے اب وہ کسی سے نہیں ملتے۔ تو یہ پانی پی اور جیسا کہا ہے ویسا کر۔ تیری بیٹی کا تین دن کا چلہ ہوگا تجھے درگاہ پر ہی رہنا ہوگا۔ اگر منظور ہے تو بیٹھ ورنہ جا اپنا کام کر۔ ہمارا ٹیم نہ ضائع کر۔''

''ناراض نہ ہوں سائیں سرکار! میں تین دن یہیں بیٹھوں گی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ۔''

مجاور بغیر کوئی جواب دیے سر ہلاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ سکھاں آہستہ آہستہ اپنی جگہ واپس آگئی۔ شانتی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ وہ بھی اس کے قریب ہی خاموشی سے بیٹھ گئی۔ نہایت عقیدت واحترام سے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور آہستہ آہستہ سارا پانی پی گئی۔ صرف آخری ایک گھونٹ بچالیا اور یہ گھونٹ اس نے شانتی کے سر پر ڈال دیا اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ وہیں جگہ بنا کر لیٹ گئی۔

''حق ہو'' کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور پھر وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

علاقے میں نیا تھانیدار آیا تھا جو کئی دنوں سے چندر کو تنگ کر رہا تھا۔ وہ چندر کے تمام غیر قانونی دھندوں سے واقف ہو چکا تھا۔ جس کی بنا پر چندر کو بہت سی مشکلات پیش آرہی تھیں۔ اُس کا دباؤ چندر پر بڑھتا جا رہا تھا۔ پیسے کے ساتھ ساتھ اس کی اور بھی ڈیمانڈ بہت تھیں۔ جنھیں وہ وقتاً فوقتاً پورا کرنے کی کوشش کرتا تا کہ اس کا دھندا ماند نہ پڑے۔ ویک اینڈ شروع ہوتے ہی اس انسپکٹر کے پاس ایک لڑکی بھیجنا ضروری ہوتا جس کے لیے چندر کے کارندے جمعرات والے دن اچھی طرح کام کرتے اور کوشش کرتے کہ مال جتنی جلدی ہو سکے ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے تا کہ وقت پر کام نہ ہونے کی صورت میں وہ انسپکٹر کی ممکنہ مداخلت سے بچ سکیں۔

چندر کی خانقاہ کے اندر ایک خفیہ راستہ تھا۔ وقت ضرورت وہ وہاں سے ایسے نکلتا کہ کسی کو علم بھی نہ ہونے پاتا اور جب بھی ایسا ہوتا مریدوں پر عام تاثر یہ دیا جاتا کہ بابا جی غائب ہوگئے ہیں اور اس کے زیر اثر اس کی مریدی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا، جس کا فائدہ خانقاہ میں موجود ہر فرد کو ملتا۔ ابھی بھی وہ اندر بیٹھا چرس کے سُوٹے لگا رہا تھا جب اس کا خاص الخاص مجاور اندر داخل ہوا اور چندر کے گھٹنوں کے پاس آن بیٹھا۔

''کام ہوگیا؟'' چندر نے ہلکی سی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے بیٹھے مجاور سے سوال کیا۔

''جی بابا جی مال پہنچ گیا ہے؟'' مجاور اس کا سوال سمجھ چکا تھا اس لیے آہستہ سے بولا۔

''حق اللہ!!'' جواباً چندر نے ایک زوردار نعرہ لگایا جس کے جواب میں باہر بجتے گھنگھروؤں کی آواز تیز ہوگئی۔

☆☆☆

جانے کتنا وقت لگا سکھاں کو ہوش کی دنیا میں واپس آتے۔ کون سا دن اور کیا ٹائم تھا، ہوش میں آتے ہی اسے سمجھ نہ آیا۔ وہ تو یہ بھی بھول گئی کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ اپنا چکراتا سر تھام کر وہ بمشکل اٹھ بیٹھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی ٹانگیں لمبی کیں اور گہری سانس کے ذریعے ہوا کی آکسیجن کو اپنے اندر اتارا، ساتھ ہی گھنگھرو اور ڈھول کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ جیسے یک دم ہوش میں آگئی۔

''شانتی......شانتی۔'' شانتی کی تلاش میں اس نے یہاں وہاں نظر دوڑائی۔ وہ کہیں نہ تھی۔ سکھاں یک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''شانتی۔ میری بچی کہاں ہے تُو؟'' شور بہت تیز تھا، کانوں پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ایسے میں کوئی سکھاں کی آواز کیا سنتا۔ وہ سب کو دھکے دیتی آگے پہنچ گئی جہاں ایک میلہ سا لگا تھا۔ تیز روشنی میں دھمال ڈالتے لوگ اور وقفے وقفے سے ابھرنے والے نعرے، کوئی تیز بو بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

چرس، یہ یقیناً چرس کی بو تھی جو اکثر چندر کے پاس سے آتی تھی۔ یہاں وہاں شانتی کہیں نہ تھی۔ کولر والی جگہ، باتھ روم غرض اس نے ہر جگہ چھان ماری تھی۔ اب وہ گھبرا اٹھی اور ناچتے ہوئے ایک مجاور کو جا پکڑا۔

''میری بیٹی آئی تھی یہاں میرے ساتھ وہ کہاں گئی۔'' نشے میں دھت مجاور اس کی بات سمجھ نہ سکا اور اسی طرح وقفے وقفے سے ناچتا نعرے مارتا گیا۔

''کیا بات ہے اماں۔ پیچھے ہو گر جائے گی۔'' کسی نے اسے دھکا دے کر پیچھے کیا۔ سکھاں کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ رش، شور شرابا اور بے ہنگم آوازوں نے اس کا سر پھر سے بھاری کر دیا۔

''بیٹا کیا وقت ہوا ہے؟'' پاس کھڑے لڑکے کو اس نے کندھے سے ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

''تین بج گئے ہیں اماں۔'' اس کا مطلب وہ آٹھ گھنٹے سوتی رہی۔ اتنی دیر میں شانتی کہاں گئی۔

''کیا ہوا اماں، کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔'' اسے یہاں وہاں نظر دوڑاتے دیکھ کر اس لڑکے نے دوبارہ سوال کیا۔

''میری بیٹی شام میرے ساتھ آئی تھی۔ مجھے جانے کیا ہوا، ایسی نیند آئی کہ کئی گھنٹے سوتی رہی۔ اب جاگی تو شانتی جانے کہاں گئی۔ کتنی دیر سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ مل کے ملی نہیں دے رہی۔'' بات کرتے ہوئے اس کی نگاہ اسی چادر والی عورت پر پڑی جس کے کہنے پر اس نے مجاور سے لے کر پانی پیا تھا۔ وہ بھاگ کر ہانپتی کانپتی اس کے پاس جا پہنچی۔

''میری بیٹی تھی نا رات میرے ساتھ۔ تم نے دیکھی تھی نا، وہ نہیں مل رہی، جانے کہاں گئی۔''

''کون سی بیٹی؟ اور میں نے کہاں دیکھی تھی؟ میں تو چار دن بعد ابھی یہاں آئی ہوں۔'' قطعی اجنبی لہجہ میں وہ عورت حیرت سے بولی۔

''ہفتے بعد...... لیکن کل جمعرات کی نذر میں تم وہاں میرے ساتھ بیٹھی تھیں۔'' سکھاں حیران ہوتے ہوئی بولی۔

جمعرات کل نہیں۔ چار دن پہلے تھی۔ آج تو بابا جی کا عرس ہے مائی۔ جمعرات کو گزرے تو کئی دن ہو گئے، تو نے کوئی سوٹا شوٹا تو نہیں لگایا ہوا۔''

عورت اس کا منہ سونگھتے ہوئی ٹھٹھہ مار کر ہنس دی۔

''جمعرات چار دن پہلے تھی۔'' سکھاں اس عورت کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑائی۔

''میں چار دن بے سدھ رہی اور میری شانتی کہیں غائب ہو گئی۔'' اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔

''شانتی!!'' وہ حلق کے بل چلائی۔ گھنگھروؤں کی آواز اس کی چیخ تلے دب گئی۔ ''شانتی میری بچی شانتی!!''

اس دفعہ اس کی چیخ پہلے سے زیادہ ہولناک تھی۔ یکدم سارا شور تھم گیا۔ اس پل ہجرے کے اندر بیٹھے چندر کے کان میں آنے والی چیخ نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ دروازے پر پڑا پردہ اٹھا کر باہر دیکھا۔ جہاں ایک طرف رش جمع تھا۔ باقی سارا شور شرابا تھم چکا تھا۔ ایک مجاور اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر دوڑتا ہوا آیا۔

''اس لڑکی کی ماں نے باہر ہنگامہ مچا دیا ہے۔'' وہ چندر کے کان کے قریب بولا۔ چندر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا مجمعے کے قریب آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی سارا رش چھٹ گیا۔ لوگ دور دور ہو گئے۔

''بابا جی کی عبادت میں خلل پڑ گیا۔ عبادت چھوڑ کر باہر نکل آئے۔'' مختلف آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں جن پر توجہ دیے بنا وہ نیچے فرش پر بیٹھی بین کرتی بوڑھی عورت کے پاس آن بیٹھا۔

''اماں۔'' اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

''میری شانتی۔'' اماں روتے ہوئے ایک ہی نام پکار رہی تھی۔ اس پر ہر چیز واضح ہو گئی وہ خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اسے میرے ہجرے میں لے آؤ۔'' مجاور کو حکم دیتا تھکے تھکے قدموں سے وہ واپس آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے ہجرے میں اس کی ماں اس کے بالکل سامنے بیٹھی تھی، یہ جانے بنا کہ اسی کے سامنے بیٹھا بڑے بڑے بالوں والا یہ شخص اس کا اپنا بیٹا ہے۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اور چندر سر جھکائے ایسے بیٹھا تھا جیسے شانتی مر گئی ہو۔

☆☆☆

اجڑی ہوئی شانتی نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھا۔ اتنے دنوں سے وہ جو عذاب بھگت رہی تھی اس میں اسے سارے چہرے ایک جیسے ہی لگنے لگتے تھے۔ کسی چہرے میں کوئی فرق نہ تھا۔ سب کے سب بڑے بڑے دانتوں والے خون پیتے بھیڑیے تھے۔ اس وقت وہ چہرہ بھی ایک خون خوار بھیڑیے کا تھا جو یکایک تبدیل ہوگیا۔ اس نے شانتی کے سر کو ایک چادر سے ڈھک دیا۔ اس کے سر پر رکھا اس انجان شخص کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ شاید رو بھی رہا تھا۔ اور پھر کچھ دیر بعد ہی رات کے اندھیرے میں وہ شخص شانتی اور سکھاں کو لیے خفیہ راستے سے باہر ایسے نکلا کہ دوبارہ کسی نے اس خانقاہ میں موجود بابا جی کو نہ دیکھا۔

☆☆☆

قدم قدم گھسیٹتا چندر اپنی ماں اور بہن کے ساتھ بالکل بے آسرا روڈ پر تن تنہا کھڑا تھا۔ اپنا ماضی ایک بار وہ پھر سے پیچھے چھوڑ کر آ گیا تھا، جب اس کی ملاقات مولوی دین محمد سے ہوگئی اور وہ اسے ساتھ لیے اپنے گھر آ گئے۔ جس کا راستہ مسجد سے ہو کر گزرتا تھا۔ چند یہیں رک گیا۔

''میں غیر مسلم ہوں مولوی صاحب۔'' اپنے چہرے پر موجود داڑھی سے دوسروں کو دھوکا دینے والا مسجد میں جھوٹ بول کر داخل ہونے کی ہمت خود ہی نہ پا رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں لیکن یہ خدا کا گھر ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں داخل ہو کر تمہارا دل بھی اپنے گناہوں سے تائب ہو جائے۔'' مولوی صاحب دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

''ہم ناپاک لوگ ہیں مولوی صاحب۔ ایسے پاک گھر میں داخل ہونے کے اہل نہیں۔'' شانتی روتے ہوئے بول رہی تھی۔

''میں تمہیں اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں بیٹا، مسجد نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ میرے گھر کا راستہ اللہ کے گھر سے ہو کر نکلتا ہے۔'' وہ شانتی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے بولے اور پھر ان کی تقلید میں وہ سب مسجد کے برابر والی پتلی گلی سے نکلتے مولوی صاحب کے گھر آ گئے، جہاں پہنچتے ہی چندر نے رو رو کر انہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جسے سننے کے بعد مولوی صاحب نے اسے کچھ نہ کہا، نہ کوئی لعنت ملامت کی اور نہ ہی کوئی سخت الفاظ بولے۔ کہا تو صرف اتنا کہا۔

''میری صرف اتنی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اب ہدایت کا راستہ نصیب فرمائے۔''

یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے تھے کہ جو چندر کے لیے راہِ نجات ثابت ہوئے اور واقعی میں ہی وہ صداقت پا گیا۔

مولوی صاحب کے حسنِ سلوک نے اس کے دل کو یکسر تبدیل کر دیا۔ مولوی صاحب کی درخواست پر بابا جی کی درگاہ بھی بند کر دی گئی۔ جہاں سے غائب ہونے والے بابا جی آج بھی لوگوں کے لیے باعث عقیدت تھے۔ آہستہ آہستہ گزرتے وقت نے اس کے دل پر جمی ساری میل دھو دی، اور اس کا دل بالکل آئینے کی طرح صاف شفاف ہو گیا۔

☆☆☆

کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی چندر کا نام عبدالرحمن اور شانتی کا فاطمہ تجویز ہوا جبکہ اماں سکھاں بنا اسلام قبول کیے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

عبدالرحمن نے قاری صاحب سے نہ صرف قرآن شریف پڑھا بلکہ دینی علوم کا مطالعہ بھی کیا اور پھر مولوی صاحب کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی اہل محلہ اپنی مشکلات لے کر ان کے پاس آنے لگے، جسے وہ کتابوں کی مدد سے حل کرنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سوہنا رب جسے چاہے بخش دے اور اس کا دل ایمان سے بھر دے۔ جسے چاہے اپنی پکڑ میں لے لے اور ہر عبادت کے باوجود ان کے دلوں کو ایمان سے خالی کرتا جائے۔ یہ میرے رب کی مشیتِ ایزدی ہے جسے بے شک وہی جانتا ہے۔ ہم تو صرف سوچ سکتے ہیں جانے کب کسی کو وہ بخش کر اپنے پیارے بندوں میں شامل کر لے۔ یہ اس کا اختیار ہے اور ایسے وہ کئی کافر دل لوگوں کو بدلتا ہے اور ان کے دل ایمان سے بھر جاتے ہیں۔ بے شک میرا سوہنا رب ہر چیز پر قادر ہے۔''

☆☆☆

ساتویں طویل سچ بیانی

دو کوڑی کی عورت!

عقیلہ حق

خاص نمبر کے لیے، ایک بہت خاص داستانِ حال بہت خاص مصنفہ کی جانب سے

مجھے ایسا لگا جیسے ساتوں آسمان دھڑ دھڑ مجھ پر آ گرے ہوں...... اور اُن کے نیچے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا ہو۔ میں نے سامنے لگے قدآدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا، میری آنکھوں میں وحشت تھی اور شرمندگی بھی۔

میں نے چہرے پر پھیلتا تھوک محسوس کیا اور پھر جیب سے رومال نکال کر کپکپاتے ہاتھوں سے اَن دیکھے تھوک کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔ جو میرے چہرے پر نہیں تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ میرے عکس نے مجھے ٹہوکا مارا۔ میرا ضمیر مجھ پر ہنسا۔ تو میں نے اپنے آپ سے آنکھیں چراتے ہوئے۔ اپنے وجود کے اندر شور مچاتے طوفان کو دباتے ہوئے۔ اپنے آپ کو جھٹلاتے ہوئے۔ آہستگی سے۔ اتنی آہستگی سے کہ آواز مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ اور کہا؟

☆☆☆

”بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں نے سارا دن کے لیے رکھی ہے۔“ تابندہ نے سر جھکائے پونچھا لگاتی ہوئی ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ”یا اللہ آج پھر نئی ماسی“

”ویسے ایک بات ہے آپ خواتین کا مسئلہ ملازمین“ کبھی بھی حل نہیں ہو سکتا۔ پتا ہے شہریار ہماری بیگم کی ہر دوسرے دن محلے کی خواتین کے ساتھ ٹیلی فونک کانفرنس ہو رہی ہوتی ہے اور ایجنڈا ہوتا ہے۔ ”کیا ماسی آ گئی؟“

خواتین خوش فہمی میں بھی شاید ایک دوسرے کو کال نہیں کرتیں لیکن مسئلہ ملازمین پر ڈیفنس کی خواتین کا اتحاد اور یگانگت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔“

میں نے آملیٹ کو فورک میں پھنساتے ہوئے اپنے کزن شہریار سے کہا جو کہ اسلام آباد سے چند دن کے لیے میرے گھر آیا ہوا تھا اور قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ یہاں پر ماسیاں تنگ بھی تو بہت کرتی ہیں، اب تم خود سوچو شہریار۔ میرے گھر آ کر ایک ماسی جو خود نیلم کالونی میں رہتی ہے اور میاں اس کا کباڑ کا ٹھیلا لگاتا ہے کہہ رہی ہے کہ اوفوہ باجی یہ جو آپ نے لاؤنج میرون کمبی نیشن میں سیٹ کیا ہے۔ اس سے مچھر آ رہے ہیں۔ اور مجھے مچھروں کی عادت نہیں ہے۔ اب بتاؤ میرے گھر میں تم کو کوئی مچھر نظر آیا۔ تم ہی بتاؤ۔ میں اس کو رکھوں گی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اور آئی محترمہ کہتی ہیں باجی روٹی میں پکاؤں

گی میں نے کہا۔ ہاں کہنے لگی اور برتن۔ میں نے کہا۔ برتن بھی تم دھوگی۔ کچن بھی صاف کروگی اور ڈسٹنگ بھی کروگی۔ تو کہنے لگی ٹھیک ہے لیکن آپ صبح گاڑی بھیج کر مجھے بلوائیں گی اور ڈرائیور سے گھر واپس بھجوائیں گی۔ میرے تو یقین کرو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا۔ بیگم صاحبہ آپ کا نکاح نہ کروادوں میں اپنے میاں سے۔

اس وقت میں نے چوکیدار سے کہا۔ اس کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔ اور آپ سن رہے ہیں نا۔'' تابندہ نے مجھے مخاطب کیا۔

لیکن میں اس کی سن ہی کب رہا تھا۔ میری نظریں تو اس پتلی سی کمر والی لڑکی پر جیسے ٹھہری گئی تھیں۔

سفید دودھیا کمر جو سیاہ کاٹن کے بلاؤز سے جھلکتی آنکھوں کو خیرہ کررہی تھی۔ موٹی سی بالوں کی چوٹی، جو اس نے پیچھے سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ چوٹی سے نکلتے، گردن سے سانپ کی طرح لپٹے بال اور گردن سے نیچے کمر تک آتی موتیوں سی گندھی پسلیوں کی لڑی، جو کہیں کہیں سے بھیگتے بلاؤز کو سحر انگیز بنارہی تھیں۔

اس کا چہرہ کیسا تھا۔ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی کمر کیسی تھی میں سحر زدہ تھا، میں فطرتاً عاشق مزاج مرد تھا، خدا نے مجھے دولت کے ساتھ ساتھ ایک پرکشش شخصیت بھی دی تھی اور اس پر ستم بالا دل...... میں عورتوں کو بخوبی سمجھتا تھا۔ میں گفتگو کے انداز سے عورت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ لگالیا کرتا تھا۔

کچھ لوگ دنیا میں بہت شاندار نصیب لے کر آتے ہیں۔ تابندہ کو دیکھ کر میں اکثر سوچتا تھا۔

تابندہ بے حد خوب صورت اور مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سادہ تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور اعتبار بھی۔ بے چاری روایتی بیوی۔



☆☆☆

''آپ نے گھر پر کہہ دیا کہ آج آپ لیٹ آئیں گی۔'' میں نے اپنی خوب صورت ٹائپسٹ سے کہا۔ اس کی بہن کی شادی کے لیے قرضہ منظور کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اثبات میں سر ہلاتی مجھے اور بھی خوب صورت لگی۔

دراصل میں تو آفس میں نوکری ہی خوب صورتی اور.....کیا کہوں آپ خود سمجھ دار ہیں کس وجہ سے دیتا ہوں۔

میں عورتوں کا گھاگ شکاری تھا۔ شمائلہ کوئی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ درجنوں لڑکیوں کی مجبوریوں کو میں خرید چکا تھا۔ اس دنیا میں چیزوں کے ساتھ ساتھ ہر انسان کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔

میں بہت ہینڈسم، ویل میزڈ اور گریس فل مرد ہوں، گوکہ میرا تعلق مڈل کلاس سے تھا لیکن اس کے باوجود مجھے بھی اپنی قیمت کا اندازہ تھا۔ اور میری قیمت تھی۔ تابندہ۔

کروڑ پتی باپ کی اکلوتی۔ معصوم، سیدھی سادی بیٹی۔ میرا شمار اُن خوش قسمت مردوں میں ہوتا ہے کہ زندگی ان کے اشاروں پر چل رہی ہوتی ہے۔

حتیٰ کہ بیوی بھی......

شمائلہ ایک لوئر متوسط طبقے کی خواہشوں اور ضرورتوں میں ڈولتی لڑکی تھی...... چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو حسرت بنا کر وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ اور اس کی خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے بعد۔ خواہش بھی کیا۔ چند ڈیزائنر کے سوٹ، امپورٹڈ شوز، فائیو اسٹارز ہوٹل میں ڈنر۔

اس بیوقوف کو تو اپنی قیمت بھی نہیں معلوم تھی۔ سو آج وہ میرے ساتھ جا رہی تھی۔ اور میں اس کا ڈرائیور تو نہیں تھا نا۔ میں، میں تھا۔ حیدر جمال۔

☆☆☆

آپ بہت کام کرنے لگے ہیں۔ اپنی صحت کا خیال کریں۔ تابندہ جو بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ رات کے ڈھائی بجے میرے گھر آتے پر فکر مندی سے بولی۔ اِسٹوپڈ عورت!

میں حیدر جمال رات ڈھائی بجے تک کام کروں گا۔ میں اس کے باپ کا نوکر ہوں۔ نا۔ جو اس کے باپ کے کاروبار کے لیے دن رات ایک کر دوں گا۔ میرے اندر کڑواہٹ گھلنے لگی۔

اس وقت تابندہ مجھے زہر لگ رہی تھی۔ سیدھی چوٹی باندھے پھیلتے بدن کو کپڑوں میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتی روایتی بیوی۔

میرے منہ کا مزہ بگڑنے لگا۔ میرے آس پاس شمائلہ مہک رہی تھی۔ اس کے بال، ابھی تک میرے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں اس کے ہونٹ۔ لگتا ہے۔

''لگتا ہے آپ بہت تھک گئے ہیں۔'' میری خاموشی پر تابندہ نے محبت سے کہا تو جیسے میں ہوش میں آ گیا۔

''ہاں تابی...... محنت تو کرنا ہوگی نا۔ آخر تمہارے ڈیڈی اس قدر مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

میں نے چہرے پر مصنوعی محبت کا خول چڑھاتے ہوئے اس عورت سے کہا۔ جو نکاح کے دو بولوں سے بندھی صبح سے میرے انتظار کر رہی تھی اور سب سے بڑی بات فیکٹریاں ابھی تک اسی کے نام تھیں۔

☆☆☆

''یہ بڈھا کون ہے؟ میں نے لان میں پودوں کو پانی دیتے اس کمزور بدن بوڑھے کو دیکھتے ہوئے تابندہ سے پوچھا۔ دراصل میں بہت مصروف رہتا تھا۔ تو گھر کے تقریباً سارے ہی معاملات تابندہ دیکھتی تھی۔

کس کو رکھنا ہے؟ کس کو نکالنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کس کو بلانا ہے؟ یہ بھی کوئی نیا ملازم تھا۔ ''یہ سویرا کا شوہر ہے۔'' تابندہ کا لہجہ لاپرواہ تھا۔

''سویرا......سویرا کون؟ میں سویرا نام میں الجھ گیا۔ اتنا میٹھا نام......میرے ہونٹ میٹھے ہو گئے۔

ارے آپ بھول گئے۔ ہاں ظاہر ہے آپ مصروف بھی تو رہتے ہیں۔ وہ میری نئی ماسی......جس کو میں نے سارے دن کے لیے رکھا تھا۔'' تابندہ نے یاد دلایا۔

سیاہ بلاؤز پر پسینے کی لڑیاں۔ اور سفید کمر کا وہ خم

مجھے یاد آ گیا۔ اوہ میرے منہ سے نکلا۔

''اچھا...... اچھا......'' میں سنبھلا اور لاپروا انداز میں کہا۔ بہت ہی اچھی ہے۔ بے شک ۔ میرے دل نے کہا۔

''بہت محنتی ہے تو میں نے اس کو رات دن کے لیے رکھ لیا ہے۔ پیچھے کوارٹر بھی دے دیا ہے۔''

اوہ گھر میں موتیا مہک رہا ہے اور میں لاعلم رہا۔ میرے دل نے دہائی دی۔ تابندہ مجھے تفصیلات بتا رہی تھی لیکن سفید کمر کا ضم مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

دراز قد...... ساڑی میں کسا کسا بدن...... ماڈلز کو شرماتا فیگر۔ تراشیدہ لبوں پر جمی ایک پرسکون مسکراہٹ۔ سفید مخروطی انگلیوں پر دہکتی مہندی۔

وہ چائے لے کر اندر آ رہی تھی۔ اور میرے اندر کا حیدر جمال مجھے گالیاں دے رہا تھا کہ میرے گھر میں۔ میرے گھر میں ایک شاہ کار موجود ہے اور میں اس سے محروم۔

''عبداللہ سویرا کا میاں ہے۔ مالی کا کام کرتا ہے۔ میں نے دونوں میاں بیوی کو نوکری دے دی ہے۔'' تابندہ کی آواز مجھے دور خلا سے آتی محسوس ہوئی۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا۔ اس آسان شکار کو شکار کیسے کیا جائے۔ وہ چائے میز پر رکھ کر جا چکی تھی اور میں تصورات کی آوازوں میں اڑ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ ادھر چل پھر رہی ہوتی تو اس کا وجود میرے بازوؤں میں مچل رہا ہوتا۔ وہ کچن میں مصروف ہوتی اور اس کے بال میرے شانوں پر بکھر رہے ہوتے۔ وہ برتن دھو رہی ہوتی۔ اور اس کی ساڑی کا پلو میرے ہاتھ میں ہوتا۔ وہ فرش پر پونچھا لگا رہی ہوتی۔ اور اس کے وجود کی گرمی مجھے دہکا رہی ہوتی۔ تابندہ سو رہی تھی۔ اور سویرا اپنے کوارٹر میں تھی۔

اور رات کے ڈھائی بجے ٹیرس میں بے چین ٹہلتے ہوئے میں اپنے خیال سے کھیل رہا تھا بلکہ کسی ماہر کرتب والے کی طرح بہت ساری ڈوریاں اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا اور از خود لطف لے رہا تھا۔

اس کے بوڑھے اور لاغر شوہر کو دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ میرے خیالات میں شکار تک رسائی آسان تھی۔

وہ ملازمہ تھی۔ ایک غریب عورت۔ جس کو غربت اور حالات نے کسی دوسرے کے گھر کا سائبان دے دیا تھا۔ میں جن عورتوں میں گھرا رہتا تھا، ماڈرن' خوب صورت تعلیم یافتہ خوشبوؤں میں بسی عورتیں۔ اُن عورتوں کے آگے وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ 5000 روپے میں سارے گھر کا کام کرتی معمولی درجے کی عورت لیکن بعض عورتیں خواہش بن جاتی ہیں۔ انتا کی تسکین کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اور جب بہت زیادہ پیاس لگی ہو تو پھر آدمی یہ نہیں سوچتا کہ پانی منرل ہے یا نل کا۔ بس وہ پیاس بجھانا چاہتا ہے اور میں بھی......

☆☆☆

''یااللہ آج آپ کو کیسے خیال آ گیا۔'' تابندہ نے حیرت اور مسرت کے ساتھ اپنے سامنے لگے کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آج بہت عرصے کے بعد میں اس کے لیے لان کے کچھ سوٹ خرید کر لایا تھا۔ عموماً اپنی خریداری وہ خود ہی کرتی تھی۔ لیکن بہت ساری بیویوں کی طرح اس بات کا ہمیشہ گلہ کرتی تھی کہ میں اس کے لیے شاپنگ نہیں کرتا۔ اور اس کی یہ شکایت بھی اس کی بہت ساری شکایتوں کی طرح میں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے دو کانوں کا میں اپنی دانست میں بالکل صحیح استعمال کر رہا تھا۔

''اور یہ''...... تابندہ کے ہاتھ میں گلابی آرگنڈی کی ساڑی تھی۔ تابندہ ساڑی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں خاموش رہا۔ پتلی کمر پر کسا ہوا سیاہ بلاؤز اور بہتے پانی پینے کی وجہ سے جگہ جگہ سے گیلا ہوتا، چپکتا ہوا بلاؤز۔ میرے خیالوں میں لہرانے لگا۔

''حیدر جمال۔ یہ ساڑی کیوں لائے ہیں۔ میں اس طرح کی سوتی ساڑیاں تو نہیں باندھتی۔'' تابندہ نے دوبارہ تفصیل سے پوچھا۔

یہ ساڑی میری جان تمہارے لیے نہیں ہے۔ یہ تمہاری ماسی کے لیے ہے۔'' میرا انداز لاپروا تھا۔

ماسی کے لیے؟ کون سی ماسی کے لیے؟ تابندہ حیرت سے گویا ہوئی کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں ملازمین کو زیادہ لفٹ نہیں کرواتا تھا۔ کجا کر ان کے لیے کچھ خرید کرلاتا۔

ارے وہی ...... جس کا بڈھا سا میاں ہے۔ اس کے لیے کیا نام ہے اس کا؟ میں جان بوجھ کر انجان بنا ورنہ اس کا نام تو مجھے اپنے نام سے زیادہ اچھا لگتا تھا اور یاد رہتا تھا۔ جو اس کو ایک بار دیکھ لے۔ پھر وہ ساری زندگی اس کو اور اس سے وابستہ کسی بھی چیز کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

''اچھا...... اچھا آپ سویرا کے لیے لائے ہیں۔ چلیں اچھا کیا۔ بے چاری وہی دو ساڑیاں لپیٹے پھرتی تھی۔ میں دوں گی تو خوش ہو جائے گی۔ بلکہ میں اس کو ابھی دے دیتی ہوں۔'' تابندہ نے اس کو آواز دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ بیوی اگر خوب صورت ہو، مالدار بھی ہو تو عموماً مرد کو اس سے محبت ہو ہی جاتی ہے لیکن خوب صورت اور مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ اگر بیوقوف بھی ہو تو پھر مرد کو اس سے عشق ہو جاتا ہے اور مجھے بھی تابندہ سے عشق ہو گیا ہے۔

''بہت مہربانی صاحب۔'' سویرا نے ہاتھ میں پکڑی ساڑی کو دیکھتے ہوئے خوشی سے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ساری زندگی اترن پہننے والی۔ اس عورت کو کہاں ایسی ساڑی بھی نصیب ہوئی ہوگی؟ لیکن اس ساڑی کی قیمت۔ کیا ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا۔ میں تو صرف اس کی طلب محسوس کرنا چاہتا تھا۔ خواہشوں کی ڈسی ہوئی۔ حسرتوں کی مار کھائی ہوئی عورت ...... بڈھے کے ساتھ رہتی ہے۔ لاغر ...... ہر وقت کھانستا بڈھا۔ مجھ جیسے وجیہہ، مالدار، خوشبوؤں میں بسے مرد نے تو کبھی اس کی طرف دیکھا تک نہیں ہوگا۔ میں اپنی اڑانوں میں تھا؟

کیا وہ بھی یہی چاہتی ہے؟؟ کوئی میرے اندر سے سوال کر رہا تھا۔'' ہاں میں جانتا ہوں۔ اس کی مسکراہٹ بتاتی ہے۔ اس کی چال سمجھاتی ہے۔ وہ بھی وہی چاہتی ہے جو میں چاہتا ہوں۔'

میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنے ضمیر کو تسلی دی۔ لیکن کب؟ میرے اندر سے کسی نے پھر سوال کیا۔ اس کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے گا...... اس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ میں تو جس عورت کو ایک دفعہ نظر بھر کر دیکھ لوں وہ خود بخود میری طرف کھنچی چلی آتی ہے۔

گو کہ تابندہ اچھی تھی۔ لیکن روز، روز گھر کے کھانے سے میرا دل اکتا گیا تھا۔ کبھی کبھی اکثر مجھے باہر کے کھانے کی طلب ہوتی۔ اور میں اپنی طلب۔ اپنی بھوک مٹاتا رہتا۔ آپ لوگ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیسا خراب مرد ہوں۔ بے وفا، ہرجائی، ایک شریف عورت کو دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ۔ بہت ساری عورتوں سے کھیل رہا ہوں۔

جو بہت اچھی تھی اس کو میں نے گھر میں قید کرلیا۔ نکاح کے دو بولوں کی ہتھکڑیاں اس کے پیروں میں ڈال دیں اور کبھی کبھی اپنی محبت سے بھی اس کو نواز دیتا ہوں۔ لیکن یہ عورتیں، یہ عورتیں بھی تو میرے ساتھ برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ تو صرف میں ہی خطا کار کیوں؟ اور میں۔ یعنی حیدر جمال۔ میں تو ایک حسن پرست آدمی ہوں اور ایسی حسین عورت میری گھر کی جھاڑو لگا رہی ہے۔ نہیں، نہیں میں برداشت نہیں کرسکتا۔ میں اکثر سویرا کو کسی نہ کسی کام کے لیے پکارتا رہتا اور وہ بھاگ بھاگ کر میرے کام کرتی۔ میں تابندہ کے ذریعے اکثر اس کی مدد کرتا رہتا اور وہ میری احسان مند رہتی۔

''سویرا آپ کی بہت عزت کرتی ہے۔'' تابندہ نے ایک دن مجھ سے کہا۔

میری عزت کرنے لگی ہے۔ ارے عزت وزت کیا۔ یقیناً مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ بوڑھے لاغر مالی کی بیوی۔ دو کوڑی کی معمولی عورت۔ میرے اندر کے کمینے اور متکبر مرد نے ایک عورت کو پیسے کے ترازو میں تولا۔

میں تابندہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کو کیا پتا میں کیا سوچ رہا تھا۔ میں موقع کے انتظار میں رہنے لگا...... اور۔

☆☆☆

''بھئی اس عورت کو منع کریں۔ یہ مجھے بھائی مت کہا کرے۔'' میں نے جھنجھلا کر تابندہ سے کہا۔

میں اس کی بھائی بھائی کی رٹ سے تنگ آ گیا تھا۔

''تو کیا ہوا؟ تابندہ حیران ہوئی۔

کیا مطلب کیا ہوا؟ اب میری یہی تو اوقات رہ گئی ہے۔ ہر کوئی مجھے بھائی۔ دولہا بھائی کہتا پھرے۔ میں ہر ایرے غیر کو اجازت نہیں دے سکتا۔ جس طرح اور ملازمین مجھے صاحب کہتے ہیں۔ یہ بھی صاحب کہے۔'' میں نے غصے میں تابندہ کو جھڑک دیا۔

ایسا تو نہ کہیں۔ ایسے بڑے بڑے بول نہیں بولتے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔ خیر میں اس کو منع کردوں گی۔ وہ تو آپ اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں تو وہ بھی آپ کو بھائی کہنے لگی۔'' تابندہ نے منہ بناتے ہوئے مجھے ٹوکا۔ دراصل تابندہ بہت ہی سادہ عورت تھی، غرور اور تکبر سے دور۔

بیوقوف، احمق عورت تو کیا میں اس کا خیال اپنی بہن سمجھ کر رکھتا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ بہن تو اللہ نے مجھے دی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری نہ میری بہن ہے اور نہ ہی میں سمجھتا ہوں۔

مجھے بھوک ستاتی ہے اور یہ عورت میرے لیے چیلنج بنتی جارہی ہے۔ اتنا ٹائم تو مجھے کبھی نہیں لگا۔ تابندہ نہ جانے کیا کیا بول رہی تھی۔ میں سن کب رہا تھا۔ میری تو سوچیں کھول رہی تھیں۔

☆☆☆

''تم تھک نہیں جاتیں۔'' میں نے کچن میں برتن دھوتی۔ سویرا سے شہد ٹپکاتے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں صاحب تھکنا کیسا۔ ہم تو اسی طرح پستے ہیں۔ ہاں اگر ہم کام نہیں کریں گے تو تھک جائیں گے۔'' کہتے ہوئے وہ مسکرادی۔ اس کے گالوں میں پڑنے والے ڈمپل نے اس کو اور حسین بنا دیا۔

اس کی مسکراہٹ عام سی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے اندر کا انسان کہہ رہا تھا۔ یہ عام عورت نہیں ہے۔ بہن ہے۔

کیا میرا دل سچ کہہ رہا تھا۔ پتا نہیں۔

☆☆☆

یہی تو ہوتے ہیں۔ اگر آپ جیسے ہوس پرست خریدار نہ ہوں تو عورت کیوں بازار میں جا بیٹھے لیکن یاد رکھیے۔ بازار میں کھڑی مجبور اور بھی بے بس عورت اور گھر میں چھپی بیٹھی عورت میں اکثر بہت فرق ہوتا ہے۔

آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ یہ فرق مٹا سکتے ہیں؟ ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے والے دوسری عورت کو ہوس زدہ نظروں سے دیکھنے والے

اب مرد بے غیرت اور وحشی ہوتے ہیں۔
اب تو گوشت خور جانور اور جنگلوں میں بھٹکنے والے ننگ دھڑنگ آدم خوروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ جن کے پاس نہ تہذیب کی روشنی پہنچی ہے اور نہ ہی دین کی...... اگر میرا شوہر بوڑھا ہے، بیمار ہے، تو یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں آپ کی طرف راغب ہو جاؤں گی۔ زندگی میں جسموں کے تعلق کے علاوہ بھی کوئی تعلق ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کیا جانو۔ آپ نے وہ حدیث نہیں سنی کہ اگر عورت اپنے شوہر کے گھر۔ مال اور شہر کی حفاظت کرتی ہے تو جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ جن سے چاہے اندر داخل ہو جائے۔ آپ کیا جانو باوفا عورت کتنی قیمتی ہوتی ہے اور اس کا کیا مقام ہوتا ہے۔
میں عبداللہ سے محبت کرتی ہوں کیونکہ وہ محبت کے قابل ہے۔ وہ میرا ہے۔ میرے علاوہ کسی اور عورت کو دیکھتا بھی نہیں ہے۔ شام کو سوکھی روٹی اچار کے ساتھ اگر مجھے کھلاتا ہے تو خود بھی وہی کھاتا ہے۔ پانچ ٹائم سجدے میں گر کر اللہ سے میرے لیے خوشیاں مانگتا ہے۔ میں اس مرد سے بے وفائی کروں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو عورتیں جیسے مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنتی ہیں۔ میرے نزدیک میک اپ میں لتھڑی خواہشوں کی گند پھیلاتی۔ مکروہ چہرے اور قابل نفرت کردار والی وہ عورتیں قابلِ رحم ہوتی ہیں۔
آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھ میں بقول آپ کہ دو کوڑی کی معمولی عورت کیسے ایسی باتیں کر رہی ہے۔ تو سن لیں۔ تابندہ باجی کو آپ کے سب کرتوتوں کا پتا ہے اور وہ مجھے کئی ہفتوں سے سمجھا رہی تھیں کہ دراصل آپ ہیں کیا۔ ارے صاحب اگر قسمت سے شریف عورت مل گئی ہے تو اس کی قدر کرو۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر، اس نوکری پر۔
اس نے زمین پر تھوکا۔ اور میں نے غیر ارادی طور پر اپنا چہرہ صاف کیا۔ نہ جانے کیوں اس کا تھوک میرے چہرے پر پھیلتا جا رہا تھا۔
عبداللہ بیمار تھا اور کوارٹر میں تھا۔ اور تابندہ سارا دن کے لیے اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ سو میں دوپہر میں دفتر سے گھر چلا آیا۔ اور آتے ہی سویرا کو اسٹڈی میں چائے لانے کو کہا۔ اور پھر۔
میں نے سامنے دیوار پر لگے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔ اور ایک دفعہ پھر چہرے پر پھیلتا تھوک پونچھا۔
''دو کوڑی کی عورت۔ میں نے اپنے اندر کی خجالت کو مٹاتے۔ چھپاتے اور ضمیر کے ہتھوڑوں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔
''واہ کیا بات ہے۔ کیا کلاس ہے تمہاری۔''
آئینہ ہنسا نہ ہی تابندہ بے وقوف عورت ہے اور نہ ہی سویرا دو کوڑی کی ہے۔ دونوں عورتیں عظمتوں کا وہ مینار ہے جہاں تم جیسے دو ٹکے کے مرد کی نگاہ بھی نہیں جاسکتی۔ لیکن......
ہاں تم ہو۔ تم ہو۔ دو کوڑی کا مرد۔ دو کوڑی کا مرد۔ آئینہ چیخا۔
پھر کمرے میں موجود ہر چیز۔ چیخنے لگی۔ غصہ کرنے لگی، مجھے پتھر مارنے لگی۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگا۔ سویرا جا چکی تھی کمرے سے، شاید گھر سے بھی۔ لیکن کمرے میں موجود آئینہ، میز، کرسی، ٹیلی فون، صوفہ، کتابیں سب مجھ پر پتھر برسانے لگے۔ لفظ دو کوڑی سے مجھے سنگسار کرنے لگے۔ میں چیخنے لگا۔ میں رونے لگا۔ سارا کمرہ مجھے باتیں سنا رہا تھا۔ بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ پتھر مار رہا تھا۔ لفظ دو کوڑی میرے آس پاس ناچ رہا تھا۔ ہنس رہا تھا، رو رہا تھا، میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اور پھر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
''وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ تو کوئی شہزادی تھی۔ وہ تو ایک دمکتا ستارہ تھی، وہ دو کوڑی کی عورت نہیں ہے۔ وہ دو کوڑی کی عورت نہیں ہے۔ تو پھر۔ تو سمجھ گیا ہوگا دو کوڑی کا کون ہے۔ آئینے میں نظر آتا میرا عکس مجھ پر ہنس رہا تھا۔ کچھ جتا رہا تھا۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں سن رہا تھا۔ لفظ دو کوڑی میرے چاروں طرف ناچنے لگا۔ اور میں زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

☆☆☆

ایک تصویر، ایک کہانی

ہمارا...... اپنا قانون ہے بھائی!!



دنیا چاہے جتنی بھی ترقی کر لے شعور و آگہی کے ذریعے بھلے ہی ہم تاروں پر کمند ڈال دیں۔ آج جب جھوٹ بولنے والی مشینیں ایجاد ہو چکی ہیں، الیکٹرک چیئر کے ذریعے موت کا طریقہ اب عام ہونے لگا ہے مگر...... ہم ہیں ایشیائی باشندے۔ ہمارا اپنا قانون اور اپنی سزائیں ہیں۔ موقع محل بھلے کوئی بھی ہو! ہمارا اپنا قانون ہے بھائی...... زیرِ نظر تصویر...... اِس سرکاری بادشاہی کی زندہ مثال ہے۔

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

آخری قسط

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات "ہم شکل" بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو "عالی" کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور "ہم شکل" اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہوجاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ "عالی" جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط



سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہر کیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہو گئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

وقت گزرتا رہا اور پھر شام کے سائے بستی میں اتر آئے، بستی میں جگہ جگہ چراغ روشن ہو گئے اور رات کی تاریکی میں وہ بستی بہت عجیب لگنے لگی، ناقوسوں کی آوازیں آرہی تھیں، گویا یہاں عبادت بھی کی جاتی تھی، یہ لوگ وقت کا انتظار کرتے رہے اور اس کے بعد جوشان کے اشارے پر اپنی جگہ سے نکل آئے، اب ان کا رخ اس خانقاہ کی جانب تھا جو دور سے اب بھی سفید نظر آرہی تھی یہ غالباً سفید پتھروں سے بنائی گئی تھی، پتا نہیں یہاں اور بھی لوگ موجود تھے یا نہیں، دور سے چھوٹی نظر آنے والی خانقاہ اندر سے کافی وسیع تھی اور یہاں سے نیچے جانے کے لیے پتھروں میں سیڑھیاں تراشی گئی تھیں جو نیچے گہرائیوں تک لے جاتی تھیں۔ ان لوگوں کی نگاہوں میں بوڑھی جادوگرنی کی نجانے کیا حیثیت تھی، بہر طور ایک ایک قدم سنسنی خیزی کا حامل تھا، سونا رایا شوراک جانتی تھی کہ اسے بوڑھی کے سامنے جا کر کیا کرنا ہے، اور اس وقت ظاہر ہے شاہ زیب اور جوشان اس کے ساتھ نہ ہوں گے، لیکن اس بات سے جوشان واقف نہیں تھا کہ شوراک وہاں جا کر کیا کرے گی؟''

یہ لوگ خانقاہ کے عقبی حصے سے اندر داخل ہو گئے، بہت سکوت چھایا ہوا تھا وہاں، اندر ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی، سامنے ہی ایک لمبی آگ کی لکیر نظر آرہی تھی جس میں سرخ سرخ انگارے دہک رہے تھے اور انگاروں کے عقب میں ایک منحنی سا وجود نظر آرہا تھا، یہی بوڑھی جادوگرنی سار یہ تھی، اس کے سامنے کوئی سفید سی چیز رکھی ہوئی تھی جو یقینی طور پر لوبان نہیں تھی، وقفے وقفے سے وہ آگ میں یہ تمام چیزیں ڈالتی جارہی تھی اور آگ سے ہلکا ہلکا دھواں خارج ہو رہا تھا اور یہ بو اسی دھوئیں کی تھی جو بالکل ناگوار نہیں تھی، غالباً کوئی خاص قسم کی پسی ہوئی شئے تھی جس سے یہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شوراک نے شاہ زیب کی جانب دیکھا پھر جوشان کو دیکھنے لگی اور پھر آہستہ سے بولی۔

''میرا خیال ہے آپ لوگوں کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔''

''قطعی نہیں، ہم وہاں جانا بھی نہیں چاہتے، دیکھو ہم اس جگہ پوشیدہ ہو جاتے ہیں یہاں سے ہم وہ سب کچھ بھی دیکھ سکیں گے جو تم کرو گی اور اس کے بعد تمہاری معاونت بھی کرتے رہیں گے'

جوشان نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ واقعی یہاں سے دور نہیں تھی اور جوشان اور شاہ زیب نہ صرف یہاں سے شوراک کی کاروائی دیکھ سکتے تھے بلکہ اس کی آواز بھی سن سکتے تھے اور یہ جگہ محفوظ بھی تھی چنانچہ دونوں اس جگہ پوشیدہ ہو گئے۔ شوراک دبے قدموں چلتی ہوئی آگ کے پیچھے جا کھڑی ہوئی، یہاں داخل ہونے سے پہلے

اس نے وہ لباس بھی پہن لیا تھا جسے جوشان اپنے ساتھ لایا تھا کیونکہ اسی لباس میں شوراک کو بوڑھی جادوگرنی کے سامنے پیش ہونا تھا اور بلاشبہ اس وقت آگ کے پس منظر میں کھڑی ہوئی شوراک کوئی آسمانی دیوی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ زیب نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تمکنت ایک عجیب سا وقار دیکھا تھا اور دل ہی دل میں اس بات کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ شوراک عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ بہر حال ان دونوں کی نگاہیں شوراک ہی پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً بوڑھی ساریہ نے بہت سی خوشبو آگ میں ڈالی اور اس بار بلند ہونے والا دھواں بہت زیادہ تھا، اس کے ساتھ ہی ساریہ نے اپنے سامنے پڑے ہوئے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بجانے شروع کر دیئے۔ وہ بڑی دیوانگی کی کیفیت میں پتھروں کے یہ ٹکڑے بجا رہی تھی اور اس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں، شاہ زیب نے ان آوازوں کو سنا تو سہی لیکن سمجھ نہیں پایا جبکہ جوشان کے انداز میں ایک عجیب سی حیرت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ زیب نے سرگوشی کے انداز میں اس سے اس حیرت کی وجہ پوچھی تو وہ آہستہ سے بولا۔

''جانتے ہو بوڑھی ساریہ کیا کہہ رہی ہے؟''

''جانتا تو تم سے پوچھتا'' شاہ زیب نے کہا۔

''وہ کہہ رہی ہے اے مقدس خوشبو۔۔ اے مقدس ہواؤ۔۔ اے جلتی ہوئی آگ، اے چمکتے ہوئے تارو۔ اے جگمگاتے ہوئے چاند۔ اے پتھرو۔۔۔ مجھے بتاؤ۔۔۔ میرا خواب پورا ہو گیا یا نہیں جو کچھ میں نے کہا وہ ممکن ہے یا نہیں، ہاں یہ میرے لیے آخری لمحات ہیں میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہوں، اگر مقدس ملکہ کو میں اپنے دعوے کی تصدیق پیش نہ کر سکی تو بدنام ہو جاؤں گی میرا جادو ناکارہ قرار دیا جائے گا اور مجھے جھوٹا کہا جائے گا، میں چاہتی ہوں کہ میرا سچ ثابت کر دو، مقدس ہواؤ۔ میرا سچ ثابت کر دو، میں جھوٹی مرنا نہیں چاہتی، اسے میرے سامنے بھیج دو، مجھے حکم دو مقدس ہواؤ کہ میں اسے کہاں تلاش کروں، آہ یہ لمحات میرے لیے بے حد قیمتی ہیں، اگر میں اسے پا گئی تو زندگی پاؤں گی ورنہ مرنے کے بعد بھی میری روح ان چٹانوں میں بھٹکتی پھرے گی۔''

شاہ زیب کو یہ الفاظ بے حد عجیب محسوس ہوئے تھے، اس کا مطلب تھا کہ بوڑھی اس لمحے خاص طور سے اس بات کی توقع کر رہی تھی کہ شوراک اس کے سامنے آجائے گی، بوڑھی نے ایک بار پھر سامنے رکھا خوشبودان اٹھا لیا اور اس میں سے خوشبو انگاروں پر ڈالنے لگی، تب ہی شوراک کے منہ سے ایک آواز نکلی وہ مدھم لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی اور یہ زبان یقینی طور پر مقامی تھی، اس بار بھی جوشان کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ابھرے تھے۔

''ارے ارے یہ لڑکی یہ زبان جانتی ہے۔؟''

شاہ زیب جواب دیئے بغیر ادھر دیکھتا رہا، جیسے ہی شوراک کے منہ سے الفاظ نکلے، بوڑھی ساریہ دیوانہ وار کھڑی ہو گئی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیئے، اس کے چہرے سے مسرت پھوٹ رہی تھی، تب ہی شوراک نے تیزی سے آگے بڑھ کر بوڑھی جادوگرنی کے دونوں ہاتھ انگاروں سے ہٹا لیے اور بوڑھی کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی، وہ اپنی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ شاہ زیب کے پوچھنے پر جوشان نے اسے بتایا۔

''آہ آ گئی تو ہواؤں کی بیٹی تو آ گئی، ملکہ زادی مجھے یقین تھا تو آئے گی، آہ وقت نے مجھے سچا ثابت کر دیا، ساریہ کے لیے اس سے حسین موقع زندگی میں کبھی نہیں آیا تو آ گئی میری بچی، تو نے میری لاج رکھ لی'' اس نے آگے بڑھ کر شوراک کو سینے سے لگا لیا۔ شوراک اس کے جلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی بوڑھی نے پھر کچھ کہا اور جوشان نے شاہ زیب کو اپنی زبان میں بتایا

''آہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے جا رہی تھی، میں سوچ رہی تھی کہ جھوٹی ہونے کے بجائے میرا مر جانا بہتر ہے، یہ زخم کچھ نہیں ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہیں، تو آ گئی مجھے زندگی کی ساری خوشیاں مل گئیں، لوگو شیکال کے لوگو۔۔۔تمہاری ملکہ تمہارے درمیان آ گئی، سار یہ سچ بولتی ہے اور تم یہی کہنا کہ سار یہ سچی تھی، میرا سارا جادو اسی وقت کے لیے تھا، آ میری بچی، میں اعلان کرادوں میں بتادوں کہ مقدس ملکہ ہمارے درمیان آ گئی ہے، شیکال کے سونے والو، آج کی رات سونے کی نہیں جاگنے کی رات ہے۔ جشن منانے کی رات ہے۔''

بوڑھی سار یہ دیوانہ وار اچھل رہی تھی، اس کے کمزور بدن میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی وہ شوراک کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک جانب بھاگی۔ جوشان اور شاہ زیب یہ اندازہ نہیں لگا پائے تھے کہ وہ اسے کہاں لیے جا رہی ہے ویسے یہ باہر جانے کا راستہ نہیں تھا بلکہ کچھ بلندی کچھ سیڑھیاں سی تھیں جسے عبور کرنے کے بعد وہ کسی مخصوص جگہ پہنچ گئی، یہاں سے یہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، جوشان نے شاہ زیب کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

''تمہاری دوست نے تو کمال ہی کر دیا، وہ اس سے افریقی زبان میں بات کر رہی تھی، میں اس کے الفاظ تو نہیں سن سکا، لیکن بوڑھی کا انداز یہی بتاتا تھا جیسے اس نے شوراک کی آمد کا اعلان سنا ہو۔''

شاہ زیب نے خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی، البتہ اب یہ لوگ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے یہ لوگ اس تمام صورت حال کا نظارہ کر سکیں۔ بہر حال یہ لوگ بھی سیڑھیاں چڑھنے لگے، سیڑھیاں بلندی تک گئی تھیں، لیکن ایک راستہ درمیان سے کٹتا تھا اور وہ ایک چٹان پر جا کر ختم ہوتا تھا، ابھی یہ لوگ چٹان تک نہیں پہنچے تھے کہ بوڑھی سار یہ کی آواز ابھری، جبکہ جوشان شاہ زیب کا مترجم بنا ہوا تھا، بوڑھی کہہ رہی تھی۔

''شیکال کے سونے والو، سو رہے ہو، سونا بہتر نہیں ہے جاگو کہ جاگنے والی رات آ گئی، آؤ اس خانقاہ کی طرف اور سار یہ کے سچ کی تصدیق کرو اور سنو تمہاری دیوی تمہارے درمیان آ گئی ہے، دیکھو میں تمہارے سامنے اپنا سچ پیش کر رہی ہوں۔''

اس کی کمزور آواز اس قدر نہیں تھی کہ بستی تک پہنچ جاتی، چنانچہ اس نے کچھ اور کارروائی کی اور چند ہی لمحات کے بعد ایک بھیانک آواز فضا میں گونجنے لگی، یہ نرسنگھے کی آواز تھی، غالباً کسی بہت بڑے نرسنگھے کو پھونکا جا رہا تھا اور اس آواز کے اثرات بستی والوں پر فوراً ہی ظاہر ہو گئے، بستی کے زیادہ تر لوگ سو چکے تھے روشنیاں بجھ گئی تھیں، لیکن نرسنگھے کی مسلسل گونجنے والی آواز سے لوگ جاگنے لگے تھے اور ہر گھر میں روشنی ہوتی جا رہی تھی، لوگ اس نرسنگھے کی آواز کو کسی آفت کا پیش خیمہ سمجھے تھے، پھر آہستہ آہستہ لوگوں کو جھونپڑوں سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا، وہ ٹڈی دل کی طرح اپنے اپنے جھونپڑوں سے باہر نکل کر ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے، بہر طور یہ لوگ سکتے کی سی کیفیت میں جائزہ لیتے رہے، جوشان بھی بالکل خاموش اس عجیب وغریب منظر کو دیکھ رہا تھا، جہاں تک نگاہیں کام کر رہی تھیں وہاں تک انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے، پھر کچھ مشعلیں تیزی سے خانقاہ کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئیں اور جوشان نے شاہ زیب سے کہا۔

''بہتر ہے کہ تھوڑی سی آڑ میں ہو جاؤ، اس وقت سب کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی ہیں، ہم سے تھوڑی بلندی پر سونا را بوڑھی کے ساتھ موجود ہے۔''

شاہ زیب نے جوشان کی ہدایت پر عمل کیا آنے والے گھوڑوں پر سوار تھے، ان کی تیز رفتاری سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ بستی کے دوسرے سرے سے آ رہے تھے اور ان کے لیے راستہ چھوڑا جا رہا تھا، جوشان نے آہستہ سے کہا۔

''ہو سکتا ہے ان آنے والوں میں میسی سونا تا بھی شامل ہو۔''

شاہ زیب اور جوشان ان لوگوں کو دیکھتے رہے، چھ گھوڑے سوار تھے ساتواں سوار ان سے کسی قدر آگے

گھوڑے پر سفر کر رہا تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس راستے پر آ گئے جہاں سے خانقاہ کی سیڑھیاں آتی تھیں اور پھر شعلوں کی روشنی میں اس قدآور عورت کو دیکھا گیا جو گھوڑے سے اتر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی، بقیہ چھ افراد بھی اس کے عقب میں چلے آ رہے تھے، یہ عورت میسی سوناٹا کے علاوہ بھلا اور کون ہو سکتی تھی، رات کی تاریکی میں اس کے خدوخال تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس کی چال میں بڑی مستعدی تھی اور وہ تیزی سے خانقاہ کی سیڑھیاں عبور کرتی ہوئی اوپر آ رہی تھی۔

اوپر سے بوڑھی چیخ رہی تھی۔ ''شیکال کی ملکہ دیکھ ساریہ نے تیری عزت رکھ لی، دیکھ ساریہ نے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا، دیکھ اس کے سچ کی تصوری تیرے سامنے ہے، ساریہ جھوٹ نہیں بولتی، شیکال کی ملکہ مقدس دیوی تیرے سامنے آ گئی۔ تیری بیٹی میرے پاس موجود ہے، اپنی رفتار میں تیزی پیدا کر۔'' اور اس کے بعد وہ غالباً اس راستے سے نیچے اترنے لگی جس سے چڑھ کر وہ اوپر پہنچی تھی۔

شاہ زیب اور جوشان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ پھر اس جگہ پہنچ جاتے جہاں سے ان واقعات کا نظارہ اور تجزیہ کیا جا سکتا، تاہم انہوں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے کدی نہ کسی حد تک کچھ نہ کچھ تو نظر آئے۔ پھر میسی سوناٹا سیڑھیاں عبور کر کے خانقاہ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ چہرے کا کروفر وقار اور تمکنت بالکل جوانوں جیسی تھی اور انداز سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ کسی قبیلے کی ملکہ ہے۔

میسی سوناٹا تیزی سے آگے بڑھی شوراک ساریہ کے ساتھ تھی اور اس کے چہرے پر جذبات کے سائے لرز رہے تھے۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا بہت طویل ترین عرصے کے بعد نجانے کتنے عرصے کے بعد اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا، لیکن اس کے جذبات اس کی محبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی، میسی سوناٹا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا وہی چہرہ، وہی سب کچھ اور اس کے بعد اس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے اور دوسرے لمحے وہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئی تھیں۔ ان کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کے بعد وہ منظر بھی دیکھا گیا جس کا مطلب شاہ زیب بخوبی سمجھ گیا تھا لیکن مسٹر جوشان حیرت زدہ تھے۔

میسی سوناٹا نے شوراک کی پشت برہنہ کر دی اور مشعل لے کر اس پر کچھ دیکھنے لگی، اس کے بعد ایک زبردست چیخ کے ساتھ شوراک کو دوبارہ سینے سے لگا لیا تھا۔ شوراک نے ایک مرتبہ شاہ زیب سے تذکرہ کیا تھا کہ اس کی پشت پر ایک نشان ہے جو غالباً اس کا خاندانی نشان ہے، اس نشان نے شوراک کی تمام مشکل حل کر دی تھی، میسی سوناٹا بے اختیار اپنی بیٹی کو سینے سے لگائے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ آنے والے مؤدب نظر آ رہے تھے۔ پھر بوڑھی ساریہ اور میسی سوناٹا کے درمیان کچھ مکالموں کا تبادلہ ہوا اور اس کے بعد میسی سوناٹا شوراک کو لے کر واپس پلٹ پڑی۔ تبھی شوراک کی آواز زور سے ابھری۔

''محافظ روحو! میرے محسنو۔۔۔ میرا انتظار کرنا اور تم پر لازم ہے کہ تم اپنا تحفظ کرتے رہو، لیکن زیادہ وقت نہیں گزرے گا جب میں تمہاری مشکل آسان کر دوں گی اور یہی بہتر ہے کہ یہ جگہ چھوڑنے کی کوشش نہ کرنا تا کہ میں تمہیں آسانی سے پا لوں۔'' یہ الفاظ اس نے انگریزی میں ادا کئے تھے اور جوشان اور شاہ زیب سمجھ رہے تھے کہ یہ الفاظ ان کے لیے ہیں۔

میسی سوناٹا ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھنے لگی پھر جب شوراک خاموش ہو گئی تو میسی سوناٹا نے اسے اپنے سائے میں لے لیا اور اس کے بعد ساریہ کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ یہ بہتر تھا کیونکہ ساریہ کی یہاں موجودگی ان دونوں کے لیے مشکل ثابت ہو سکتی تھی، پھر وہ سب باہر نکل گئے۔

خانقاہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ لوگ اپنے گھوڑوں کے نزدیک پہنچ گئے سوئی ہوئی آبادی پوری طرح جاگ گئی تھی اور وہ لوگ غالباً یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ نرسنگھے کی آواز فضا میں کیوں پھیلائی گئی۔

شاہ زیب نے مسٹر جوشان کی طرف دیکھا جو بہت خوش نظر آ رہے تھے، انہوں نے شاہ زیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''شاہ زیب میرے دوست ہم نے بلاشبہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور تمہاری ساتھی لڑکی اداکاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی جو کچھ دیکھا گیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یقینی طور پر اس عورت کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائے گی کہ وہی اس کی بیٹی شوراک ہے اور اگر اسے کامیابی حاصل ہو گئی تو پھر تم دیکھ لینا کہ ہماری تقدیریں بدل جائیں گی۔''

شاہ زیب دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا، اس کے باوجود وہ ابھی مسٹر جوشان کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ درحقیقت وہی لڑکی شوراک ہے، اصولی طور پر ابھی یہ مناسب نہیں تھا، جب تک کہ کوئی ایسی کارروائی نہ ہو جائے جس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ میرا یہ انکشاف کسی طور پر نقصان دہ نہیں ہو سکتا، چند لمحات کے بعد مسٹر جوشان نے کہا۔

''اور وہ ہمیں ہدایت کر گئی ہے کہ ہم اسی خانقاہ میں رہیں اب دیکھو ہم پر کیا بیتتی ہے'

یہ لوگ اس بلند جگہ پہنچ گئے جہاں سے تھوڑی دیر قبل نرسنگھا پھونکا گیا تھا۔ یہاں سے بستی کا منظر مزید صاف نظر آ رہا تھا، گھوڑوں کی قطار چلتی جا رہی تھی اور شعلوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔

ویسے پوری بستی روشن ہوتی جا رہی تھی، پتا نہیں دیکھنے والوں نے کیا دیکھا۔ یہ لوگ کافی دیر تک وہاں کھڑے رہے، بستی میں مسلسل چہل پہل نظر آ رہی تھی، پھر مسٹر جوشان نے کہا۔

''آؤ یہاں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتے ہیں۔''

شاہ زیب نے مسٹر جوشان سے اتفاق کر لیا اور یہ لوگ نیچے اتر آئے پھر انہوں نے خانقاہ کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن کوئی ایسی چیز نہ ملی جسے غذا کے طور پر استعمال کیا جا سکتا، شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''وہ راہبہ بھی ظاہر ہے دنیا کے عیش و عشرت سے اسے کوئی لگاؤ نہ ہوگا۔''

''لعنت ہے اس پر بغیر کھانے پیئے جینا بھی کوئی جینا ہے، مجھے دیکھو، میں نے کس محنت سے وہ اشیاء جمع کی تھیں، جبکہ میں بھی ایک راہب ہی کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا۔'' جوشان کی بات پر شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اگر سونارا ہمیں نظر انداز نہ کرے تو پھر یقیناً بہت جلد ہمارے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔''

''خدا کرے اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔''

دونوں کچھ تھکن سی محسوس کر رہے تھے چنانچہ ایک مناسب جگہ دیکھ کر لیٹ گئے لیکن نیند کا آنکھوں میں شائبہ بھی نہیں تھا ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسی طرح گزر گیا، پھر مسٹر جوشان اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھے۔

''کہاں جا رہے ہیں مسٹر جوشان؟''

''ذرا دیکھیں باہر کیا حالات ہیں۔''

دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے باہر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا، بستی میں وہی چہل پہل تھی، بستی والوں کو ابھی شاید صورت حال سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا، انداز سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ اصل صورت حال ابھی تک سمجھ نہیں پائے ہیں۔ ظاہر ہے اتنی جلدی شوراک کی آمد کا اعلان ہو بھی نہیں سکتا تھا، اب یہ ان کے اپنے معاملات تھے، مسٹر جوان تو ابھی اسی امید و بیم کی کیفیت کا شکار تھے کہ سونارا پتا نہیں میسی سوناٹا کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو بھی سکے گی یا نہیں کہ وہ شوراک ہے۔

اگر ایسا نہ ہوا تو پھر مسٹر جوشان کی تمام محنت اکارت جائے گی، لیکن اس کے برعکس شاہ زیب اس سلسلے میں سو فیصد یقین رکھتا تھا کہ شوراک کو اپنی حیثیت منوانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی، بلکہ اس نے یہ حیثیت چند لمحات ہی میں منوا لی تھی۔ شاہ زیب نے مسٹر جوشان سے کہا۔

''مسٹر جوشان، اگر آپ ساری رات جاگنا چاہتے ہیں تو جاگتے رہیں، میں سونے جا رہا ہوں''
''جاگنا بے سود ہی ہے، لیکن نیند کیسے آئے گی، تاہم اگر تم سونا چاہو تو سو جاؤ اگر کوئی خاص بات ہوئی تو میں تمہیں جگا دوں گا۔''

شاہ زیب نے اس بات کی حامی بھر لی اور پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر لیٹ گیا، اس نے تمام فکریں بھلا کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایک بار پھر ذہن سے خیالات کے قافلے گزرنے لگے، بہت سی سوچیں بہت سے احساسات اور اس کے بعد سکون اور یہ سکون نیند آ جانے ہی سے پیدا ہوا تھا۔

نیند بھی کیا پر لطف چیز ہے، تمام جھگڑوں تمام وسوسوں سے بے نیاز کر دیتی ہے، کوئی غم کوئی پریشانی نہیں رہتی، نجانے لوگ موت سے خوفزدہ کیوں ہوتے ہیں، اس ابدی نیند کے بعد تو یہ خطرہ بھی نہیں رہتا کہ صبح ہو گی اور آنکھ کھل جائے گی۔

مسٹر جوشان نے نجانے رات کس طرح گزاری جبکہ شاہ زیب بڑے مزے سے دن چڑھے تک سوتا رہا تھا، جاگا تو سب سے پہلے مسٹر جوشان کی صورت نظر آئی وہ کچھ پریشان سے بیٹھے ہوئے تھے، شاہ زیب کو دیکھ کر چونکے اور ہراساں لہجے میں بولے۔

''اب تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔''
''آپ پریشان کیوں ہیں مسٹر جوشان؟''
''اس خطرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہو سکتا ہے تمہاری دوست ناکام ہو جائے''
''آپ اس لیے پریشان ہیں؟''
''یہ پریشانی کی بات نہیں ہے کیا، بہرحال وہ ایک لڑکی ہے بے شک ذہین ہے لیکن اس کی ذہانت شکست بھی کھا سکتی ہے، ایک ماں اور بیٹی کا معاملہ ہے ہو سکتا ہے وہ تجربے کار میسی سوناتا کے سامنے پہنچ کر اپنی اداکاری برقرار نہ رکھ سکے۔ ایسی صورت میں خود ہمارے لیے بھی مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔'' مسٹر جوشان نے پریشان لہجے میں کہا۔
''اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال تھا مسٹر جوشان تو پھر آپ کو یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا، اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر میری ساتھی لڑکی کو مصیبت میں پھنسا دیا''
''اور نہیں غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، بہرحال وہ ایک کوشش تھی اور اس کوشش میں کامیابی ہی ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی دلا سکتی تھی۔''
''تو پھر اس کوشش کی کامیابی یا ناکامی کا انتظار کریں۔'' شاہ زیب نے جوشان کی پریشانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔
''تم اتنے پریشان نہیں معلوم ہوتے جتنا میں ہوں۔''
''آپ کو اس سلسلے میں الجھنا نہیں چاہیے مسٹر جوشان، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو کام آپ نے ایک غلط انداز میں کرنے کی کوشش کی وہ اپنی نوعیت میں صحیح حیثیت رکھتا ہے۔''
مسٹر جوشان نہ سمجھنے والے انداز میں شاہ زیب کی صورت دیکھنے لگے، پھر انہوں نے آہستہ سے کہا ''میں نہیں سمجھا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''
''دلچسپ بات یہ ہے مسٹر جوشان کہ آپ نے جس پریشانی کا اظہار کیا وہ بے معنی ہے، چونکہ جس لڑکی کو آپ نے شوراک کی حیثیت سے میسی سوناتا تک پہنچایا ہے اصل میں وہی شوراک ہے۔''
مسٹر جوشان کچھ دیر تک شاہ زیب کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا
''تم کہنا کیا چاہتے ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا؟''

''اگر میں آپ سے کہوں کہ جولڑکی سونارا کے نام سے میرے پاس تھی، وہ اصلی شوراک تھی اور میرا مشن بھی یہی تھا کہ اصل شوراک کو اس کی ماں کے پاس پہنچا دوں تو کیا آپ میری بات پر یقین کریں گے؟''

''تم شاید اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو، ایسا لگتا ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا اس پر تم نے خود بھی غور کیا؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، اب اس کے بدلے میں آپ کو اگر میں ایک کہانی سناؤں تو آپ اس وقت بھی یہی سوچیں گے کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہوں۔''

''مجھے کہانیاں سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نجانے کیوں مجھ پر ایک بے چینی سے سوار ہو رہی ہے۔''

''آپ اس بے چینی کو رفع کریں مسٹر جوشان، حقیقت یہی ہے کہ وہ لڑکی شوراک ہی ہے اور اس کا پس منظر کچھ یوں ہے۔''

شاہ زیب نے شروع سے لے کر آخر تک جوشان کو سونارا کی کہانی سنانا شروع کر دی، وہ بے زاری کے عالم میں منہ بنائے بیٹھے ہوئے تھے اور صاف لگ رہا تھا جیسے انہیں اس کہانی پر ذرہ برابر یقین نہ آیا ہو، شاہ زیب نے انہیں پوری تفصیل سنادی تو وہ آہستہ سے بولے۔

''اچھی کہانی گھڑی ہے تم نے ویسے تمہارا کیا خیال ہے کیا میں اس پر یقین کر سکتا ہوں۔؟''

''یہ آپ کی مرضی ہے مسٹر جوشان، یقین نہیں کر سکتے تو آپ پریشان ہوتے رہیں، میرے اوپر کوئی اثر نہیں پڑتا۔'' شاہ زیب نے کسی قدر ناخوشگواری سے کہا مسٹر جوشان خاموش ہو گئے تھے اور شاہ زیب کو ان کی اس الجھن پر ہنسی آ رہی تھی۔

پھر اس نے سوچا کہ ذرا باہر کا نظارہ کیا جائے کہ باہر کی کیفیت کیا ہے، ویسے شاہ زیب کا خیال یہ تھا کہ شوراک کے مل جانے کی خوشی میں قبیلے میں جشن برپا ہو جائے گا اور یقینی طور پر اس سلسلے میں خوب ہنگامے ہوں گے، بلا شبہ ایسا نہیں ہو سکا تھا اور اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی تھی۔

اس وقت بھی قبیلے کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کاروبار زندگی جاری تھے۔ سب سے بڑی پریشانی کھانے پینے کی تھی، اس خانقاہ میں کچھ کھانے پینے کو نہیں ملا تھا اور ابھی تک شوراک نے بھی کوئی خبر نہیں لی تھی، ویسے اس کی اس کیفیت پر شاہ زیب کو کوفت ضرور ہوتی تھی۔

کم از کم اسے ان لوگوں کی خبر گیری تو کرنی چاہیے تھی، وہ جانتی تھی کہ شاہ زیب اور مسٹر جوشان یہاں موجود ہیں اور اسی کے رحم و کرم پر ہیں، پھر نجانے کیوں شاہ زیب کو بھی مسٹر جوشان کی پریشانی کچھ محسوس ہونے لگی، کچھ عجیب سی بات نہیں تھی، مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے اور کچھ ہنگامہ خیزی نہیں ہو رہی، اس کی وجہ کیا ہے۔

شاہ زیب بہت دیر تک اپنی جگہ رک کر اس صورت حال کا جائزہ لیتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر واپس پلٹ پڑا، اب وہ مسٹر جوشان سے گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ کھانے پینے کے لیے کیا کارروائی کرنی چاہیے، ورنہ یہاں تو بھوکے ہی مر جائیں گے۔

شاہ زیب اس جگہ پہنچ گیا جہاں مسٹر جوشان کو چھوڑ کر گیا تھا، لیکن مسٹر جوشان وہاں موجود نہیں تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ بھی کہیں اندرونی حصے میں نہ گئے ہوں اور اسی خیال کے تحت اس نے مسٹر جوشان کو پکارا۔

''مسٹر جوشان، مسٹر جوشان کہاں ہیں آپ؟'' لیکن ان آوازوں کو کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ دفعتاً ہی شاہ زیب کا دل دھک سے ہو گیا، کیا مسٹر جوشان اپنی الجھنوں کا شکار ہو کر یہاں سے کہیں اور چلے گئے اگر ایسا ہوا ہے تو بہت برا ہوا، شاہ زیب پوری خانقاہ کا جائزہ لیتا رہا، لیکن مسٹر جوشان کا کہیں پتا نہیں تھا۔

البتہ اس تلاش میں شاہ زیب کو ایک ایسی جگہ دریافت ہوگئی جہاں کھانے پینے کی معمولی سی اشیاء اور پانی وغیرہ موجود تھا۔ ابھی کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ تصور بڑا جان لیوا تھا کہ مسٹر جوشان یہاں سے فرار ہوگئے ہیں۔ کہیں یہ بیوقوف آدمی کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے، آخر وہ کیا کرلے گا، کہاں جائے گا، بہت دیر تک وہ مسٹر جوشان کو تلاش میں سرگرداں رہا۔

خانقاہ سے باہر آکر بھی چاروں طرف دیکھا، لیکن مسٹر جوشان یہاں سے فرار ہوگئے تھے، شاہ زیب مجبور ہوکر واپس آگیا اور اس کے بعد جو کچھ روکھا پھیکا وہاں موجود تھا اس سے پیٹ کی آگ بجھائی۔

پہلے مسٹر جوشان پریشان تھے اور شاہ زیب مطمئن تھا، لیکن اب شاہ زیب کی پریشانیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ دونوں ہی باتیں سوچنے کے قابل تھیں۔

یہ خاموشی کیا معنی رکھتی ہے اور اس کی وجہ کیا ہے، دوسری بات یہ کہ مسٹر جوشان کہاں گم ہوگئے، شام ہوگئی، لیکن دونوں ہی باتوں میں سے کچھ نہ ہوا، نہ ہی مسٹر جوشان واپس آئے اور نہ شوراک کا کوئی ہنگامہ ہوا۔ رات بھی اسی خاموشی سے گزر گئی اور دوسری صبح جب وہ ٹھنڈی زمین پر گہری نیند سو رہا تھا دفعتاً ہی ہنگامے شروع ہوگئے۔

چاروں طرف سے عجیب وغریب قسم کی آوازیں آرہی تھیں، کہیں ڈھول پیٹا جارہا تھا اور کہیں نعرے لگائے جارہے تھے، شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑتا ہوا اس سوراخ پر آگیا جہاں سے باہر کا جائزہ لیا جاسکتا تھا اور پھر شاہ زیب نے گہری سانس لی۔

یہ شور وغل خوشیاں منانے ہی کا تھا، لیکن اس کے لیے انہوں نے بڑی تاخیر کی، شاہ زیب یہاں سے ان لوگوں کا جائزہ لیتا رہا، تمام لوگ ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ کررہے تھے اور ان کے چہروں سے خوشی کا اظہار ہورہا تھا، پتا نہیں یہ اتنی طویل خاموشی کیا معنی رکھتی تھی، ہوسکتا ہے میسی سوناٹا قبیلوں کے امراء کو طلب کرکے صلاح ومشورے کررہی ہو، ہوسکتا ہے ابتداء میں کچھ لوگوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہو کہ وہ لڑکی ہی اصل شوراک ہے اور واپس آگئی ہے اور اس کے بعد جب میسی سوناٹا نے ان حالات پر قابو پالیا تو خوشیوں کا اعلان ہوا یقیناً ایسا ہی ہوسکتا ہے۔

شاہ زیب کو اب غصہ آنے لگا تھا، عجیب احمق آدمی تھا، اگر تھوڑا سا انتظار کرلیتا تو کیا حرج تھا، طویل عرصے سے تو وہ انتظار میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے آپ کو ان لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ کررکھا تھا اس نے، لیکن اب چند گھنٹے صبر نہ کرسکا، بہر طور اس کا مسئلہ تھا اب جو کچھ بھی اس پر بیتے گی وہ اس کی اپنی ذمے داری ہوگی۔

وقت گزرتا رہا، ہنگامے عروج پر تھے پھر شاہ زیب نے لوگوں کو اپنے اپنے مکانات سجاتے ہوئے دیکھا، درختوں کی پتیاں چھالوں میں باندھ کر وہ گلی کوچوں میں لٹکا رہے تھے، یہ یقیناً خوشی کا اظہار تھا، وہ جشن منا رہے تھے، شاہ زیب ان کی یہ خوشیاں دیکھتا رہا اور اب اس بات پر اسے کوئی شبہ نہیں رہا کہ ان سب کو شوراک کی آمد کی اطلاع مل گئی ہے لیکن شوراک کی خاموشی تکلیف دہ تھی۔

پھر اس وقت شام کے ساڑھے چار بجے تھے کہ خانقاہ کے سامنے والے حصے کی سیڑھیوں کے اوپر چند افراد آتے نظر آئے، وہ اپنے ہاتھوں میں بہت سی چیزیں اٹھائے ہوئے تھے۔

شاہ زیب نے گہری سانس لی، گویا اب شوراک کو یہ خیال آیا کہ اس کے ساتھی اسی خانقاہ میں ہیں، آنے والوں نے اندر آنے کے بعد وہ اشیاء ایک جگہ رکھ دیں اور پھر اپنی زبان میں شاہ زیب کو آوازیں دینے لگے، شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے سامنے جائے یا نہ جائے۔

بہر طور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے نکل آیا وہ کھانے پینے کی اشیاء کی طرف اشارہ کرکے شاہ زیب سے کچھ کہہ رہے تھے، شاہ زیب نے مسٹر جوشان کی ہدایت کے مطابق خود کو گونگا ظاہر کرتے ہوئے اشارے

سے گردن ہلا دی تھی۔
وہ لوگ خاموشی سے واپس چلے گئے، تب شاہ زیب نے کھانے پینے کی اشیاء کی طرف دیکھا، لیکن یہ سب کچھ شاہ زیب کو اچھا نہیں لگ رہا تھا، اصولاً شاہ زیب کو فوراً ہی وہاں طلب کرلیا جانا چاہیے تھا جہاں شوراک موجود تھی لیکن اس سلسلے میں اجتناب برتا گیا تھا اور وہ رویہ نہیں رکھا گیا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔
شوراک سے بات کھٹی ہوگئی، لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں تھی، ساری دنیا ہی اپنے مقصد کے لیے جی رہی تھی اس نے اپنی حیثیت حاصل کرنے کے بعد شاہ زیب کو اگر نظر انداز کر دیا تو یہ کوئی ایسی بات تو نہیں تھی جو بہت ہی حیرت انگیز ہو، ٹھیک ہے ایسا ہی سہی، اس نے سوچا تھا۔
اس کے بعد چھ دن اس نے اسی خانقاہ میں گزاری تھی، پھر ساتویں رات اس سارے مرحلے کے لیے فیصلہ کن بن گئی، شاہ زیب کو میسی سوناٹا کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔
''مسٹر شاہ زیب، بیرونی دنیا سے آنے والے مردوں کو یہاں آنے کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے اور بہت عرصے کے بعد میں اپنے ہی احکامت سے انحراف کر رہی ہوں، صرف اس بنیاد پر کہ تم نے میری بیٹی کو یہاں تک پہنچانے کے لیے بڑی محنت کی ہے، لیکن رات کی تاریکیوں میں تمہارا یہاں سے نکل جانا ضروری ہے، ورنہ دن کی روشنی میں اگر قبیلے والے تم تک پہنچ گئے تو تمہارا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ اور ہاں ایک بات اور سنو اگر تم کسی خزانے کے حصول کی خواہش مند ہو تو اس علاقے میں ایسا کوئی خزانہ نہیں ہے، یہ صرف روایتی باتیں ہیں۔
ہاں تمہاری خدمات کے اعتراف میں یہ چھوٹا سا نذرانہ دے رہی ہوں جو تمہاری دنیا کے لیے بہت قیمتی ہوگا۔''
شوراک نے اپنے لباس سے ایک بری سی تھیلی نکالی اور اس کا منہ کھول کر شاہ زیب کے سامنے الٹ دیا، آٹھ قیمتی ہیرے تھے اور اس کے ساتھ ہی کچھ سونے کے بہت سے ٹکڑے تھے جن کا مجموعی وزن کافی بن جاتا تھا، میسی سوناٹا نے پروقار لہجے میں کہا۔
''نوجوان میرے تجربات بہت تلخ رہے ہیں اس لیے تم اب زندگی بھر شوراک سے نہیں مل سکتے، میرے یہ دو آدمی تمہیں بتائیں گے کہ تمہارا آگے کا سفر کس انداز میں ہوگا۔''
دنیا کے رنگ ڈھنگ ہر جگہ نمایاں ہیں چاہے وہ صحرائے اعظم افریقہ کا کوئی حصہ ہو یا پھر نیویارک سٹی، انسانی سوچ ہر جگہ یکساں ہے، اپنے بارے میں نہ سوچو تو حالات کے دھارے کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے اور انسان خود اپنا نہیں رہتا۔
شاہ زیب کی بھی یہی کیفیت تھی، اس کی اپنی جستجو نہیں تھی، بس وقت کے دھارے میں بہتا کہیں سے کہیں نکل آیا تھا کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، لیکن کبھی کبھی زندگی کا رخ بدلنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے اور وہ رات ایک نئے فیصلے کی حامل تھی، اس نے مہذب افریقہ کے ایک ہوٹل کے کمرے میں دادی اماں کو خواب میں دیکھا خاموش کھڑی تھیں چہرے پر اداسی رقصاں تھی،
''کیا بات ہے دادی اماں۔'' اس نے پوچھا۔
''واپس آجا شاہو بس بہت ہوگئی واپس آجا۔''
اور وہ جاگ گیا، اچانک جیسے ذہن کے بہت سے پردے کھل گئے، ان کے پیچھے ماضی سجا ہوا تھا، گھر بھائی بھابیاں اور جان دینے والی دادی اماں، میں ان کے دور کیوں ہوں کیا مشن ہے میری زندگی کا، یہ دربدری کیوں ہے، کیا کرنا ہے مجھے، کیوں کرنا ہے میرا گھر ہے ایک اطمینان بخش زندگی ہے اس گھر کی، پھر سوال سوال سوال۔۔۔
یہیں سے ذہنی رو بھٹک گئی، اسٹیئرنگ گھوم گیا، رخ بدل گیا ذہین تھا اعلیٰ کارکردگی کا مالک تھا، کس کس کے لیے کیا کیا کرتا رہا تھا، اب اپنے لیے کچھ کرنا تھا اور کامیابی سے کرنا تھا، اب اس کا رخ اپنے وطن کی طرف تھا، بہت سی یادیں تھیں اور ان یادوں میں ایک خوبصورت چہرہ بھی تھا۔

کجری۔۔۔جس نے اس سے وعدہ کیا تھا اور جب پرندے دن بھر کے بعد اپنے گھونسلوں کا رخ کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں پیار کے خزانے ہوتے ہیں اور وہ اپنے مسکن کے لیے ہمکتے ہیں وہاں ایک چہرہ ہے، دو آنکھیں ہیں جو ملن کی آس میں کھلی ہوئی ہیں۔

کجری اس کے ذہن میں آئی تو اس نے تھوڑا سا رخ بدل لیا کجری کا گاؤں جوں کا توں تھا ماسٹر صاحب نے اسے پہچان کر ہکا بکا رہ گئے۔

''تم آگئے۔''

''ہاں یہاں میں ایک قیمتی خزانہ چھوڑ گیا تھا۔

''کونسا خزانہ؟'

''کجری۔''

''وہ بڑی مسجد کے حجرے میں رہتی ہے اللہ والی بن گئی ہے، ہر مرض کی دوا ہے اس کے پاس اور وہ تمہارے بارے میں بتاتی رہتی ہے۔''

''میرے بارے میں۔'' شاہ زیب حیرت سے بولا۔

''ہاں اس نے بتایا تھا کہ رجب کا مہینہ ہوگا جب تم آؤ گے اور یہ رجب کا مہینہ ہے اور میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔''

''میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔''

''بس بڑی مسجد کے حجرے میں چلے جاؤ۔''

''آج تو رجب ہے میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور قدرت کی عطاء کا ایک دروازہ کھلا، رب العزت نے اپنے محبوب کے لیے کائنات بنا دی تو محبت کو جذب کا مقام کیوں نہ حاصل ہوتا شاہ زیب بڑے بڑے خطرناک حالات سے گزرا، لیکن اس نے اس پرچھائیں پر کبھی غور بھی نہ کیا ہوگا جو کجری کے سچے پیار کا محافظ سایہ تھا اور جس نے اس کے خلاف ہر دشمن کو ناکام کیا۔

''میں جانتی تھی کہ تم آجاؤ گے۔''

''تیار ہو جاؤ، ہمیں گھر چلنا ہے۔'' شاہزیب نے کہا۔

یہ دن اس گھر کی عید تھا جب شاہزیب اور کجری وہاں داخل ہوئے تھے۔

دادی اماں نے اسے گلے لگا کر کہا ''دعا مانگی تھی میں نے تیرے لیے اور میرے دل نے مجھے تسلی دے کر بتایا تھا کہ میری دعا بارگاہ ایزدی میں قبول ہوگئی۔

اللہ نے ایک کائنات اپنے محبوب کے لیے بنائی اور دوسری کائنات اپنے بندوں کے دل میں آباد کی جس میں وہ خود رہتا ہے، میں نے اس سے تیری سلامتی مانگی اور میرے دل میں بیٹھے خدا نے مجھے سکون دے کر بتایا کہ اس نے میری دعا قبول کر لی ہے۔

''مجھے کینسر نہیں ہے دادی اماں۔''

''ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

''مگر ایک مشکل ہے۔''

''کیا؟''

''مجھے میرے چھ ہم شکل مل گئے، ساتواں نہیں ملا۔''

دادی اماں پوری کہانی سن کر خوب ہنسیں اور بولیں ''بیوقوف ساتوں ہم شکل تو خود ہے''

''ایں۔'' شاہ زیب حیران رہ گیا۔

(ختم شد)

ہم شکل جیسے عظیم ناول کے بعد

ایم اے راحت کا ایک اور معرکتہ الآراء شاہ کار

"زرد لومڑی"

دہکتے ہوئے رخسار، چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں،

دلکش تراش کے بولتے ہوئے خاموش ہونٹ کچھ کہتے ہوئے،

شاخ نازک جیسے لچکتے ہوئے بدن والی حسینہ لیکن لومڑی سے زیادہ چالاک

جس کے نشانے پر آئے ہوئے دشمن اپنی موت یقین کر لیتے تھے

"زرد لومڑی"

جس کے نام سے بڑے بڑے جیالے کانپ اُٹھتے تھے

ایک انوکھے اِنتقام کی کہانی جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا

انتقام کی ایک ایسی لازوال داستان' جسے قارئین کبھی نہ بھلا پائیں گے

ماہ مئی سے "سچی کہانیاں" کے صفحات پر ملاحظہ فرمایئے

پکّا پھل

نزہت جبیں ضیاء

اُس مرد کا قصۂ عبرت، جو بیٹوں کو مستقبل کی پونجی سمجھتا تھا

اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مارے خوشی کے سارے ہاسپٹل کو سر پر اٹھالیں۔ بات بھی کچھ ایسی تھی ان کی منجھلی بہو نے اس بار بھی بیٹا پیدا کر کے ہیٹ ٹرک مکمل کردی تھی۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی بڑی بہو صاعقہ اور چھوٹی بہو تزین دونوں کے یہاں بیٹیاں ہی تھیں بڑی بہو کی دو اور چھوٹی بہو کی ایک بیٹی تھی۔ جبکہ منجھلی بہو حمیرا کو تیسری بار بھی بقول اماں کے شیر کے جیسا صحت مند بیٹا پیدا ہوا تھا۔ صاعقہ اور تزین کے ساتھ تو دونوں کے شوہر عظیم اور عذیر بھی خوش تھے جبکہ عزیز میاں کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

اماں جوانی میں بیوہ ہو چکی تھیں۔ شوہر کا انتقال ہوا تو بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ میاں سرکاری آفس میں معقول ملازمت کرتے تھے اس لیے انھیں اچھا خاصا پیسہ ملا تھا۔ سب سے بڑی بیٹی صائمہ جو اس وقت میٹرک سے فارغ ہو کر کالج جانے والی تھیں۔ خدا نے اسے بہت عقل اور سمجھ دی تھی اس نے اپنے ابا کے دوستوں کے ساتھ مل کر ملنے والے پیسے کو فکس ڈیپازٹ کروادیا۔ گھر اپنا تھا اس لیے کرائے کی فکر بھی نہیں تھی۔ صائمہ کے بعد ثمینہ تھی پھر عظیم، عزیز اور سب سے چھوٹا عذیر جو اس وقت صرف چار سال کا تھا۔

خالدہ خاتون بھی بڑی سمجھدار اور خاصی تیز قسم کی عورت تھیں۔ انھوں نے بہتر طریقے سے گھر کا نظام سنبھال لیا۔

صائمہ نے انٹر پاس کیا اور ثمینہ نے میٹرک کرلیا تو صائمہ کے لیے رشتہ آ گیا۔ خالدہ خاتون نے مناسب دیکھ ریکھ کے بعد رشتہ طے کردیا۔ ثمینہ بھی اچھی صورت اور اچھی سیرت کی لڑکی تھی اس کے لیے بھی اس کی دوست نے اپنے بھائی کا رشتہ دے دیا۔ لڑکا سعودی عرب میں جاب کرتا تھا۔ لڑکا اچھا تھا خاندان بھی بڑا نہ تھا اس لیے خالدہ خاتون نے اس کا رشتہ بھی طے کردیا۔ اور اس کی شادی کردی ثمینہ سعودی عرب چلی گئی۔ عظیم نے اپنے دوست کے توسط سے کسی کمپنی میں جاب کرلی کیوں کہ دونوں بیٹیوں کی شادی کے بعد پیچھے کچھ نہ بچا تھا۔

دن ماہ و سال میں بدلتے چلے گئے۔ اس عرصے میں صائمہ کے چار بچے ہوگئے۔ اس کے شوہر نے اپنا بزنس کرلیا۔

عظیم کی شادی صاعقہ بیگم سے ہوگئی۔ صاعقہ بیگم کی ایک بیٹی ہوگئی۔ عزیز کی شادی حمیرا سے اماں نے خالص اپنی پسند سے اپنی پرانی سہیلی کی بیٹی سے کردی اور اماں

کی خاص نظرِ عنایت اس بہو کی اوپر ہوتی تھی۔ عذیر کی ... نے دل پر پتھر رکھ کر اور کافی مخالفت کے بعد حامی بھری
شادی ہوگئی تزین سے تزین عذیر کی ذاتی پسند تھی جو اماں ... تھی۔ اور پھر خدا کی قدرت کہ صاعقہ کو بھی پہلی بیٹی



ہوئی۔ جبکہ حمیرا کو بیٹا اور تزین کو بھی بیٹی ہی ہوئی۔
اماں جو پہلے ہی حمیرا کو دل سے چاہتی تھیں۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد تو اور زیادہ چاہنے لگیں۔ یہ بات عظیم اور عذیر کو بھی محسوس ہوتی لیکن وہ چپ رہتے۔ جبکہ صاعقہ اور تزین کو اماں کی دو نظری بری طرح کھلتی۔
ایک بار پھر صاعقہ امید سے ہوئی تو اماں نے نمازیں طویل کرلیں۔ دعاؤں میں بیٹے کو مانگنا شروع کر دیا۔ لیکن اس بار بھی صاعقہ نے بیٹی پیدا کی اور اماں نے ناک چڑھالی۔ کیوں کہ دو ماہ بعد ہی حمیرا نے اماں کے ہاتھوں میں دوسرا ہنستا کھیلتا اور صحت مند پوتا ڈال دیا تھا۔ اب تو اماں نے حمیرا کے ساتھ اور زیادہ محبتیں کرنا شروع کر دیں۔ حمیرا کے لیے گھر کے کاموں میں خاص رعایت ہوتی۔ مہمان آجاتے تو حمیرا اپنے بچوں میں مصروف ہو کر کمرے سے باہر نہ نکلتیں۔ صاعقہ اور تزین سارے کام نپٹاتیں۔ ساتھ ساتھ حمیرا بیگم کے نخرے بھی اٹھاتیں۔ اس کے بچوں کو بھی سنبھالتیں۔ ان دونوں کی بیٹیاں نہ زیادہ تنگ کرتیں نہ روتیں جبکہ حمیرا کے دونوں بیٹے حد درجہ تنگ کرتے۔ اماں کی راتوں کی نیندیں حرام ہوجاتیں۔ صدقے دیے جاتے، خیرات دی جاتی، نظریں اتاری جاتیں اور صاعقہ اور تزین منہ پھاڑے دیکھتی رہ جاتیں۔
کیا یہ اُن کی پوتیاں نہیں ہیں؟ ایک دوسرے سے سوال کر کے خاموش ہوجاتیں کیوں کہ اماں کے سامنے کسی کو بولنے کی اجازت کب تھی۔ اور پھر جب صاعقہ کو تیسری بیٹی ہوئی تو اس سے پہلے ہی حمیرا کو تیسرا بیٹا بھی ہو چکا تھا۔ اماں کی دعائیں تو کانوں سے ہٹ کر ہی نہیں دے رہی تھیں۔
''ہائے میرا بچہ جیتا رہ ایک تو ہے جو اپنے باپ کی نسل کو آگے بڑھا رہا ہے۔ جگ جگ جیے۔'' انھوں نے عزیز کو سینے سے لگا کر جذبات سے چور لہجے میں کہا اور صاعقہ اور تزین کے ساتھ ساتھ عظیم اور عذیر کو بھی یہ بات اچھی نہیں لگی۔
☆☆☆
دن گزرتے رہے اماں کی دو نظری اسی طرح تھی۔ صاعقہ کو چار بیٹیاں ہوگئیں جبکہ تزین کو دو بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا بھی ہوگیا۔ لیکن اماں کی محبت صرف ان تین بیٹوں اشعر، اظفر اور منظر کے لیے وقف ہو چکی تھیں۔ وہ بچوں کو چھپا چھپا کر چیزیں کھلاتیں۔ صاعقہ کی چاروں بیٹیاں اور تزین کے تینوں بچے حیرت سے اپنی دادی کو دیکھتے کبھی کبھار تو بچے کوئی ایسا سوال کرتے کہ اماں لاجواب ہوجاتیں اور صاعقہ اور تزین بچوں کو ڈانٹ کر چپ کرا دیتیں۔
دن مہینوں کو سالوں میں بدلتے چلے گئے اور ان سالوں میں عزیز میاں کے چار شیر بیٹے ہوگئے۔ عظیم کی چار بیٹیاں اور عذیر کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوگئے۔ تینوں بھائیوں کی تعلیم کوئی بہت زیادہ نہ تھی۔ اس لیے نوکریاں بھی اعلیٰ درجے کی نہیں تھیں۔ بچے بڑے ہونے لگے تو اماں کو فکر ہوئی تو عزیز کے بیٹوں کی کہ لڑکے لڑکے ہیں اچھا پڑھ لکھ لیں گے تو آگے کے لیے بہتری ہوگی۔ عزیز کی اتنی آمدنی نہ تھی کہ بچوں کو اچھا پڑھا سکے اور خواب تو دونوں میاں بیوی نے بیٹوں کے حوالے سے بے تحاشا دیکھ رکھے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے بیٹوں پر بہت زعم تھا۔ انھیں بیٹوں کے دُکھ اور مسائل سے کوئی سروکار تھا نہ دل چسپی انھیں تو بس یہ غرور تھا کہ میرے چار چار بیٹے ہیں۔ تب اماں نے اپنے رشتے داروں میں جو مخیر لوگ تھے چپکے چپکے ان سے عزیز کے بیٹوں کی پڑھائی کے لئے خاموشی سے پیسے اکٹھے کرنے شروع کیے۔ ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگیں اور ساتھ ساتھ عزیز نے بھی لوگوں سے بیٹوں کے حوالے سے امداد لینی شروع کر دی۔ جبکہ عظیم اور عذیر اپنے بچوں کو پڑھا بھی رہے تھے وہ بچے اپنے باپوں کی آمدنیوں سے خوش اور مطمئن تھے۔ ان لوگوں کو خوب سے خوب تر کی خواہش نہیں تھی۔ حالانکہ عذیر کا ایک ہی بیٹا تھا مگر کبھی بھی عذیر یا تزین نے بیٹے کے حوالے سے کوئی بڑی بات نہ کی تھی۔ وہ لوگ شکر ادا کرتے کہ اللہ پاک نے ایک ہی سہی بیٹا تو دیا ہے۔ عائش بھی سمجھدار اور اچھا بچہ تھا۔ آخرکار اماں کی دعائیں بھاگ دوڑ کام آئی اور اماں کی میکے کی رشتہ دار خاتون نے جو مالی لحاظ سے بہت مستحکم تھیں۔ ان کے شوہر بزنس مین تھے۔ انھوں نے عزیز کے چاروں بیٹوں کی

پڑھائی کی ذمہ داری اپنے ذمے لے لی اور عذیر کے بچے اشعر، اظفر اور فخر کی پڑھائی کی ذمہ داری کی طرف سے عزیز اور حمیرا زیادہ اماں مطمئن ہوگئی تھیں۔ بچے پڑھائی میں کچھ خاص اچھے نہ تھے۔ مگر پرائیویٹ پڑھائی کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ عزیز کی بھاگ دوڑ اور تگ ودو بھی چل رہی تھی۔ جس سے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی اچھی جگہ نوکریوں کی فکر بھی شامل ہوچکی تھی۔

☆☆☆

اشعر اور اظفر نے اپنا ایم بی اے مکمل کرلیا تو ان لوگوں نے سعودی عرب جانے کی کوششیں شروع کردیں۔ عزیز میاں اور حمیرا تو شروع سے ہی اس دن کے انتظار میں تھے۔ ان لوگوں نے بیٹوں کے حوالے سے یہی خواب دیکھ رکھا تھا کہ کسی طرح ان کے بیٹے باہر سیٹل ہوجائیں۔ عزیز میاں نے سر پیر کی بازی لگادی۔ جو جہاں سے بھی باہر جانے کا ذرا سا بھی اشارہ کرتا عزیز میاں اور حمیرا ان کے آگے پیچھے گھومتے رہتے اور اس وقت عزیز میاں کو یہ بھی احساس نہ ہوتا کہ سامنے والا بڑا ہے یا چھوٹا وہ چھوٹے کے لیے بھی اُٹھ کر اس کو اپنی جگہ پر بٹھا دیتے۔ اس روز ان لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اشعر اور اظفر سعودی عرب چلے گئے۔ اماں اپنے لاڈلے پوتوں کی دوری کے خیال سے جتنی آزردہ تھیں اس سے زیادہ اپنے چہیتے بیٹے اور بہو کی اچھی اور بہترین زندگی کا سوچ کر خوش بھی تھیں۔ اشعر اور اظفر سعودیہ چلے گئے۔ اُدھر عظیم اور عذیر کی بیٹیاں اور بیٹا عائش پڑھائی سے فارغ ہوکر عذیر کے چھوٹے سے بزنس میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ایک سال بعد اشعر تو ملنے آ گیا لیکن اظفر نے اس سال آنے سے منع کردیا تھا۔ عذیر اور حمیرا نے اس کے لیے لڑکی دیکھ رکھی تھی اور شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ اشعر آیا تو خوب دھام سے اس کی شادی کردی گئی۔

اشعر کی بیوی سائرہ اچھی لڑکی تھی۔ اشعر شادی کے دس دن بعد واپس چلا گیا۔ اگلے سال اظفر کے آنے کا پروگرام تھا۔ تب اس کی شادی کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ادھر عذیر کی دوسری بیٹی کی بھی شادی ہوگئی اور وہ بیاہ کر سسرال چلی گئی اور کچھ دن بعد شوہر کے ساتھ امریکہ شفٹ ہوگئی۔ اماں کا انتقال ہوگیا اور ساتھ ہی عزیز اور حمیرا نے یہ گھر چھوڑ کر پوش علاقے میں گھر لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اب تو ان کے اسٹائل ہی بدل گئے تھے۔ کیونکہ منظر اور فخر نے بھی یہیں جاب کرلی تھی پھر وہ لوگ دوسرے گھر میں شفٹ ہوگئے۔

اگلے سال اظفر شادی کے لیے آیا تو ساتھ اشعر بھی آیا کیونکہ اسے سائرہ کو اپنے ساتھ لے کر جانا تھا۔ اظفر کا پہلے سے ہی پروگرام تھا کہ شادی کے بعد جاتے جاتے اپنی بیوی ریشم کو بھی ساتھ لے جائے گا۔

عرصے تک گھر میں خوب شور ہنگامہ اور شادی کی مصروفیت رہی پھر مہینہ بعد ہی اظفر ریشم اور سائرہ گھر کو ویران کرکے چلے گئے۔

عزیز اور حمیرا کو گھر کاٹنے کو دوڑتا۔ پیسے کی کمی نہ تھی۔ گھر میں نوکر بھی تھے مگر تنہائی تھی منظر اور فخر اپنی جاب پر ہوتے یا دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور مصروفیت ہوتی۔

☆☆☆

اشعر کا بیٹا ہوا تھا۔ اس نے فون کرکے بتایا تو حمیرا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے کتنی خواہش تھی پوتا پوتی کی اور آج جب وہ دادی بنی تو بچے پاس نہ تھے۔ ان لوگوں نے سوچا کہ منظر کی شادی کردیں اور پھر منظر کے لیے لڑکی دیکھ کر اس کی شادی کردی گئی۔ ثوبیہ امیر فیملی سے تھی اور اکلوتی تھی۔ منظر کی شادی کے بعد گھر میں کچھ چہل پہل ہوئی۔ اس عرصے میں اشعر کے ہاں بیٹی اور اظفر کے ہاں جڑواں بیٹے بھی ہوگئے۔ تصویریں دیکھ کر حمیرا بہت روئی دل تڑپ رہا تھا کہ اپنی بانہوں میں ان ننھے منوں کو بھی لیں لیکن وہ کوسوں دور تھے۔ کتنی بار ان لوگوں نے آنے کے لیے کہا لیکن ہر بار اظفر اور اشعر نے صاف کہا کہ بار بار آنا آسان نہیں۔ اب اخراجات بڑھ گئے ہیں اور آپ لوگوں کو بھی تو ٹھاٹ سے زندگی گزارنے کی عادت ہوگئی ہے۔ اس لیے ہمیں زیادہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ حمیرا اور عزیز آنکھیں صاف کرکے خاموش ہوجاتے۔ ثوبیہ کی والدہ کی طبیعت خراب ہوئی

ان کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرنا پڑا تو اس کے ابو گھر میں اکیلے ہوگئے۔ ہاسپٹل میں والدہ کے ساتھ ان کی بہن رہتی تھیں۔ اس روز منظر آفس سے آیا تو اپنے کمرے میں جا کر بیگ میں کچھ سامان رکھنے لگا۔ حمیرا بیگم بھی پہنچ گئیں۔ پوچھنے پر منظر نے کہا کہ ثوبیہ کچھ عرصہ اپنے میکے میں رہے گی۔ کیوں کہ اس کی اماں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ اچھا! حمیرا نے دھیمے سے کہا اور یہ کچھ عرصہ دو ماہ پر محیط ہوگیا۔ حمیرا بیگم جب بولتیں کہ اسے لے آؤ منظر ٹال جاتا اور پھر ایک روز منظر نے دھماکہ کر دیا کہ ثوبیہ کے پاپا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ اس لیے وہ اپنا سارا کاروبار میرے حوالے کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے مجھے ان کے یہاں شفٹ ہونا پڑے گا۔ ہائیں! عزیز نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہم لوگ یہاں پر اکیلے......"

اکیلے کہاں ابا......؟ آپ کے ساتھ فخر ہے ناں۔ اس کی شادی کردیں آپ لوگوں کا دل بھی لگ جائے گا ویسے بھی کچھ دنوں بعد اشعر بھائی اور اظفر بھائی بھی آنے والے ہیں بچوں کے ساتھ آپ لوگ مصروف ہو جائیں گے۔ منظر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مگر وہاں ثوبیہ کے پاپا کا تو کوئی اور ہے بھی نہیں سوائے ہمارے۔ اس لیے ان لوگوں کو ہماری زیادہ ضرورت ہے۔" ٹکا سا جواب دے کر منظر سامان سمیٹنے لگا اور عزیز کے ساتھ ساتھ حمیرا نم آنکھوں سے اپنے پیارے بیٹے کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

اشعر اور اظفر آگئے۔ ان کے بچوں کو سینے سے لگا کر حمیرا دیر تلک روتی رہیں۔ کب سے تڑپ رہی تھیں۔ اپنے پیاروں کے بچوں کو سینے سے لگانے کے لیے ساتھ ہی فخر نے اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکی عیمہ کے بارے میں اماں کو بتایا کہ آپ لوگوں کو وہاں میرا رشتہ لے کر جانا ہے اور حمیرا سر جھکا کر رہ گئیں۔

عیمہ خاصی ماڈرن اور امیر فیملی سے تھی۔ اس کے بے ہودہ لباس اور باتوں کو سن کر حمیرا بیگم کو وہ ایک آنکھ نہ بھائی۔ مگر بیٹے کی خواہش اور پسند زیادہ مقدم تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا جو ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ بگاڑ پیدا کر کے اس سے بھی دور ہونا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے فخر کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہوگئیں۔ اور چوتھی اور آخری لاڈلی بہو عیمہ بھی گھر آگئی۔ اشعر اور اظفر فیملیوں سمیت واپس چلے گئے تھے۔

عیمہ تیز طرار، اور کسی حد تک بدتمیز لڑکی تھی۔ اسے ساس سسر سے کوئی لگاؤ تھا نہ دل چسپی اسے تو صرف فخر سے غرض تھی۔ جس کو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ وہ صبح تیار ہو کر فخر کے ساتھ آفس چلی جاتی۔ پیچھے سارا دن بھائیں بھائیں کرتے گھر میں کھانستا ہوا عزیز اور حمیرا نوکروں کے رحم وکرم پر رہ جاتے۔ آفس سے آکر بھی فخر اور عیمہ کبھی ڈنر پر تو کبھی پارٹیز میں چلے جاتے۔ دونوں میاں بیوی تنہا رہ جاتے۔ کچھ دن تو حمیرا نے برداشت کیا اور پھر ایک دن فخر سے کہہ دیا کہ بیٹا ہمیں کون سا پیسوں کی ضرورت ہے۔ عیمہ سے کہو نوکری چھوڑ کر گھر میں رہے۔ ذرا گھر میں رونق ہو جائے گی۔

اماں یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ عیمہ کوئی جاہل لڑکی نہیں ہے۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ بہترین جاب کرتی ہے۔ وہ گھر میں رہنے یا آپ لوگوں کو کمپنی دینے کے لیے نہیں آئی۔ ہم دونوں نے مل کر اپنے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لیے آپ لوگ اگر اکیلا پن محسوس کرتے ہیں تو اشعر بھائی یا اظفر بھائی کے پاس چلے جائیں۔

حمیرا اپنا منہ لے کر رہ گئیں۔ اب دونوں کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ اچھے اچھے ڈاکٹرز کو دکھاتے کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ لیکن تنہائی سب سے بڑی بیماری تھی۔ جو گھن کی طرح انھیں کھائے چلی جا رہی تھی۔ عزیز کو ان تمام تر مراعات کے باوجود ٹی بی ہوگیا تھا۔ حمیرا بی پی اور شوگر کی مریضہ تھیں۔

اب عیمہ امید سے ہوئی تو دونوں بہت خوش ہوئے کہ گھر میں بچے کی آمد متوقع تھی۔

اور پھر اللہ اللہ کر کے دن پورے ہوئے اور عیمہ نے پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ فخر کے ساتھ ساتھ عزیز اور حمیرا بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ صدقے خیرات دیے اور مٹھائی بھی تقسیم کی۔ عیمہ گھر آگئی۔ حمیرا عیمہ کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ بچے کو سنبھالتیں، مالش کرتیں لیکن عیمہ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ خاص طور پر

جب کھانستے کھانستے عزیز بچے کے قریب آتا تو اس سے برداشت نہ ہوتا۔ اور پھر کچھ دن بعد ہی فخر نے بھی اپنا فرض پورا کر دیا۔

"ابا پلیز آپ منے کو پیار مت کیا کریں۔"

ہائیں کیا ہو گیا......؟" عزیز نے جھٹکے سے سر اٹھا کر حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"جی آپ کو خود احساس ہونا چاہیے تھا کہ آپ کو موذی مرض ہے اور منا ابھی کتنا چھوٹا اور نازک ہے خدانخواستہ جراثیم لگ جائیں تو......اور اماں آپ...... ابھی ابا کو منع نہیں کرتیں مجھے معلوم ہی کہ ساتھ رہیں گے تو آپ لوگوں سے برداشت ہوگا نہیں اور آپ لوگ لازمی منے کو پیار کریں گے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگوں کو ایدھی سینٹر میں شفٹ کروا دیں۔ میں ملنے آتا رہوں گا کیوں کہ خود پر تو انسان برداشت کر لیتا ہے لیکن......اولاد کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ ویسے تو آپ لوگوں کو اوپر کے پورشن میں بھی شفٹ کر سکتا ہوں۔ مگر آپ لوگ پھر وہی تنہائی کا رونا روئیں گے اس لیے وہاں جانے سے آپ لوگوں کو۔ تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ بہت سارے لوگ آپ لوگوں کے ساتھ ہوں گے اور آپ لوگوں کا ٹائم بھی پاس ہو جائے گا۔

ہائیں یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ ہمارا اپنا گھر ہے۔ چار، چار بیٹے ہیں اور ہم...... ہم...... خیراتی ادارے میں جائیں؟"

عزیز جو خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے تڑپ کر سوال کیا۔

سچ کہہ رہے ہو تم۔ اولاد کے لیے رسک نہیں لے سکتے۔ ہم نے بھی تم لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا۔ اپنی عزت مٹی میں ملا کر تمہارے بہتر مستقبل کے لیے لوگوں سے امداد لی تمہارے بہتر کیریئر کے لیے کہاں کہاں نہ بھاگ دوڑ کی۔ اور آج......تم بھی۔"

"بس ابا......آپ لوگوں نے بھی اولاد کے لیے کیا اور ہم بھی اولاد کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ اب تو وہ زمانہ بھی نہیں رہا۔ اب ضرورتیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ اگر اشعر بھائی، اظفر بھائی اور منظر بھائی بھی اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے دور ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ اس لیے آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اور اصل بات یہ ہے کہ عیمہ نہیں چاہتی کہ دو بیمار لوگوں کے ساتھ وہ اپنے بچے کی پرورش کرے اس لیے آپ لوگ تیاری کر لیں۔ میں نے وہاں جا کر بات کر لی ہے۔ میں ملنے آتا رہوں گا آپ لوگوں سے۔" فخر نے حتمی فیصلہ سنایا۔ حمیرا تو ئن تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے اور کیا ہو رہا ہے؟ فخر کمرے سے جا چکا تھا دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رو رہے تھے۔ جس اولاد کی خاطر دونوں نے خاندان سے کٹ کر غرور اور فخر کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ اپنے بھائیوں کے سامنے خود کو ہمیشہ اعلیٰ سمجھا۔ امارت اور بیٹوں کے زعم میں زندگی گزاری۔ ایک ایک کر کے چاروں بیٹوں نے کس طرح ان دونوں کو تنہا کر دیا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت ہو گیا تھا۔ دونوں یونہی گم سم بیٹھے تھے۔ تب ہی کمرے کی لائٹ جلی اور دونوں خیالات سے چونکے۔ سامنے عظیم، عذیر اور عائش کھڑے تھے۔

"اٹھو عزیز ہم لوگ تمہیں لینے آئے ہیں۔" عظیم اور عذیر نے آگے بڑھ کر عزیز کو کاندھوں سے تھاما اور عظیم نے کہا۔ عزیز نے تڑپ کر نگاہ اٹھائی۔

"بھائی......" وہ اٹھ کر عظیم سے لپٹ کر رو پڑا۔

"بس کریں عزیز بھائی ابھی آپ کے بھائیوں کا گھر آپ کے لیے کھلا ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ لوگ کسی خیراتی ادارے میں نہیں جا سکتے۔" عذیر اور پھر عائش نے آگے بڑھ کر عزیز کو مخاطب کیا۔ عزیز بے حد شرمندہ تھا۔ مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ جن بیٹوں کے زعم میں اس نے بھائیوں، بھاوجوں اور ان کے بچوں کو حقیر جانا تھا آج ان لوگوں نے ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا سب کو اپنی اپنی فیملیاں اور مستقبل عزیز تھے۔ سچ ہے اولاد پیدا کرنا آسان ہے مگر ان کی تربیت کرنا بہت مشکل ہے۔ جو سوچ اور ذہنیت عزیز کی تھی وہی اس کے بیٹوں میں منتقل ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی عزیز اور حمیرا عائش کی لمبی سی گاڑی میں اس گھر کی جانب جا رہے تھے جسے وہ چھوٹا، پرانا اور قدیم کہہ کر کب کا چھوڑ چکے تھے۔

☆☆☆

دوسری مرد کہانی

بابُل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ تحریر، جو بیٹی کو زحمت تصور کرتے ہیں

"میں نے جب کہہ دیا تھا کہ گھر آنے پر ان میں سے کوئی میرے سامنے نہ آیا کرے تو پھر کیوں انہیں میرے آفس سے واپس آنے کا ٹائم نہیں معلوم ہے۔" عمران گھر میں داخل ہوتے ہی چلایا تھا۔

"آپ کو ان معصوموں نے کیا کہہ دیا ہے جو آپ ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر ہی پڑ گئے ہیں۔" رخسانہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔

"بس میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ میرا بس نہیں چلتا کہ میں ان کا گلا دبا دوں۔" عمران نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹیاں تو خدا کی رحمت ہوتی ہیں اور نبیﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے دو بیٹیوں کی پرورش اچھے طریقے سے کی، وہ جنت میں میرے ساتھ ایسے ہوگا جیسے شہادت اور درمیان والی انگلی۔" رخسانہ سمجھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے دو بیٹیوں کی پرورش میں کر لیتا ہوں، باقیوں کو تم اپنے میکے بھجوا دو۔ آخر ان کو بھی جنت میں جانا چاہیے۔" عمران طنزیہ لہجے میں بولا تھا۔

"ان کو سمجھانا تو بھینس کے آگے بین بجانے جیسا ہے۔" رخسانہ نے دل میں سوچا اور کمرے سے باہر جانے لگی تھی کہ عمران کی آواز پر رک گئی۔

"سنو میرے اکلوتے چشم و چراغ کو میرے پاس بھیج دو۔ جب تک اس کو دیکھ نہ لوں دل کو سکون ہی نہیں ملتا ہے۔ تمہاری سوچ، تمہارا کردار اور تمہاری کوکھ ہی منحوس ہے۔ ورنہ آج پانچ بیٹیوں کی جگہ میرے پانچ بیٹے ہوتے اور میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔" یہ باتیں سن کر رخسانہ کا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا، اور کچھ کہنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وقتاً فوقتاً طعنے دینا اور طنز کے تیر چلانا اس کی عادت میں شامل ہو چکا تھا۔

بیوی اور بیٹیوں کی تو اس کی نظر میں کوئی اوقات ہی نہیں تھی۔ مگر شادی کے شروع میں سب کچھ بہت حسین تھا۔ میرا ہم سفر، میرے دُکھ سکھ کا ساتھی یوں بدل جائے گا۔ میری ذرا سی تکلیف پر بے تاب ہونے والا یوں پہلی بیٹی کی پیدائش پہ پتھر دل ہو جائے گا۔ اب میں اور میری بیٹیاں جئیں یا مریں اس سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس نے تو جیسے اپنے کانوں اور آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔

میری بیٹیاں باپ کے ہوتے ہوئے بھی بنا باپ کے پل رہی تھی۔ باپ کی شفقت اور محبت سے ناآشنا میری بیٹیاں باپ کو جلاد تصور کرنے لگی تھیں۔ باپ کے گھر میں داخل ہوتے ہی سب دبک کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی تھیں۔ جیسے ان کا اپنا باپ نہیں بلکہ کوئی قصائی چھری لے کر بکریوں کے ریوڑ کے درمیان آ گیا ہو۔ بچیوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

''رخسانہ کہاں رہ گئی ہو۔ لے بھی آؤ میرے پیارے بیٹے حارث کو۔ اس کو آج میں نے اسکول میں داخل کروانا ہے۔'' عمران نے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''حارث اسکول نہیں جانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جاؤں گا تو جمیلہ کے ساتھ جاؤں گا ورنہ اسکول نہیں جاؤں گا۔'' رخسانہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے پریشانی کے عالم میں کہا تھا۔

''چلو آجاؤ میرے بیٹے۔'' عمران نے حارث سے کہا۔

''نہیں ابو میں تو جمیلہ کے ساتھ ہی جاؤں گا، ورنہ نہیں جاؤں گا۔'' حارث اپنی توتلی زبان میں بولا تھا۔

''اچھا لے آؤ جمیلہ کو۔'' عمران اپنے تین سالہ بیٹے سے شکست کھاتے ہوئے مایوس لہجے میں بولا تھا۔

☆☆☆

''جمیلہ کیا تم نے اپنے بھائی کو کام کر کے دیا ہے۔'' کلاس ٹیچر نے جمیلہ کو کھڑا کر کے پوچھا تھا۔

''مس ورنہ یہ میری شکایت ابو کو لگا دے گا اس لیے میں اس کو بھی کام کر کے دے دیتی ہوں۔''

''تم لوگ کتنے بہن بھائی ہو اور تمہارے ابو تمہیں کیوں ڈانٹیں گے۔'' ٹیچر نے جمیلہ سے پیار سے پوچھا تھا۔

''مس ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ میرے ابو صرف بھائی سے پیار کرتے ہیں۔ اگر بھائی روئے گا تو ابو ہمیں ماریں گے۔'' جمیلہ نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا تھا۔

''تمہاری اور بہنیں بھی کیا اس اسکول میں پڑھتی ہیں۔'' ٹیچر نے دوبارہ جمیلہ سے پوچھا تھا۔

''میری کوئی بہن اسکول میں نہیں پڑھتی ہے۔'' جمیلہ نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔

''اچھا تو تم نے ضد کر کے اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا کیا؟'' ٹیچر تو تم نے ضد کر کے اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا کیا؟'' ٹیچر نے پیار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں مس! ابو نے ہماری کبھی کوئی فرمائش پوری نہیں کی ہے۔ وہ ہم بہنوں کا اپنے سامنے آنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہ تو ہم دونوں بہن بھائی جڑواں ہیں۔ ایک ساتھ کھیلتے، کھاتے اور پیتے ہیں۔ بھائی میرے بغیر اسکول نہیں آرہا تھا۔ اس لیے مجبوراً ابو نے مجھے بھی اس



کے ساتھ داخل کروا دیا تھا۔ اور ساتھ میں سختی سے تاکید کی تھی کہ بھائی کو کوئی تکلیف نہ ہو پائے۔'' جمیلہ نے روہانسی صورت بناتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے بھئی تم نے اتنی سی عمر میں اتنی بڑی باتیں کہاں سے سیکھی ہیں۔'' ٹیچر نے پیار سے پوچھا تھا۔

☆☆☆

''حارث میرے بال چھوڑ دو۔'' جمیلہ چلائی تھی۔

''نہیں۔ مس! میں حارث ہوم ورک کر کے دیتی ہوں۔'' حارث نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا تھا۔

''تو کیا جھوٹ بولا تھا۔ ابھی تو میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس بار ٹیسٹ پیپر بھی میں نے ہی تمھیں کر کے دیا تھا۔'' جمیلہ اپنے بالوں کو حارث کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا یہ بات ہے تو تم گھر چلو ذرا ابو کو تمہاری شکایت نہ لگائی تو پھر بولنا۔'' حارث نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''وعدہ کرتی ہوں تمہارا سارا ہوم ورک میں کروں گی اور ٹیچر کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' جمیلہ نے منت کرتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں اب صرف اس سے کام نہیں چلے گا اگلے مہینے جو ہمارے پیپر ہوں گے وہ بھی تم ہی کرو گی اور راستے میں انکل فراز کے صحن سے امرود بھی توڑ کے دو گی۔ ورنہ میں ابو سے تمھیں ڈانٹ پلاؤں گا۔'' حارث بولا تھا۔

☆☆☆

''ارے حارث پھول کیوں توڑ رہے ہو؟ مالی تمھیں دیکھ نہ لے۔'' جمیلہ بولی تھی۔

''ڈرپوک کچھ نہیں ہوتا ہے۔'' حارث بولا تھا۔

''اب پکڑا گیا نا اسی لیے میں کہوں پھول روز کیوں کم ہو جاتے ہیں۔'' مالی نے حارث کو ہاتھ سے پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

''انکل پلیز میرے بھائی کو چھوڑ دو۔ آئندہ یہ ایسا نہیں کرے گا۔'' جمیلہ نے التجا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسے ہی چھوڑ دوں۔ اب میں تمہارے والد کو شکایت لگاؤں گا کہ کیا کرتا پھرتا ہے اس کا بیٹا۔ بڑا غرور تھا نہ اسے اپنے بیٹے پر۔'' مالی نے انتقامیہ لہجے میں کہا تھا۔

''عمران صاحب باہر آیئے۔'' مالی گھر کے باہر سے چیخا تھا۔

''کیوں چلا رہے ہو۔'' عمران دروازہ کھولتے ہوئے بولا تھا۔

''یہ لیجیے سنبھالیے اپنے بیٹے کو۔ باغ سے پھول توڑتے ہوئے پکڑا ہے اسے میں نے۔'' مالی فخریہ لہجے میں بولا تھا۔

''تم دونوں اندر چلو۔ میں آپ سے بہت معذرت چاہتا ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔'' عمران نے بات کو رفع دفع کرتے ہوئے کہا تھا۔

''جمیلہ کیا تم اپنے بھائی کو پھول توڑنے سے منع نہیں کر سکتی تھیں۔'' عمران نے اپنی بھڑاس جمیلہ پر نکالتے ہوئے کہا تھا۔

''ابو میں نے اس کو منع کیا تھا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔'' جمیلہ نے ڈرتے ڈرتے ہوئے کہا تھا۔

''ابو یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اسی نے مجھے پھول توڑنے کو کہا تھا۔'' حارث نے اپنی غلطی جمیلہ کے سر پر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''ابو یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' جمیلہ نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا۔

''بس بہت ہو گیا آئندہ تم اس کے ساتھ کھیلنے نہیں جاؤ گی۔ اب جاؤ میرے سامنے سے۔'' عمران چیختے ہوئے بولا تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا تم فون کیوں نہیں رکھ رہی ہو۔ سب خیریت تو ہے ناں!'' فیضان کے اچانک مخاطب کرنے پر میں یوں چونکی جیسے کوئی مجھے ماضی کے پنجروں سے کھول لایا ہو۔ میں نے فیضان کی طرف جھجکتے ہوئے دیکھا اور کہا تھا۔

''ابو کا فون تھا بیٹی کی پیدائش کا سن کر کہہ رہے تھے اس کا گلا دبا دو۔''

''یہ ان کے گھر کی بیٹی نہیں ہے جو گلا دبا دوں۔ یہ تو میرے آنگن کا پھول ہے جس نے بہار بن کر آتے ہی میرے بنجر اور بیابان آنگن کو خوشیوں سے بھر دیا ہے۔ میری بیٹی میرے گھر کی رونق ہے اور ویسے بھی بیٹا ہو یا بیٹی دونوں خدا کی رحمت ہیں۔ بیٹیوں کی قدر ان سے پوچھو جن کی جھولیاں ابھی تک خالی ہے۔'' فیضان نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ خفا تو نہیں ہیں کہ میں نے ایک بیٹی کو جنم دیا ہے۔'' میں نے بھیگتی آنکھوں سے پوچھا تھا۔

''جمیلہ! یہ تم سے کس نے کہہ دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ خدا نے تمھیں پہلی بیٹی سے نوازا ہے۔ میں تمہارے والد کی طرح بیٹیوں کا دشمن نہیں ہوں۔'' فیضان نے پیار سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے فیضان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے میری بیٹی کو نہایت ہی شفیق اور محبت کرنے والے بابل سے نوازا ہے۔

☆☆☆

تیسری مرد کہانی

اپنا خون



شعبان کھوسہ

اُس شخص کا قصہ، جسے اپنے خون پر بھروسہ نہ تھا

تاجا اس وقت بہت ہی غصے میں تھا۔ اس کی پیشانی سے ہی نہیں اس کے انگ انگ سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ غصے سے اس کی آنکھیں باہر کو آ رہی تھیں۔ اس کے سامنے سرو جیسے قد، ہرنی جیسی آنکھوں اور ریشم جیسی نازک اس کی بیٹی صغریٰ نہیں کوئی کالی سیاہ، ناگن پھن پھیلائے کھڑی تھی۔ تاجے نے صغریٰ کے منہ پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا اور بولا۔

"صغریٰ! اس نے سوہنی تجھے نہیں کہا۔ اس نے



مجھے بے غیرت کہا ہے۔ اس نے میلی آنکھوں سے تجھے نہیں دیکھا۔ کڑوی نگاہوں سے مجھے گھورا ہے۔ صغریٰ! اس نے تجھے نہیں اپنی موت کو آواز دی ہے۔"

"لیکن میری بھی تو سنو۔ خدا کے لیے اتنے غصے میں مت آؤ۔" تاجے کے قریب کھڑی اس کی بیوی پھلاں نے کہا۔ "ماتھے سے پسینہ تو پونچھ لو۔"

"اب تو تم خون ہی پونچھو گی۔" تاجا ساون کے بادل کی طرح گرجا۔

"خدا نہ کرے میں تمہارا خون پونچھوں۔" تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو نا۔

"میرا اندر الاؤ پک رہا ہے اور تو کہتی ہے میں ٹھنڈے دل سے سوچوں۔" تاجا پھر گرجا۔

"ہائے اللہ۔ اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں خود جا کر اسے دلاسہ دے آتی ہوں۔" پھلاں بولی۔

"دلاسہ...... دلاسے تو وہ دیتے ہیں۔ پنچائتیں تو وہ بٹھاتے ہیں۔ جو ہاتھ سے کچھ نہ کرسکیں آج میں اس کو اس پٹڑی پر چڑھادوں گا۔ جہاں سے وہ اُتر گیا ہے تو ایک بار میری شام چڑھی ڈانگ تو پکڑا۔ سوہنہ رب دی۔ اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے پتہ لگ جائے گا۔ یہ تاجے کی بیٹی ہے کسی چوراہے کی بیری نہیں۔"

"اف میرے اللہ۔ تم تو میری سنتے ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں۔ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ اتنا شور وغل اچھا نہیں۔ بیٹی کی بات ہے۔ چار لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔"

"تو چاند کو سنانے کا کہہ رہی ہے۔ میں آج سب کو دکھادوں گا پھلاں بیگم۔ یہ ہیر کا گاؤں نہیں یہ سوہنی کی بستی ہے نہ صاحباں کی بھوک...... یہاں کوئی رانجھا...... کوئی مہینوال اور کوئی مرزا نہیں آسکتا۔"

"کچھ بھی ہو۔ لیکن میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔" پھلاں بولی۔

"میں نے کہہ دیا ناں کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔" تاجا دھاڑا۔

"نہیں ہٹوں گی۔" پھلاں نے تاجے کے کُرتے کا پلو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ لیکن اس وقت تاجے کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اور غصے سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے پوری قوت سے پھلاں کو دھکا دے کر پرے کردیا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔

پھلاں کا سر دروازے سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ نکلا وہ پوری قوت سے چیخنے لگی۔ اس کی چیخ وپکار سن کر پڑوس کی عورتیں آگئیں اور پوچھنے لگیں۔

"اری پھلاں۔ تمہارے ماتھے سے تو خون کا دریا بہہ رہا ہے۔"

"ہائے ری...... یہ دریا کیا ہے۔ کوئی وہاں جا کر دیکھے جہاں آج خون کی ہولی کھیلی جائے گی۔ جہاں آج لاشے تڑپیں گے۔" پھلاں لہک لہک کر بین ڈال رہی تھی۔

"اری بہن۔ بات کیا ہوئی۔ کچھ تو بتا۔" ایک ہمسائی نے پوچھا۔

پھلاں بین ڈالتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "اری کسی بدبخت نے صغریٰ سے چھیڑ خانی کی ہے۔ ہائے آج پہلی بار گھر سے اکیلی نکلی تھی۔ وہ بھی سدرہ کے پاس کڑھائی کا نمونہ لینے گئی تھی۔ اری بہن میری قسمت پھوٹی تھی۔ میری تقدیر جلنی تھی۔ میرے نصیب بُرے تھے کہ میں نے اسے بھیج دیا۔ خود کیوں نہ چلی گئی۔ ہائے اب کیا ہوگا؟ صغریٰ کا باپ پہلے ہی بڑا غصیلہ ہے۔ وہ جان دے کر بھی شکست تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ تو کسی بہو بیٹی کے متعلق ایسی ویسی بات سنتا ہے تو جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ وہ تو کہتا ہی اس جینے سے تو مرنا بہتر ہے۔ ہائے اللہ۔ اب کیا ہوگا؟"

☆☆☆

کچھ ہی دیر بعد تاجے کو سر جھکائے دبے پاؤں اندر آتے دیکھ کر سب عورتیں پھلاں کے اردگرد سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہوگئیں۔ پھلاں دوڑ کر تاجے کے پاؤں میں گر پڑی اور پوچھا۔

"کیا ہوا۔ کون تھا وہ کم بخت۔"

"ہش" تاجے نے انگلی پھلاں کے ہونٹوں پر رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا۔ جیسے کسی بہت بڑے راز

کے فاش ہونے کا خطرہ ہو۔ اس نے پھلاں کو بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

''کیا بات ہے؟'' پھلاں حیران ہوگئی۔

تاجے نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ''پہلے ان عورتوں کو تو باہر نکالو۔ کئی باتیں راز کی ہوتی ہیں۔''

یہ سن کر پھلاں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''جاؤ بہنوں اپنے اپنے گھر۔ یہاں کوئی کھیل تماشا تو نہیں ہو رہا۔ جو سب نے یہاں بھیڑ لگا رکھی ہے۔'' سب عورتیں شرمندہ ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔

عورتوں کے چلے جانے کے بعد پھلاں نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ''کون تھا وہ؟ اور کیا تم نے اسے واقعی قتل کر دیا ہے؟''

''چھوڑو ان باتوں کو۔ قتل تو میں نے اسے کر ہی دینا تھا۔ لیکن۔''

''لیکن کیا؟''

''وہ تو لڑکا ہی بہت بھلا مانس ہے۔''

''کون ہے وہ اتنا بھلا مانس جس نے تم جیسی آگ کو پانی کر دیا۔''

''اپنے گاؤں کے نمبردار فضل دین کا بھتیجا، جو شہر سے یہاں مہمان آیا ہوا ہے۔ تُو بھی تو سوچ وہ بڑے لوگ ہم چھوٹوں سے کیسے چھیڑ خانی کر سکتے ہیں۔ ضرور اس حرام زادی کی شرارت ہوگی۔''

''شک تو مجھے بھی ہو رہا تھا۔ یہ اُدھر سے گزری کیوں تھی؟'' پھلاں نے اپنی آنکھیں تاجے کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ یہاں سوچ کے کئی سمندر بپھرے ہوئے تھے اور آنسو دھاروں کی صورت کنارے پر چھلکے پڑتے تھے۔

''چل آگے سے ہٹ اور دروازہ بند کر کے بیٹھ۔ ہر آنے جانے والے کی نظر پڑتی ہے۔''

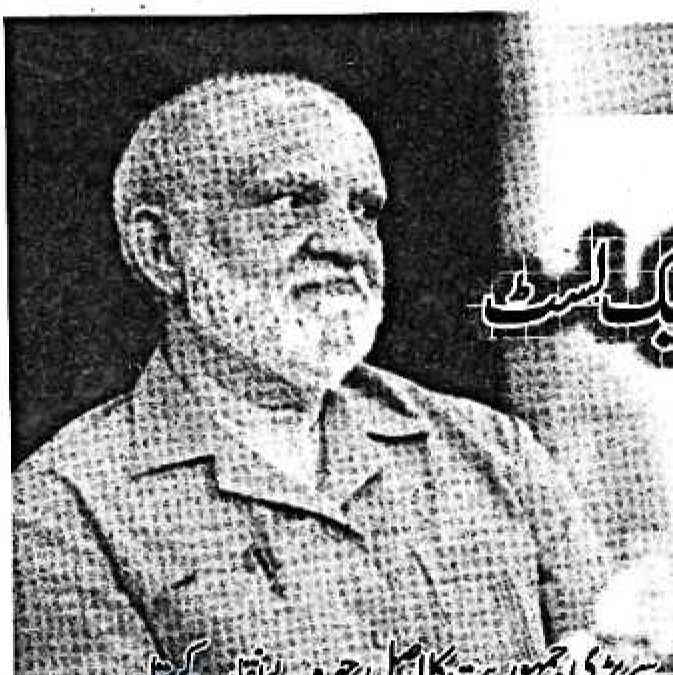
یہ کہہ کرتا جا لڑکھڑاتا ہوا دروازہ بند کرنے چل پڑا اور دروازہ بند کرنے کے ساتھ ہی اس طرح گر پڑا۔ جیسے وہ گوشت پوست کا آدمی نہیں دیمک زدہ لکڑی کا پتلا ہو۔

☆☆☆

میری پکار سنو

اذانِ فجر سے پہلے مجھے بابا جگاتے تھے
دلنشیں انداز میں قرآں پڑھاتے تھے
اسکول کے لیے جب پوائنٹ آتی تھی
ماں چوم کے ماتھا مجھے بس میں بٹھاتی تھی
یہ سوچتی تھی ماں، مجھے فوجی بنانا ہے
دشمن سے لڑنے کے لیے سرحد پہ جانا ہے
اس دن بھی صبح جب ہم اسکول آئے تھے
اپنی ٹیچروں کے واسطے کچھ پھول لائے تھے
کتابیں ہاتھ میں تھیں، شور اٹھا تھا کہ اب بھاگو
قیامت کی گھڑی آئی بچو! تم بھی ذرا جاگو
بھیڑیوں نے ہم پہ اچانک فائر کھولے تھے
دم سادھے ہوئے تھے ان کو کچھ بولے تھے
اف خدایا! ہر طرف یہ خون پھیلا ہے
مکتب ہے کہ مقتل ہے کہ خون پھیلا ہے
خدایا، ان درندوں کا ہم نے کیا بگاڑا ہے
ہمارے علم کا گلشن اس نے کیوں اجاڑا ہے
جی چاہتا ہے ماں، تیری آغوش میں آؤں
بچ کر ان درندوں سے میں چھپ جاؤں
میرے بابا چلے آؤ یہ دیکھو خون بہتا ہے
ارے اتنی اذیت یہاں پر کون سہتا ہے
اسکول میں موجود یہاں جتنے بچے ہیں
ان سب کے بستوں پہ خوں کے دھبے ہیں
قلم روتا ہے اور کاپیاں فریاد کرتی ہیں
کہ مائیں ایسی پیدا کس لیے اولاد کرتی ہیں
میرے بابا نے مجھ کو لحد میں جب اتارا تھا
بے ساختہ مرے بھیا نے پھر مجھ کو پکارا تھا
ماں نہ گھبرا کوکھ سے تیری میں پھر جنم لوں گا
نہ ایسا پھر لگے مقتل، خدا سے میں قسم لوں گا
کہاں ہو حکمرانو تم؟ میرا خوں بہا مانگو
ارے اے منصفو! ان کو اب دار پر ٹانگو
(سانحہ اے پی ایس پشاور کے شہید بچوں کی پکار)
(شاعرہ: صفیہ سلطانہ مغل۔ جیکب آباد)

سفرنامہ



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفرنامۂ بھارت

چوتھا حصہ

دہلی ایئر پورٹ ٹرانزٹ سیل میں کیا گزری؟

ہریانہ اُردو اکیڈمی کی طرف سے دعوت نامہ ہے۔ ۲۲ اپریل ۱۹۹۸ء کو چنڈی گڑھ میں غالب کی دو صد سالہ برسی کی تقریبات کے حوالے سے مشاعرہ ہے۔

چنڈی گڑھ کئی سال پہلے ۱۹۷۲ء میں دیکھا تھا جب شملہ معاہدے کے لیے صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ جارہے تھے۔ جہاز نے چنڈی گڑھ ایئر پورٹ پر اتارا تھا۔ یہاں سے ہم گاڑیوں کے ذریعے شملہ گئے تھے۔ سوچا کہ چنڈی گڑھ دوبارہ دیکھ لیں۔

ہریانہ اُردو اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل کشمیر لال ذاکر کا دعوت نامہ ماہنامہ تخلیق کے مدیر جناب اظہر جاوید کے ذریعے ملا ہے۔ اس سے پہلے قتیل شفائی صاحب مارچ میں انبالہ اور کرنال کے مشاعروں میں چلنے کی دعوت دے چکے ہیں۔ لیکن صحافتی مصروفیات کے باعث جانا نہیں ہوسکا ہے۔

پہلا مرحلہ ہے ویزے کا۔ جو اسلام آباد سے ملتا ہے۔ گزشتہ سال امریکی اطلاعات کے زیر اہتمام ایک ”ٹریولنگ سیمینار“ (سفری مذاکرہ) کے لیے بھارت جانا تھا تو ویزے کے مراحل امریکیوں نے خود طے کر لیے تھے۔ اب تو کوئی ثالث نہیں ہے۔ خود ہی ویزا حاصل کرنا ہے۔ فارم بھر کے پاسپورٹ اپنے ایک دوست کو اسلام آباد بھیج دیا ہے اور بھارتی ہائی کمیشن میں کمال پرویز صاحب سے بات کرلی ہے۔ انھیں یہ بھی بتادیا ہے کہ گزشتہ سال دہلی ایئر پورٹ پر ویزے کے باوجود بھارت میں داخلے میں مشکل آئی تھی اور امیگریشن کے حکام نے کہا تھا کہ مجھے ویزے کے ساتھ ساتھ کسی خصوصی اجازت کی ضرورت ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایسی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ آپ تو ۱۹۷۲ء سے بھارت جارہے ہیں۔ آپ کے لیے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوگا۔

لاہور سے دہلی روانگی ہے۔ پی آئی اے کی پرواز پی کے ۲۷۰ ہماری منتظر ہے۔ اظہر جاوید ہم سفر ہیں۔ میں نے ان کو خبردار کیا ہے کہ دہلی ایئر پورٹ پر گزشتہ سال کی طرح مجھے اس بار بھی روکا جاسکتا ہے۔ آپ ذرا خیال رکھیے گا۔

پرواز چار بجے پہنچ گئی ہے۔ امیگریشن کے لیے عام طور پر تو ایک کارڈ ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان اور بھارت کے خصوصی تعلقات کے پیش نظر پاکستانی مسافروں کو الگ سے فارم بھرنے پڑتے ہیں۔ فارم،

پاسپورٹ، ویزا، میں نے امیگریشن آفیسر کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر رواں ہو گئی ہیں۔ مانیٹر کی اسکرین نے اسے کچھ کہا ہے۔ جس سے اسے ایک جھٹکا لگا ہے اور اس نے مجھے کہا ہے کہ آیئے اور ایک کیبن میں مجھے بٹھا دیا ہے۔ میرے کاغذات اور پاسپورٹ لے کر وہ کہیں چلا گیا ہے۔ کیبن میں بیٹھے نوجوان امیگریشن آفیسر نے فائل سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا ہے اور کہہ رہا ہے۔ آپ تو پریس رپورٹر ہیں۔ پچھلے سال بھی آپ کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

مجھے بھی یاد آ رہا ہے کہ یہ وہی شفٹ ہے۔ جس سے فروری ۱۹۹۷ء میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت تو مجھے ۳ گھنٹے تک حراست میں رہنا پڑا تھا۔ آج دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ شفٹ انچارج کہہ رہے ہیں کہ آپ کا تو اوپر سے ہی Clear ہوتا ہے۔ آپ بیٹھیں ہو ہی جائے گا۔

پی آئی اے والے آئے ہیں، پوچھ رہے ہیں جہاز تو نہیں روکنا۔ اگر کوئی مسافر واپس لاہور بھیجنا ہے۔ تو جہاز روکا جائے۔

جہاز کو تو واپس بھیج دیا گیا ہے۔

اب مجھے یہیں بیٹھے تین گھنٹے ہو رہے ہیں۔ کچھ فیصلہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ میں امیگریشن حکام سے یہ اجازت لیتا ہوں کہ باہر مشاعرے کے منتظمین میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں انھیں اطلاع دے دوں۔ وہ مہربانی کرتے ہیں اور ایک باوردی کانسٹیبل کو میرے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ میں اظہر جاوید صاحب کو تلاش کرتا ہوں اور انھیں صورتِ حال بتاتا ہوں۔ نارنگ ساقی جو دہلی میں ہمارے میزبان ہیں۔ ان کا موبائل فون نمبر اور گھر کا فون نمبر لے لیتا ہوں کہ جب مجھے ائیر پورٹ چھوڑنے کی اجازت ملے گی۔ آپ کو فون کر دوں گا۔ پھر آپ یہاں سے لے جانے کا انتظام کر لیجیے گا۔

پھر میں آ کر اسی کیبن میں بیٹھ جاتا ہوں۔ پروازیں آ رہی ہیں۔ مسافر امیگریشن کاؤنٹرز سے کلیئر ہو رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ایک سال پہلے تو امریکن ہمارے ساتھ تھے۔ انھوں نے شور مچایا تین گھنٹے بعد کلیئرنس مل گئی تھی۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کیوں روکا اور پھر کیوں چھوڑ دیا۔ آج بھی وہ کچھ پوچھ رہے ہیں۔ میں ان سے کہہ بھی رہا ہوں کہ آپ کے ہائی کمیشن والوں کو ویزا ہی نہیں جاری کرنا چاہیے اگر کوئی مسئلہ ہے۔

اب یہ شفٹ جا رہی ہے۔ اس لیے انھیں اپنے جانے کی جلدی ہے۔ اِدھر اُدھر فون ہو رہے ہیں۔ میرا سامان بھی یہیں لا کر دے دیا گیا ہے۔ فیصلہ ہو گیا ہے۔ 'انٹری ریفیوزل' ڈال کر مجھے ٹرانزٹ سیل میں ڈالا جا رہا ہے۔ میں اپنے وطن میں کچھ بھی ہوں۔ جانا پہچانا۔ اردو کے سب سے بڑے اخبار کا ایڈیٹر۔ کئی بار بھارت یاترا کر چکا ہوں۔ شاعروں کا حلقہ بھی جانتا ہے، صحافیوں کا بھی۔ لیکن امیگریشن کے ریکارڈ میں میں بلیک لسٹ ہوں۔ کیوں۔ کیا وجوہ ہیں۔ کیا پس منظر ہے۔ یہ نہ مجھے بتایا جا رہا ہے۔ نہ پوچھا جا رہا ہے۔

اب مجھے بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک دشمن ملک میں ہوں۔ ایک کشیدگی والی فضا میں ہوں۔ مجھے یقیناً کسی خاص جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ امیگریشن آفیسر میرے کاغذات کے ساتھ مجھے لفٹ سے اوپر کی منزل پر لے آئے ہیں۔ ڈیوٹی فری شاپس کے درمیان سے ہوتے ہم ایک ڈربے میں پہنچ چکے ہیں۔ وہاں مجھے ایک اور افسر کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ کہ آپ کو اب یہیں رہنا ہے۔

میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ آپ مجھے واپس پاکستان جانے دیں۔ کوئی بھی پرواز ہو۔ میں خود اس کا ٹکٹ خریدنے کو تیار ہوں۔ آپ کو مجھے اجازت نہیں دینی تھی۔ تو اسی جہاز سے واپس بھیج دیتے جس سے میں آیا تھا۔

ان کا لہجہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کوئی پرواز پاکستان جانے والی نہیں ہے۔ آپ دو راتیں یہیں گزاریں گے۔ پرسوں پی آئی اے کی پرواز آئے گی۔ اس پر آپ کو چڑھا دیں گے۔

آپ کو کہیں فون کرنا ہو۔ تو یہاں سے سپاہی ساتھ جائے گا۔ فون کروا دے گا۔ وہ صاحب یہ کہہ کر چلے گئے ہیں۔ اب میں جن کی تحویل میں ہوں۔ ان سے کہتا

ہوں کہ فون کروا دیں۔ تو وہ کہتے ہیں ابھی آپ بیٹھیں۔ دوسری شفٹ آئے گی۔ وہ فون کروائیں گے۔ یہ سامنے بینچ پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک سنبھال لیں۔

اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں اب بھارت کی قید میں ہوں۔ یہ اپنے خرچ پر ذلیل ہونے والی کیفیت ہے۔ خود ہی ٹکٹ خرید کر یہاں پہنچے ہیں۔ تاکہ اس سلوک سے لطف اندوز ہوسکیں۔ میں اپنے آپ کو دو روزہ قید گزارنے کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ اس ڈربے میں کچھ اور بھی قیدی ہیں۔ دو ایک تو بھارت کے مسلمان ہی ہیں۔ جو سعودی عرب سے واپس بھیج دیے گئے ہیں۔ اب ان کے بارے میں یہ تصدیق کی جارہی ہے کہ وہ واقعی بھارتی شہری ہیں یا نہیں یا انھیں آئی ایس آئی نے یہاں بھجوادیا ہے۔ ایک نیپال کے شہری ہیں۔ یہیں بینچ پر سونا ہے اور ساتھ ہی ایک لیٹرین ہے جسے باتھ روم کا نام دیا گیا ہے اور قیدیوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ آپ کے استعمال کے لیے ہے۔

اجنبی لوگ۔ غیر ملکی بلکہ دشمن سرزمین، مستقبل نامعلوم، ایسے میں صرف کتاب ساتھ دے سکتی ہے۔ شاعری کی فائل میرے ساتھ ہے۔ اسی کو نکال لیتا ہوں۔ فرصت ہی فرصت ہے۔ اتنا وقت پہلے کہاں ملا تھا۔ کسی فون کی گھنٹی بجنے کا خطرہ نہیں ہے۔ کوئی ملنے والا بھی نہیں آئے گا، کہیں باہر بھی نہیں جاسکتے۔ اس لیے پورے انہماک سے اپنی شاعری پر توجہ دی جاسکتی ہے۔ غیر مکمل غزلوں میں نئے شعر کہے جاسکتے ہیں۔ نظموں کی کانٹ چھانٹ کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی خیال کی صرف ایک رو ہے۔ پھر ایک وحشت غالب آجاتی ہے۔ یہ میں کہاں پھنس گیا ہوں۔ اس طرح خاموشی سے سب کچھ برداشت کرلینا درست نہیں ہے کچھ شور مچانا چاہیے۔ احتجاج کرنا چاہیے۔

میں اپنے فون کے لیے اصرار کرتا ہوں۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی کہتا ہے کہ نئی شفٹ آنے والی ہے۔ وہ فون کروادیں گے۔ نئی شفٹ والے کچھ انسان دوست لگتے ہیں۔ وہ ساتھ لے کر چل پڑتے ہیں۔ میں 'جنگ' کے دہلی بیورو میں فون کرتا ہوں۔ انھیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں۔ ان سے پاکستان ہائی کمیشن کا نمبر لیتا ہوں۔ مفتی جمیل الدین منسٹر انفرمیشن پاکستان ہائی کمیشن کو بتاتا ہوں کہ میں بھارت سرکار کا مہمان بن گیا ہوں۔ مفتی صاحب کو بھی پچھلا سال یاد آجاتا ہے کہ اچھا پھر وہی ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رات بہت ہوگئی ہے۔ پھر بھی ہم کچھ کوشش کرتے ہیں۔

میں پھر واپس آکر اسی ڈربے میں بیٹھ گیا ہوں۔ نیپال کا ایک شہری یہاں کئی دن سے پڑا ہے میں بھی سوچ رہا ہوں کہ نہ جانے کتنے دن یہاں رہنا ہے۔ روز مرہ کے معمولات کا کیا ہوگا۔ کیسے گزرے گی۔ عام طور پر قیدی ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ کھل مل جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک انجانا خوف ہے۔ میں بھی کسی سے مخاطب نہیں ہو رہا ہوں۔ مجھ سے بھی کوئی مخاطب نہیں ہو رہا ہے۔ 'را' والے نہ جانے کیا سمجھیں۔ انڈین سی آئی اے کیا سوچے۔

پینے کا پانی بھی باتھ روم سے مل رہا ہے۔ میں نے نگرانوں سے کہا ہے کہ ایک منرل واٹر کی بوتل منگوادیں۔ انھوں نے پوچھا کہ اور بھی کچھ منگوانا ہو تو بتادیں۔ میں نے پانی کی ایک بوتل اور ایک سینڈوچ لانے کو کہہ دیا ہے۔

آپ کا فون ہے۔ چلیں۔ مختلف راستوں سے ایک سپاہی مجھے لے جارہا ہے۔ میرا سامان وہیں سیل میں ہے۔ میں گھبرا رہا ہوں کہ شاید یہ کہیں اور بند کردیں۔ ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے کمرے کے باہر لے جاکر مجھے روک دیا گیا۔

آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ کون ہیں۔

مجھے ٹرانزٹ سیل سے لایا گیا ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ کوئی فون آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہیں کوئی فون نہیں آیا واپس چلیں۔ پھر بھول بھلیوں سے ہوتے ہوئے واپس سیل میں۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔

منرل واٹر کی بوتل آگئی ہے۔ سینڈوچ بھی۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ اور اپنا ڈنر کر رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اب سونے کا مرحلہ آرہا ہے۔ معلوم نہیں نیند آئے بھی کہ نہیں۔

پھر اپنی شاعری نکال رہا ہوں۔ کچھ لکھنے کی کوشش

کرر ہا ہوں۔ الفاظ ہاتھ نہیں لگ رہے، خیالات کترا کر گزر رہے ہیں۔

دوسرے قیدی سو چکے ہیں۔ خراٹے لے رہے ہیں۔

'آپ بھی سو جاؤ جی...... اب کچھ نہیں ہونے والا'

'نیند آئے گی تو سو جاؤں گا'

'جو آپ کی مرضی۔ فلائٹ تو اب دو روز بعد آئے گی'

نیند تو کہیں دور تک دکھائی نہیں دیتی۔

اب مجھے بھی بھارت نہیں آنا چاہیے۔ باقاعدہ ویزے کے بعد بھی یہ حال ہے۔ یہ تو کوئی خاص دشمنی والی بات ہے۔ یہ بھی نہیں بتاتے کہ ان کے پاس ہمارے خلاف ہے کیا۔ ہم نے ان کا کیا چرایا ہے۔

'آیئے جی۔ آپ کا فون آیا ہے'

'پہلے بھی ایسے ہی چکر لگوا دیا تھا'

'آپ کے ہائی کمیشن سے فون ہے'

اب ان کا رویہ کچھ مختلف ہے۔ اسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر امیگریشن کے کمرے میں پہنچتے ہیں۔ مفتی جمیل الدین صاحب کا فون ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ وزارت خارجہ کے کسی جوائنٹ سیکریٹری سے ہائی کمشنر کی بات ہوگئی ہے۔ بھارتی حکومت مشروط طور پر ۲۴ گھنٹے قیام کی اجازت دے رہی ہے۔ آپ اتنے میں فارم وغیرہ بھر دیں۔ ہم آپ کو لینے آ رہے ہیں۔ فارم پر لکھا ہوا ہے کہ ہم صرف ۲۴ گھنٹے بھارت میں رہ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں ڈائریکٹر وزارتِ داخلہ کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔

مفتی جمیل الدین اور پاکستانی ہائی کمشین کے کچھ حکام آئے ہوئے ہیں۔ فضا میں کشیدگی ہے۔ چہروں پر تناؤ ہے۔

کتنی مشکل اور کٹھن زندگی ہے۔ ہمارے ہائی کمیشن والوں کی اس مستقل تناؤ میں زندگی گزرتی ہے۔ ہم ایئر پورٹ سے روانہ ہو گئے ہیں۔ دہلی ایئر پورٹ سے شہر تک کا راستہ پچھلی بار کتنا خوب صورت اور رومان پرور لگ رہا تھا۔ اب تو میرا باہر دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا۔ کاش کوئی پرواز آج ہی مجھے واپس پاکستان لے جاتی۔

مفتی جمیل الدین سے ہماری یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ وہ پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ (پی آئی ڈی) کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کراچی میں کئی سال رہے ہیں۔ پھر مختلف ادوار میں مختلف عہدوں پر ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ ہوٹل کی بجائے ان کے ہاں ہی ٹھہرنے کا پروگرام بنا ہے۔ ہوٹل میں قیام اور پریشان کن ہوسکتا ہے۔ رات گزر گئی ہے۔ ٹرانزٹ سیل خوابوں پر چھایا رہا ہے۔

مفتی صاحب کے ساتھ پاکستان ہائی کمیشن پہنچے ہیں۔ اس کی حدود میں پہنچ کر کتنی اپنائیت، کتنی تسکین ہو رہی ہے۔ ہائی کمیشن کے ایک آفیسر کو ساتھ لے کر ڈائریکٹر ہوم اے این شرما سے ملنے جارہے ہیں۔ استقبالیہ، سیکورٹی، قطار، داخلہ پاس کے مراحل سے گزرتے ہوئے ڈائریکٹر صاحب کے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب ہاٹ لائن پر بات کر رہے ہیں۔ اسی لیے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

باریابی ہوتی ہے۔ حال احوال سننے کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایکسٹرنل منسٹری سے بھی فون آیا تھا۔ میں فائل منگواتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کیوں روکا گیا ہے۔ اتنے عرصے سے مشاعرے سے منتظمین کی طرف سے کرتار سنگھ دگل بھی پہنچ گئے ہیں۔ خاصے بزرگ ہیں۔ معلوم نہیں انھیں کیوں زحمت دی گئی ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ چندی گڑھ جانے کے لیے وہ مجھے بس پر سوار کروا دیں گے۔ ٹرین تو نکل گئی ہے۔ ڈائریکٹر صاحب بھی مجھے مشاعرے میں جانے کی عارضی اجازت دے رہے ہیں۔ لیکن میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ اب میرا مشاعرے یا کسی بھی تقریب میں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ مجھے صرف یہ بتا دیا جائے کہ اس سلوک کی کیا وجوہ ہیں۔ اگر میرے خلاف کوئی الزامات ہیں تو ظاہر کیے جائیں اور اگر کوئی ٹھوس معاملات ہیں تو اسلام آباد میں انڈین ہائی کمیشن کو کیوں نہیں مطلع کیا گیا۔ وہ مجھے ویزا ہی جاری نہ کریں۔

ڈائریکٹر صاحب غور سے سن رہے ہیں۔ لیکن جواب وہی ہے کہ فائل آجائے تو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ اسی روز سہ پہر کو دوبارہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا چکر لگتا ہے۔ فائل ابھی تک نہیں آئی ہے۔ اگلی صبح 11 بجے کا وقت طے ہوا ہے۔ دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ جو بھی اگلی پرواز ملے اس سے روانگی ہوجائے۔ اس ملک کو جتنی جلد چھوڑ دیا جائے اچھا ہے۔

کرن ساہنی Peace Initiative نکالتے ہیں۔ ٹریولنگ سیمینار میں امریکہ کے ساتھ شریک میزبان بھی رہے ہیں۔ پچھلے برس ان سے کافی ملاقات رہی تھی انھیں معلوم ہوا ہے تو فون کیا ہے کہ شام کو دہلی جیم خانے میں ملوں۔ کچھ احباب سے ملاقاتیں ہوں گی۔ ذہنی کیفیت ملنے ملانے کی تو نہیں۔ لیکن یہ سوچتا ہوں کہ بھارتی حکومت کی میزبانی اور حسن سلوک کا احوال تو بھارت کے صحافیوں، دانشوروں اور پبلشروں تک پہنچ سکے گا۔

ریٹائرڈ فوجیوں، بیوروکریٹوں، دانشوروں، سینئر صحافیوں کی گپ شپ سے جیم خانہ گونج رہا ہے۔ کرن ساہنی جس جس کو بتاتے ہیں۔ سب اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں، کالم نویس کالم لکھنے کا اظہار کرتے ہیں۔ کچھ متعلقہ حکام سے بات کرنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں اور پھر اپنی گپ شپ میں مست ہوجاتے ہیں۔

اگلی صبح پھر ڈائریکٹر ہوم کے دفتر میں پہنچتے ہیں۔ اردو اخبارات میں خبر آچکی ہے کسی انگریزی اخبار میں نہیں آئی ہے۔ حالانکہ کچھ کو بتایا بھی گیا ہے۔ ڈائریکٹر ہوم پھر فائل نہ آنے کا عذر ظاہر کرتے ہیں۔ ایک بار پھر سہ پہر کو آنے کا کہتے ہیں۔ میں پاکستان ہائی کمیشن واپس جاتے وقت پی آئی اے سے اگلے روز کی سیٹ بک کروالیتا ہوں۔ اب اس سلوک کے بعد میرا اس ملک میں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور جو بھی اگلی پرواز دستیاب ہو اس سے جانا چاہتا ہوں۔ سہ پہر میں آتے ہیں۔ تو ہماری فائل شرما صاحب کی میز پر موجود ہے۔ فائل بہت ضخیم ہوچکی ہے۔ کئی فائلیں تیار ہیں۔ لیکن اس میں کیا ہے یہ شرما صاحب نہیں بتارہے۔ وہ اپنے اعلیٰ افسروں کو بتائیں گے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس پر رپورٹ تیار کررہا ہوں۔ آپ کچھ دن ٹھہرنا چاہیں۔ ٹھہریں۔ جن سے ملنا چاہیں۔ ملیں۔ فائل کو نمٹانے میں کچھ دن لگ سکتے ہیں۔

میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ میرے پاسپورٹ پر Exit جانے کی مہر لگادیں میں تو واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی سیٹ بک کرواچکا ہوں۔ میں کسی کو بھی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا، کیونکہ یہاں جس سے بھی ملوں گا۔ بعد میں سی آئی ڈی اور 'را' والے اس کو تنگ کرتے رہیں گے۔

شرما کا کہنا ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کو خط دے دوں گا۔ کمرے سے اٹھ کر ہم انتظار گاہ میں جائیں گے۔ کیونکہ شرما صاحب کو کسی میٹنگ کے لیے جانا ہے۔ انتظار گاہ غیر ملکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کسی کا مسئلہ زیادہ ٹھہر جانے کا ہے۔ کسی کے پاسپورٹ میں کوئی غلطی ہے۔ ایک ہنگامہ ہے۔ شور ہے۔ گورے تو انڈین افسروں کو خوب بے نقط سناتے ہیں۔ یہ افسر تسلی سے سنتے ہیں۔ پاکستانی، نیپالی، بنگلہ دیشی، سری لنکن، دب کے بات کرتے ہیں۔ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔

جس کلرک نے یہ خط ہمیں دینا ہے۔ وہ نظر تو آرہا ہے۔ وہ کبھی کسی کمرے میں جارہا ہے کبھی کہیں۔ اسے کسی ڈائریکٹر سے دستخط کروانے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ ہمیں ایک خط دیتا ہے۔ جو ایک ڈی آئی جی پولیس کے نام ہے۔ ہم اس سے کہتے ہیں کہ ہمارا ویزا تو پولیس حاضری سے مستثنیٰ ہے۔ ہم پولیس کے پاس کیوں جائیں۔ اس کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ ہمیں پھر یہیں بھیجے گا۔ کیونکہ اس کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔

دو روز سے ہم اس دفتر میں بار بار آرہے ہیں۔ بھارت آنا میری کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ سب قریبی رشتے دار یہیں تھے۔ لیکن سب اب یادوں میں ڈھل چکے ہیں۔ کچھ کے تو پاکستان بنتے وقت شہید ہونے کی تصدیق ہوگئی تھی۔ کچھ کا پتا ہی نہیں چلا کہ کہاں گئے۔ میرے والدین اور ایک بھائی۔ اس وقت انبالے میں

تھے۔ اس لیے ہم زندہ بچ گئے تھے۔ خاندان ہمارا منقسم تو ہے۔ لیکن ایک طرف صرف یادیں ہیں۔ کوئی زندگی نہیں جس سے ملنے آنا پڑے۔

یہاں موجود پریشان حال پاکستانی تو سیکڑوں وہ ہیں جن کے عزیز واقارب یہاں ہیں۔ سگے پیارے یہاں ہیں۔ ان کی تو مجبوری ہے۔ انھیں تو یہاں آنا پڑتا ہے اور یہاں والوں کو وہاں جانا پڑتا ہے۔ ان کو دونوں طرف کے ڈائریکٹر، افسر، کلرک، تنگ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اس وقت رشتہ انسانیت کا نہیں رہتا۔ غیر ملکی کا ہوجاتا ہے۔ قانون خود تو کچھ نہیں کہتا۔ قانون کا استعمال اپنی مرضی سے کیا جاتا ہے۔ پولیس کے نام خط تو ہم اس کلرک کو واپس کر دیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ ہمیں تو پاسپورٹ پر Exit لگا دیں۔ تاکہ ہم یہاں سے اپنے وطن واپس چلے جائیں۔ اگر Exit نہیں لکھا ہوگا تو ائیر پورٹ والے پھر روکیں گے۔

دفتر کا وقت ختم ہوچکا ہے۔ اس لیے اب پاسپورٹ پر کوئی Exit لگانے والا نہیں ہے۔ ایک دن اور یہاں گزارنا ہوگا۔

پی آئی اے کی پرواز شام کو ہے۔ ہم صبح ۱۱ بجے پھر ہوم آفس پہنچ گئے ہیں جہاں اسی طرح ہنگامہ ہے۔ ہجوم ہے۔

ڈائریکٹر صاحب خوش قسمتی سے مل گئے ہیں۔ انھوں نے متعلقہ کلرک سے کہہ بھی دیا ہے کہ پاسپورٹ پر Exit لکھ دے۔ انھیں فوراً ہی کسی میٹنگ میں جانا ہے وہ جلد آنے کا کہہ کر نکل گئے ہیں۔ ہم پھر انتظار گاہ میں بیٹھے ہیں۔ کلرک نے پاسپورٹ پر لکھ دیا ہے۔ لیکن اب دستخط اور مہر کا انتظار ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ان کا اسٹاف کہتا ہے انتظار کریں۔ ان کے پڑوس میں ایک دوسرے ڈائریکٹرز ہیں ان سے درخواست کی ہے کہ آپ دستخط کردیں۔ میں تو یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا سنگین مسئلہ تو نہیں ہے۔

وہ صاف انکار کردیتے ہیں کہ 'پاکستانی شہریوں' کا شعبہ میرا نہیں ہے ہم برآمدوں میں چکر لگا رہے ہیں۔ کسی ڈائریکٹر کی تلاش ہے۔

اسٹاف میں سے ہی کسی نے مشورہ دیا ہے کہ یہاں کے جوائنٹ سیکریٹری بہت اچھے افسر ہیں ان سے مل لیں۔ ان کا اسٹاف حیل وحجت کرتا ہے کہ صاحب مصروف ہیں۔ ابھی تو ملنا مشکل ہے۔ اب میرا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے۔ اس لیے میں جوائنٹ سیکریٹری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوجاتا ہوں۔ انھیں اپنا تعارف کرواتا ہوں۔ وہ سردار جی ہیں۔ ان کی پیشانی پر بل نہیں آتا۔ اطمینان سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے ساتھ پاکستان ہائی کمیشن کے افسر ہیں۔ وہ اپنا تعارف کرواتے ہیں۔ تب جوائنٹ سیکریٹری کا چہرہ کچھ کرخت ہوجاتا ہے۔ لیکن وہ میرا مسئلہ سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ جانا چاہتے ہیں تو ہم مہر لگا دیتے ہیں۔ لیکن آپ کے معاملے پر اعلیٰ سطح پر بات بھی ہو رہی ہے۔ میں نے فائل وزارت خارجہ کو بھجوادی ہے۔ اگر آپ کلیئرنس کا انتظار کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ میں اب ذہنی طور پر اس کیفیت میں نہیں ہوں کہ ایسے ماحول میں رہ سکوں۔ اس لیے میں واپس ہی جانا چاہتا ہوں اور مجھے آج ہی جانا ہے۔

وہ کسی سے فون پر بات کرتے ہیں اور اپنا ایک اسٹاف ممبر ساتھ بھیجتے ہیں اور ہم اسی ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں جو کچھ دیر قبل صاف انکار کرچکے تھے کہ پاکستانی شہری ان کا شعبہ نہیں ہیں ہمیں تپاک سے سیٹ پر بٹھاتے ہیں اور متعلقہ کلرک کو بلا کر فائل دیکھتے ہیں۔ پاسپورٹ پر اپنے آٹوگراف عنایت کرتے ہیں۔ چپراسی کو کہتے ہیں کہ مہر لگالائے پاسپورٹ ہمارے حوالے کردیتے ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

پی آئی اے کی پرواز میں اب دو گھنٹے باقی ہیں۔

مفتی جمیل الدین سے میں درخواست کرتا ہوں کہ ائیر پورٹ جانے سے پہلے بستی نظام الدین میں حاضری دینا ہے۔ کچھ دعائیں مانگ لیں۔ کچھ گلے کرلیں۔

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب بھی دہلی آنا ہو۔ تو بستی نظام الدین اولیا جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ مزاروں پر حاضری۔ گدی نشینوں سے گفتگو پاک بھارت

تعلقات میں بہتری کی دعائیں۔
وہی ہجوم زائرین۔ عشق کا اظہار۔ فریادیں۔ التجائیں۔
اب ایئرپورٹ روانگی ہے۔ دلی پہلے بھی آئے ہیں۔ یہ سفر عجیب ہو رہا ہے۔ پہلے دوسروں کے خرچ پر آتے رہے ہیں۔ کبھی بھارتی حکومت کی دعوت پر، کبھی امریکی محکمہ اطلاعات، ایک بار افغانستان حکومت کی دعوت پر کابل جانا تھا تو یہاں سے ہی گزرنا پڑا تھا۔ جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی۔ افغانستان کی سرحد پاکستان سے ملتی ہے۔ کابل بھی پاکستان سے نزدیک ہے۔ لیکن اس وقت نجیب اللہ کی حکومت تھی۔ پاکستان سے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس لیے پشاور سے بھی کسی کو کابل جانا ہوتا تھا۔ وہاں سے آریانہ ایئرلائن پکڑ کر کابل جاتا تھا۔ یہ تاریخ کے جبر کے مظاہر ہیں۔ ان سے بچاؤ نہیں ہے۔ دلّی میں یہ تین راتیں غضب رہی ہیں۔ دلی نے کیا رنگ دکھائے ہیں۔ اب کے اپنے خرچ پر آئے ہیں تو یہ سلوک ہوا ہے۔ مشاعرے والوں کو ٹکٹ کے پیسے اور شاعری کا معاوضہ دینا تھا۔ وہ تو گیا کیونکہ مشاعرے میں پہنچتے تو پیسہ ملتا۔ اپنے خرچ پر یہاں آ کر یہ ذہنی کوفت اور ذلت برداشت کی ہے۔
میں نے اس سرزمین پر ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ٹرانزٹ سیل میں سینڈوچ اور منرل واٹر پر جو ۵۰ روپے خرچ ہوئے۔ اس کے بعد میں نے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ خریداری بالکل نہیں کی۔ پہلے ساڑھیاں، کاجو، الائچی وغیرہ خریدنا ایک معمول تھا۔ فرمائشیں بھی ہوتی تھیں۔ اب کے بھی تھیں۔ لیکن احتجاجاً میں نے بھارت کے زرمبادلہ کے ذخائر میں ایک ڈالر کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔
امیگریشن کے کاؤنٹر پر کچھ حیرتوں کا اظہار ہے۔ لیکن روکا نہیں جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی دھڑکا لگا ہوا ہے۔ جب تک ٹرانزٹ میں جا کر نہیں بیٹھ گیا ہوں اس وقت تک خدشہ ہی رہا کہ کہیں روک لیا جاؤں۔
پی آئی اے کے جہاز کی کھڑکی سے میں دہلی ایئرپورٹ پر الوداعی نظر ڈال رہا ہوں۔ اب بھی ڈر رہا ہوں کہ کوئی جہاز نہ آ جائے۔
پرواز ٹیک آف کر رہی ہے۔ دہلی ایئرپورٹ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ میں اپنے آپ میں بحال ہو رہا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لا رہا ہوں کہ اس اذیت گاہ سے نجات ملی ہے۔
میں راستے میں سوچ رہا ہوں کہ اب مجھے اپنے اس مسئلے پر بھرپور احتجاج کرنا ہے۔ دنیا کو بتانا ہے کہ دہلی ایئرپورٹ پر پاکستان کے سب سے بڑے اخبار کے ایڈیٹر کے ساتھ کیا ہوتا رہا۔
دہلی سے لاہور پہنچ گئے ہیں۔ لاہور میں کسی سے ملنے کا جی نہیں ہے۔ ایئرپورٹ سے ہی کراچی کی اگلی پرواز میں بیٹھنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ سیٹ مل گئی ہے۔ ایک اذیت بھرا سفر ختم ہو گیا ہے۔ اب اپنے وطن میں ہیں۔ ایک عذاب سے نکل آنے کی خوشی۔ ایک کرب سے نجات کی تسکین۔
کراچی پہنچ کر میں نے اپنا احتجاجی سفر شروع کر دیا ہے۔ بھارتی اخبارات کے ٹیکس نمبر اور ای میل ایڈریس لے کر آیا ہوں۔ انھیں اپنی روداد بھیج رہا ہوں۔ ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا نے یہ روداد چھاپ دی ہے۔ ٹائمز آف انڈیا میں خطوط کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ حقوقِ انسانی کی تنظیمیں۔ صحافیوں کی انجمنیں احتجاج کر رہی ہیں۔ بھارتی حکومت کے رویے کی مذمت کر رہی ہیں۔ ڈائریکٹر ہوم شرما نے بیان دیا ہے۔ صحافی قدرے نازک مزاج ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ محمود شام سے متعلق کچھ انکوائریز تھیں ان کا جواب ضروری تھا۔
کوئی سوال پوچھا جائے تو جواب ملتا ہے۔ مجھ سے تو کبھی کچھ نہیں پوچھا گیا۔ میں نے گزشتہ بار بھی بھارت کے ہائی کمشنر کو خط لکھا تھا۔ اس کا جواب بھی نہیں آیا تھا۔ اس بار بھی خط لکھا۔ کوئی جواب نہیں۔
اب پارتھا سارتھی ہائی کمشنر بن کر آئے ہیں۔ وہ کراچی کے ایک طویل عرصے تک قونصل جنرل رہے ہیں۔ ان سے یہاں اچھی ملاقات رہی ہے۔ انھیں بھی باضابطہ خط لکھا ہے۔ جواب تحریری طور پر انھوں نے

بھی نہیں دیا ہے۔ زبانی کہا ہے کہ اب آپ جائیں گے۔ تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی لیکن میں تو اب اس طرح جانا ہی نہیں چاہتا۔

ہم نے ایک خط سیکریٹری وزارتِ خارجہ پاکستان کو بھی لکھا ہے۔ جس کے جواب میں انڈیا ڈیسک کے ڈائریکٹر جمیل احمد نے ۵ جون ۱۹۹۸ء کو لکھا کہ ہم نے اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمشنر سے بھی اس معاملے پر رابطہ کیا ہے اور نئی دہلی میں اپنے ہائی کمیشن سے کہا ہے کہ وہ بھارتی حکام سے اس مسئلے پر بات کریں۔

نئی دہلی کے سابق چیف جسٹس راجندر سچر نے مجھے بھی خط بھیجا۔ جو بھارتی اخبارات میں بھی شائع ہوا۔ وہ اقوام متحدہ کی مختلف کمیٹیوں کے رکن بھی رہے ہیں اور اب وہ شہری آزادیوں کی عوامی یونین کے صدر بھی ہیں۔ انھوں نے بھارتی حکام کے رویے کی سخت مذمت کی اور مجھے لکھا کہ وہ پاک بھارت گہرے دوستانہ تعلقات کی خواہش اور یقین رکھتے ہیں اس لیے وہ یہ اپیل کریں گے کہ میں بھارت کبھی نہ آنے کے فیصلے پر نظر ثانی کروں۔

ریڈیکل ہیومنسٹ ایسوسی ایشن نئی دہلی کے سیکریٹری این ڈی سیخولی نے بھی ذاتی طور پر خط لکھ کر مجھ سے ہمدردی ظاہر کی اور کہا کہ وہ بھارتی حکومت سے اس مسئلے پر احتجاج بھی کر رہے ہیں۔ انڈین جرنلسٹس یونین کے سیکریٹری جنرل سری تواس ریڈی، انڈو پاک جوبلی کلچر ساماروکے کنوینر کے بی تلک نے اس سلسلے میں وزیراعظم کو خطوط اور امیگریشن حکام کے اس رویے پر احتجاج کیا۔ انھوں نے ازراہِ کرم مجھے بھی ان خطوط کی نقول بھیجیں۔

بھارت میں بے شمار انجمنوں نے اس مسئلے پر احتجاج کیا اور مجھے بھی ہمدردی کے خطوط لکھے اور مسئلہ حل ہونے تک احتجاج جاری رکھنے کی یقین دہانی کروائی لیکن ہریانہ اردو اکادمی نے ہمیں کوئی خط نہ لکھا۔ نہ حکومت سے کوئی بات کی۔ اس تنظیم نے ہمیں دعوت دی تھی اور اس قابل سمجھا تھا کہ کل ہند غالب سیمینار وانڈو پاک مشاعرے میں شرکت کرسکوں۔ ان کی طرف سے آج تک کوئی خط موصول نہیں ہوا۔

ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ان کو علم ہی نہ ہوا ہو کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔

مسائل ہمارے...... فکر امریکہ کو

امریکی محکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام پاک بھارت سفری سیمینار

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی۔ پھر پریشانی کہ جھگڑا تو یہ دو قریبی دیوار بہ دیوار ہمسایوں کا ہے۔ اس میں ہزاروں میل دور...... بلکہ زمین کی دوسری سمت واقع امریکہ کو فکر کیوں ہو رہی ہے کہ ہمارے تعلقات بہتر کروائے۔ ہم تو بچپن سے سنتے آرہے ہیں کہ دونوں ملکوں کے تعلقات خراب کروانے والا ہے ہی امریکہ۔

پھر قدرے اطمینان اور خوشی بھی ہوئی کہ جب امریکہ نے بھارت پاکستان کو قریب لانے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔ تو دونوں ملک شاید نزدیک بھی آجائیں۔

تمھی نے درد دیا ہے۔ تمھی دوا دینا۔

لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ دونوں کو یہ احساس تو ہوجائے کہ انھیں لڑوایا جارہا ہے۔ دونوں تو بڑے خلوص اور جوش جذبے سے لڑ رہے ہیں۔

امریکی محکمہ اطلاعات نے پاکستان اور بھارت کے صحافیوں، ایڈیٹروں پر مشتمل ایک 'سفری سیمینار' کا اہتمام کیا ہے، جس کا موضوع ہے۔ ''تنازع طے کرنے میں میڈیا کا کردار'' کچھ ایڈیٹر۔ سینئر صحافی اور کالم نویس بھارت سے پہلے پاکستان آئیں گے۔ پھر ان کے ساتھ ہی پاکستان کے ایڈیٹر۔ سینئر صحافی اور کالم نویس بھارت جائیں گے۔ ادھر لاہور، اسلام آباد، کراچی میں سیمینار ہو رہے ہیں۔ ادھر نئی دہلی اور ممبئی میں سیمینارز منعقد ہوں گے۔

۲۴ فروری ۱۹۹۷ء۔

لاہور۔ پرل کانٹی نینٹل کے ایک کمرے میں سیمینار کے شرکاء کی تعارفی ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے پہنچنے والے اور ادھر بھارت سے آنے والے۔ امریکیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے ہیں۔ صدیوں سے اکٹھے رہنے والے۔ نصف صدی سے الگ ہوئے تو انھیں ملنے کے لیے ایک ثالث کی ضرورت پڑی ہے۔

وقت شاید ہے کہ مسائل ثالثوں کے ذریعے ہی حل ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایک دوسرے کو پہلے سے بھی جانتے ہیں۔

بھارت سے آنے والوں میں

سروش بانا۔ ایگزیکٹوڈائریکٹر۔ بلٹز ویکلی

ڈاکٹر اردن کمار بینر جی۔ ڈائریکٹر اسٹریٹجک اسٹڈیز۔ کلکتہ۔

سمن چٹو پادھیا۔ ایگزیکٹو ایڈیٹر۔ آنند بازار پتریکا۔ کلکتہ۔

کے این ہری کمار۔ چیف ایڈیٹر۔ دکن ہیرالڈ۔ بنگلور۔

ریتا منچندانی۔ فری لانس جرنلسٹ۔ نئی دہلی۔

ڈاکٹر عبدالرحیم، چیئرمین۔ شعبہ صحافت۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد۔

کرن رنبیر ساہنی۔ ڈائریکٹر انٹرنیشنل سینٹر فار پیس انی شیٹو۔ نئی دہلی۔

ٹیسٹا سٹیالوڈ۔ ایڈیٹر کمیونلزم کمبیٹ۔ ممبئی۔

شاہد صدیقی۔ ایڈیٹر۔ نئی دنیا۔ نئی زمین۔ عوام۔ نئی دہلی شامل ہیں۔

پاکستان سے شرکت کرنے والوں کے نام یہ ہیں۔

راقم الحروف: طارق محمود شام۔ ایڈیٹر روزنامہ جنگ کراچی۔

سید جاوید اقبال۔ ایڈیٹر ساؤتھ ایشیا۔ تھرڈ ورلڈ۔ کراچی۔

انجم ابراہیم۔ ریذیڈنٹ ایڈیٹر بزنس ریکارڈر۔ کراچی۔

ریحانہ حکیم۔ ایڈیٹر ماہنامہ نیوز لائن کراچی۔

خالد احمد۔ ایڈیٹر۔ 'آج کل'۔ فرائیڈے ٹائمز۔ لاہور۔

قدرت اللہ چوہدری۔ ایڈیٹر 'پاکستان' لاہور۔

پہلی شام تو ملنے ملانے میں گزر رہی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان دوریاں ختم کرنے کی کوششیں کرنے والے پہلے اپنے درمیان دوریاں کم کر رہے ہیں۔ امریکی محکمہ اطلاعات کراچی، لاہور، اسلام آباد کے کلچرل افیئرز۔ پبلک افیئرز کے امریکہ سے آئے ہوئے سفید فام، سیاہ فام آفیسرز پاکستان اور بھارت دو ہمسایوں کے ایڈیٹرز کے درمیان رابطہ بن رہے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان قربتوں کا آغاز شہر تمبر لاہور سے ہو رہا ہے۔ جو ۱۹۶۵ء میں بھارتی جارحیت کا نشانہ بنا تھا۔ جس جیم خانہ میں جنرل چوہدری نے جام نوش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل سے بہت نزدیک ہے۔ جنرل چوہدری کو اس وقت حسرت ہی رہ گئی۔ لیکن اب بھارت کے کئی ریٹائرڈ جنرل ٹریک ٹو ڈپلومیسی کے سلسلے میں پاکستان آرہے ہیں۔ تو وہ جام نوش کرنے کی حسرت پوری کر لیتے ہیں۔ یہ جنرل، بیوروکریٹ جب حاضر سروس ہوتے ہیں۔ تو پاکستان کے خلاف جارحیت کو فرض اولین سمجھتے ہیں۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کے چمپئن بن جاتے ہیں۔

میں پہلی بار کسی ایسی کوشش میں شامل ہو رہا ہوں۔ پہلے بھی ایسے سیمینار ہو چکے ہیں۔ ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ماضی میں ان میں شرکت کرنے والے کچھ نہیں بتا رہے ہیں۔ یہی احساس ہو رہا ہے کہ فالو اپ کا سلسلہ کمزور ہے۔ اسلام آباد امریکی سینٹر کے فرسٹ سیکریٹری کلچرل افیئرز۔ جناب تھیوڈور ایچ۔ جبیں کی طرف سے سیمینار سے متعلقہ خط میں یہ سوالات کیے گئے ہیں۔

۱۔ آپ کے ادارے نے بھارت اور پاکستان کے لوگوں کے درمیان حالات کی بہتری کے لیے پہلے کیا کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی دوسرے کی ایسی کوششیں جو آپ کے نزدیک قابل تحسین رہی ہو۔

۲۔ کیا پاکستانیوں اور بھارتیوں کے ذرائع ابلاغ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر کرنے میں تعاون کر رہے ہیں۔ کیسے اور کیوں؟

۳۔ پاکستانیوں اور بھارتیوں کے درمیان اختلافات طے نہ کر سکنے میں بنیادی رکاوٹ آپ کے خیال میں کیا ہے۔

۴۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرنے کے لیے آپ کے اخبار کے قارئین کیا کر سکتے

ہیں۔ وہ کون سے عناصر ہیں۔ جو بھارتیوں اور پاکستانیوں میں سے مضبوطی سے اپنے اختلافات دور کرنا چاہتے ہیں اور کون سے عناصر ایسا نہیں چاہتے۔

سوالات بنیادی ہیں۔ ہم تو اس سلسلے میں برسوں سے کوششیں کررہے ہیں۔ میں تو اس وقت بھارت گیا تھا۔ جب دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات بھی نہیں تھے۔ سوئس سفارت خانہ پاکستان میں بھارت کے مفادات کی اور بھارت میں پاکستان کے مفادات کی نگرانی کرتا تھا۔ کتنے لوگوں سے ملے۔ کتنے ہفتوں تک ان موضوعات پر لکھا۔ یہ سفرنامہ بہت مقبول ہوا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستان بھارت دونوں کے شہری آپس میں قریبی تعلقات چاہتے ہیں۔

امریکہ سے ایک نامور صحافی آرتھر چیرٹی خاص طور پر اس سیمینار میں ماڈریٹر کا کردار ادا کرنے آئے ہیں۔ وہ پبلک جرنلزم (عوامی صحافت) کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔ کئی ممالک میں تنازعات کے تصفیے کے لیے صحافیوں کی تربیت کرتے رہے ہیں۔ 'اوٹاہ سٹیزن' میں بین الاقوامی امور پر اداریہ نگار رہے ہیں۔ نیویارک یونیورسٹی میں پبلک لائف اینڈ دی پریس (عوامی زندگی اور صحافت) کے منصوبے سے وابستہ ہیں۔

۲۵ فروری ۱۹۹۷ء

آرتھر چیرٹی پبلک جرنلزم کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کررہے ہیں۔ پہلی نشست کا موضوع ہے، میڈیا کے مطابق بھارتیوں اور پاکستانیوں کے راستے میں آخر کیا رکاوٹ ہے جو ایک مشترکہ مقصد کا احساس نہیں ہونے دیتی پاکستانی اور بھارتی صحافی اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اپنے نکات پر زور دے رہے ہیں۔ اصل مقررین پاکستان سے سید جاوید اقبال اور بھارت سے شاہد صدیقی ہیں۔ سب نے حصہ لیا ہے اور بڑے کام کی باتیں کی ہیں۔

دوسری نشست میں موضوع سخن ہے۔ ادارے اور افراد (سیاسی جماعتیں تجارتی صنعتی تنظیمیں۔ مذہبی رہنما۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کے لیے کیا کرسکتے ہیں؟

اصل مقررین پاکستان سے انجم ابراہیم۔ بھارت سے ٹیسٹا سٹیل واڈ میں۔ دونوں خواتین نے بڑے موثر پیرائے میں اس انتہائی اہم موضوع پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس امر پر دونوں متفق ہیں کہ دونوں ملکوں کی سیاسی جماعتیں اور مذہبی رہنما تو تعلقات خراب کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ان سے کوئی امید رکھنا عبث ہے۔

تیسری نشست میں موضوع یہ ہے۔ ایسے کون سے مخصوص کام ہیں جو بھارتی پاکستانی مذاکرات میں حائل مخصوص رکاوٹوں کو دور کرسکتے ہیں۔ یا افراد اور اداروں کو تعمیری رویہ رکھنے میں آسانی پیدا کرسکتے ہیں۔

اس نشست کے اصل مقررین ہیں خالد احمد پاکستان سے اور سمن چھاٹو پادھیا بھارت سے......

موضوع انتہائی حساس ہے۔ دلچسپ ہے۔ بہت بھرپور مباحثہ رہا ہے۔ میں تو پہلی بار کسی ایسے سیمینار میں شرکت کررہا ہوں۔ اس لیے اب جاکر کچھ سمجھنے لگا ہوں کیا ہوتے ہیں۔ بات کرنے کی ادا کیا ہے۔

بات کرنے کی ادا ہوتی ہے
نکہت گل بھی صدا ہوتی ہے

کھلی بحث میں سب شرکت کرتے ہیں۔ آرتھر چیرٹی دن بھر کی بحث کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

امریکی قونصل خانے کی طرف سے رات کو استقبالیہ دیا گیا ہے۔ جہاں لاہور کے نامور سیاست دانوں، ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں سے ملاقاتیں رہتی ہیں۔

پہلے دن کی نشستوں میں اکثر شرکا ان امور پر ایک دوسرے کے قریب نظر آرہے ہیں۔

۱۔ دونوں ملکوں میں اخبارات ورسائل آسانی سے دستیاب ہونے چاہئیں۔ ان کا روزانہ مطالعہ عام شہریوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لاسکتا ہے۔ سمجھنے میں مدد کرسکتا ہے۔

۲۔ اس وقت دونوں ملکوں کے عام لوگوں کے درمیان روابط کافی نہیں ہیں۔

۳۔ یہ بھی شکایات سامنے آئیں دونوں طرف میڈیا اشتعال انگیز بیانات شائع کرتا ہے۔

۴۔ پاکستانیوں، بھارتیوں، ہندوؤں اور

مسلمانوں میں گھسی پٹی فکر والے حلقے موجود ہیں۔ جو ۱۹۴۷ء کی حقیر سوچ سے باہر نہیں نکلے ہیں۔

۵۔ پاکستانیوں، بھارتیوں ،ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو مشترکہ اقدار یا دلچسپیاں ہیں۔ وہ نمایاں نہیں کی جاتی ہیں۔

۶۔ دونوں طرف اگر بعض تنظیموں کی طرف سے کوئی تعمیری کام ہو بھی رہا ہے تو اس کی تشہیر نہیں کی جاتی۔

۷۔ تاریخ کا مطالعہ آزادانہ نہیں کیا جاتا۔

۸۔ سول سوسائٹی کے ادارے (ہمسایہ کمیٹیاں وغیرہ) تباہ کیے جاچکے ہیں۔

۹۔ ایک دوسرے کے محسوسات کا پاس نہیں رکھا جاتا۔

۱۰۔ مقبول عوام اخبارات ورسائل (ہندی۔ اردو۔ سندھی۔ انگریزی) ایک دوسرے تک اپنے خیالات نہیں پہنچاتے۔

۱۱۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارت جتنی ہوسکتی ہے۔ نہیں ہورہی ہے۔

۱۲۔ انتہا پسندوں کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اعتدال پسندوں کو اہمیت نہیں دی جاتی۔

۱۳۔ بحران کا مقابلہ کرنے میں میڈیا بہت سست رفتاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

۱۴۔ دونوں ملکوں میں سول سوسائٹی کے گروپ ایک دوسرے کے وجود سے ناواقف ہیں اور آپس میں رابطے بھی نہیں ہیں۔

۱۵۔ ایک دوسرے کو درپیش مسائل اور تنازعات پر ہم خوش ہوتے ہیں ان کو مشترکہ مسائل اور تنازعات نہیں سمجھتے۔

کشمیر کے مسئلے پر بھی بار بار بات ہوتی ہے۔ اس پر دونوں طرف کے نمائندوں کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ اس لیے اسے اگلے دن کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے۔

اس سے سب نے اتفاق کیا کہ اخبارات کو چاہیے کہ دونوں ملکوں کے عوام کو امن اور دوستی کے لیے تیار کریں۔ تربیت دیں۔

یہ بھی تجویز آئی کہ ایسے صحافیوں کو ایوارڈ دیے جائیں جو پاکستانیوں اور بھارتیوں کو قریب لانے کے لیے غیر معمولی کردار ادا کریں۔

یہ بھی زیر بحث آیا کہ ٹیلی ویژن چینل اور انٹرنیٹ اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

۲۶ فروری ۱۹۹۷ء

اب ہم آباد میں ہیں۔

سفری سیمینار کا یہ دوسرا باقاعدہ دن ہے۔ لاہور سے صبح صبح ہی ہم اسلام آباد پہنچے ہیں۔ امریکن سینٹر میں کچھ وقت سے پہلے ہی ظہرانہ ہورہا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد انسٹیٹیوٹ آف اسٹریٹیجک اسٹڈیز میں سیمینار کے سلسلے میں نشست ہے۔ جسے تنازع کے تصفیے کے لیے ٹاؤن میٹنگ کا نام دیا گیا ہے۔ سیمینار کے مسافر تو وہی ہیں مقامی طور پر اہم شخصیتیں شرکت کررہی ہیں۔ انسٹیٹیوٹ کے چیئرمین آغا مرتضیٰ پویا شرکا کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں اور امید ظاہر کررہی ہیں کہ اس سفری سیمینار سے مسائل کے حل میں یقیناً مدد ملے گی۔

سفری سیمینار کے سلسلے میں امریکی محکمہ اطلاعات کے کنٹری پبلک افیئر آفیسر بیری واکلے انتہائی تفصیل سے بتا رہے ہیں کہ یہ ساتواں ٹریولنگ سیمینار ہے۔ لیکن پہلی بار یہ زیادہ موثر اور نتیجہ خیز طریق کار کے تحت ہورہا ہے۔ پہلے سیمینار میں مختلف پیشوں اور حلقوں سے وابستہ لوگ آتے رہے ہیں۔ اس بار یو ایس آئی ایس اسلام آباد میں ٹریک ٹو ڈپلومیسی کی ان کوششوں میں عام نشستیں اور ٹاؤن میٹنگیں بھی رکھی گئی ہیں جن میں ماہرین۔ ریٹائرڈ سفارت کار۔ جنرل بھی شرکت کررہے ہیں۔ اس لیے اب یہ دائرہ کار پہلے سے زیادہ وسیع اور بامعنی ہوچکا ہے۔ آج بھی مختلف شعبوں سے وابستہ خواتین وحضرات کو دعوت دی گئی ہے۔ پہلے چھ سیمیناروں میں تجارت، معیشت، سیاحت، خاندانوں کا ملن، سیکورٹی دفاع، ایٹمی اسلحے کی تخفیف کے موضوعات کا سنجیدگی سے احاطہ کیا گیا ہے۔

آرتھر چیرٹی نے پبلک جرنلزم کے حوالے سے اس سیمینار کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر انھوں نے بحث کا سلسلہ شروع کروادیا ہے۔ پاکستانی اور بھارتی شرکاء نے پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود تمام

تنازعات پر اپنے اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ سامعین نے بھی بھرپور مقررین سے۔ سیمینار کے شرکاء سے سوالات کیے ہیں۔ جن میں زیادہ تر کشمیر کے تنازعے سے متعلق ہیں۔ بعض سامعین اپنا تعارف بہت طویل کر دیتے ہیں۔ سوال کی بجائے تقریر کر ڈالتے ہیں۔ امریکی سفارت خانے کے انفارمیشن آفیسر پیٹر کلاین نے سفری سیمینار کے اغراض و مقاصد اور فوائد بیان کیے ہیں۔ آرتھر چیرٹی آج کی بحث کو سمیٹ رہے ہیں۔ آج کی بحث مختلف سمتوں میں رواں رہی ہے۔ یہ رجحانات اور اندازے سامنے آئے ہیں۔

۱۔ سیمینار کے ذریعے جس مکالمے اور رابطے کا آغاز ہوا ہے۔ اس کو جاری رکھنے کے کیا منصوبے ہیں۔ اس کے نتائج اور ثمرات عام لوگوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

۲۔ پاکستان اور بھارت کے بعض کالم نویس۔ اداریہ نگار مسائل کے حل کی نشاندہی سے پہلو تہی کے لیے ایسے لکھتے ہیں۔ جیسے ان کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جیسے وہ پاکستانی یا بھارتی قارئین کے لیے نہیں کسی اور ملک کے قارئین کے لیے لکھ رہے ہیں۔

۳۔ صحافیوں سے یہ توقع درست نہیں ہے کہ وہ صرف واقعات کی معروضی رپورٹنگ کریں۔ وہ نظریہ ساز بھی ہیں۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ پاکستان اور بھارت کے صحافیوں کے لیے تو یہ دلیل اور بھی وزنی ہے کیوں کہ یہاں کی مخصوص فضا میں کوئی صحافی بھی صرف معروضی رپورٹنگ نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کا تعلق پاکستان سے ہو یا بھارت سے۔

۴۔ سامعین اور شرکاء دونوں کے درمیان بحث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جنوبی ایشیا کو درپیش کشمیر جیسے دیرینہ اہم اور حساس مسائل پر زیادہ تر سوچنے کا انداز قدیم ہے گھسا پٹا ہے۔ جب کہ بدلتی ہوئی عالمی فضا میں ان مسائل کے حل کے لیے اب نئے خیالات درکار ہیں مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نئے خیالات اور نئی طرز فکر کہاں سے آئے گی۔

۵۔ یہاں بھی بار بار یہ نکتہ زیر بحث آتا رہا کہ دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے اخبارات و رسائل دستیاب ہونے چاہئیں۔

۶۔ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان کافی معقول رابطہ نہیں ہے۔

۷۔ تجارت میں اضافے کے لیے بھی تجاویز آئیں۔

۸۔ سفری سیمیناروں میں پبلک کی شرکت یقینی بنانے سے دونوں طرف کے دانشوروں اور صحافیوں کی سوچ عام لوگوں تک پہنچ سکے گی۔ اس لیے ان سیمیناروں کی کارروائی کو خفیہ نہ رکھا جائے۔

۹۔ تعمیر قوم کے نام پر تاریخ کو مسخ نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں طرف ایسا ہو رہا ہے۔

۱۰۔ اخبارات جب تک دونوں ملکوں میں دستیاب نہیں ہیں۔ یو ایس آئی ایسا انتظام کرے کہ ایڈیٹرز کالم نویس ایک دوسرے کے کالم۔ اداریے روزانہ پڑھ سکیں۔ اس سے ان کی اپنی تحریر میں معروضیت پیدا ہوگی۔

۱۱۔ حکومتوں اور عوام کی سوچ اور نقطہ نظر میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے میڈیا کو چاہیے کہ وہ اس فرق کو واضح کرے۔

شام کا استقبالیہ بیری واکلے کی رہائش گاہ پر ہے۔ بہت سے پرانے رفقا سے ملاقات رہتی ہے۔ دانشور، ادیب، صحافی، سیاسی، اقتصادی ماہرین سب ہی موجود ہیں۔ رہائش گاہ میں پینٹنگز کا انتخاب بہت متاثر کر رہا ہے۔

آج کی بحث نے معاملات کو اور واضح کیا ہے۔ کل کراچی روانگی ہے۔ جہاں 'جنگ فورم' میں 'تنازعے کا تصفیہ کیسے' پر کھل کر بحث ہوگی۔

۲۷ فروری ۱۹۹۷ء

اپنے شہر میں ایک مسافر کی حیثیت سے واپسی ہے۔ ہوٹل میں بھی کمرہ ہے۔ لیکن گھر پیارا گھر۔ 'جنگ فورم'۔ موضوع 'تنازع کے تصفیے میں میڈیا کا کردار' ہے۔ ایک دوورقہ بتا رہا ہیں۔ جسے ٹی وی چینلوں نے سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ روزانہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو جان رہے

ہیں۔ یہ رابطے سرکاری تعلقات اور ڈپلومیسی سے زیادہ موثر ہو رہے ہیں۔ اس لیے ٹریک ٹو ڈپلومیسی زیادہ کارگر ہو رہی ہے۔ امریکی محکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام پاکستان اور بھارت میں ٹریولنگ سیمینار اس سلسلے کی کڑی ہے۔ یہ پروگرام ۱۹۹۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور اس نے مختلف موضوعات پر دونوں متحارب ملکوں کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد اور حلقوں کو قریب تر لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

آج مجھے دس منٹ تک اظہار خیال کرنا ہے۔ ہوم گراؤنڈ پر کھیلنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اسلام آباد سے کراچی سفر کے دوران میں نے گزشتہ دو دنوں کی بحث کی روشنی میں کچھ خیالات ترتیب دے لیے ہیں۔ لیکن جہاز سے اترتے وقت وہ اسی میں بھول گیا ہوں۔ اب پریشانی ہے۔ پی آئی اے کے شعبہ تعلقات عامہ کے چوہدری بشیر احمد یاد آ رہے ہیں۔ انھیں فون پر زحمت دی ہے ہمیشہ کی طرح انھوں نے مشکل آسان کر دی ہے۔ کاغذات مجھے فورم کے آغاز سے پہلے ہی مل گئے ہیں۔

شہر کی مختلف شخصیتیں موجود ہیں۔ کچھ یو ایس آئی ایس اور کچھ 'جنگ' کے حوالے سے مدعو کی گئی ہیں۔ ان میں وکلا بھی ہیں۔ سیاست دان بھی۔ اساتذہ بھی۔ دانشور بھی سب وطن کا درد رکھتے ہیں۔

سیمینار کے شرکا اب چند روز کی بحث کے بعد اگرچہ ایک ٹیم بن چکے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے تعصبات میں کوئی زیادہ کمی نہیں آئی ہے۔ کشمیر کے مسئلے پر بھارتی مندوبین کچھ زیادہ لچک کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ واپس اپنے انہی لوگوں میں جانا ہے۔ وہاں کیا جواب دیں گے، اس کے لیے بڑی ہمت چاہیے۔ اسی ڈر اور سمجھوتے میں پورے ۵۰ سال گزر رہے ہیں۔

زیادہ تر شرکا اور سامعین کا زور اس پر ہے کہ تاریخ کو مسخ نہ کیا جائے۔ اخبارات و رسائل کا آپس میں تبادلہ ہونا چاہیے۔ ویزے کی شرائط کم سے کم کی جائیں۔ جنوبی ایشیا کے مسائل پر لکھتے ہوئے دونوں طرف کے اخبار نویس، کالم نگار، ایڈیٹوریل رائٹرز، خود ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں۔

کراچی جنوبی ایشیا میں صنعت و تجارت کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اس لیے یہاں یہ بھی بار بار کہا جا رہا ہے کہ دونوں ملکوں کے تاجروں صنعت کاروں کے درمیان روابط بڑھنے چاہئیں۔ ٹی وی چینلوں پر بزنس حلقوں کے درمیان مذاکرات ہونے چاہئیں۔

یہ بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ سیمینار کے فالو اپ کے لیے دونوں ملکوں میں 'رابطہ کمیٹیاں' تشکیل دی جائیں۔ جن کے مراکز ایک طرف لاہور، کراچی، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ میں دوسری طرف دہلی، بمبئی، کلکتہ، چندی گڑھ، مدارس اور لکھنؤ میں قائم ہوں۔

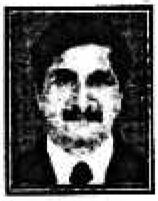
معاملات کو زیادہ باقاعدہ شکل دینے کے لیے کمیٹی کے ارکان دونوں ملکوں میں مالکان اخبارات و رسائل کی نمائندہ، انجمنیں اور اسی طرح دونوں طرف کی صحافیوں کی انجمنیں نامزد کریں۔ اور موجودہ سابقہ سیمیناروں کی رپورٹیں کتابی شکل میں تیار کی جائیں اور دونوں ملکوں کے بڑے اخباروں، رسالوں اور چینلوں کے ایڈیٹروں، نیوز ایڈیٹروں، اہم کالم نویسوں کو فراہم کی جائیں۔ یہ رابطہ کمیٹیاں سال بھر دونوں ملکوں کے میڈیا کے درمیان فعال واسطہ رکھیں۔ مختلف اخبارات اور چینلوں کے مذاکروں، خبروں، اداریوں سے متعلقہ تراشے اہم اخبارات کو فراہم کرتے رہیں۔

یو ایس آئی ایس نے جس طرح یہ پہل کی ہے۔ وہ اس طرح ایک پل کا کردار ادا کرتی رہے۔

شام کا استقبالیہ امریکی محکمہ اطلاعات کی ڈائریکٹر پیٹریشا شارپ کی رہائش گاہ پر ہے۔ اس کے بعد عشائیہ سندھ اسمبلی کے ارکان غلام قادر پلیجو اور اقلیتی ممبر دمہر ول جاگوانی کی طرف سے ہے۔ جہاں محفل رقص و نغمہ بھی ہے۔ رقص اس قدر دلربا ہیں کہ ہمارے کچھ سیمینار ی شرکا بھی محو رقص ہو گئے ہیں۔ سید جاوید اقبال اسے ٹریک تھری ڈپلومیسی کہہ رہے ہیں۔ خاتون شرکا بھی لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ اگلی صبح روانگی ہے۔ پاکستان کے حصے کا سفری سیمینار انجام کو پہنچ رہا ہے۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز رُوداد اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

حسرتِ ناتمام!



ممتاز احمد

اُس دوشیزہ کی زندگی، ایک حسرت ناتمام بن کر رہ گئی تھی
وہ آج بھی ایک اسپتال میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جی رہی ہے

میرے والدین کی دو اولادیں ہیں ایک میں یعنی مسرت اور مجھ سے بڑا بھائی دلاور۔ ہماری رہائش عنایت پور گاؤں میں تھی۔ میرے ابو اپنے والدین (میرے دادا، دادی) کی اکلوتی اولاد تھے۔ تو اِسی وجہ سے دادا کو میرے ابو سے بہت پیار تھا۔ گاؤں میں دو مربعے زمین تھی اور کاشتکاری کے لیے اور زمینوں پر کام کے لیے مزارعے رکھے ہوئے تھے۔ زندگی بہت خوش حالی سے گزر رہی تھی۔ بڑا سا گھر تھا اور گھر میں بھی کام کاج کے لیے نوکرانیاں تھیں۔ میرے ابو کو گھڑسواری کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ نیزہ بازی اور گھڑسواری میں بہت مشاق تھے۔ انھوں نے کئی قسم کے گھوڑے پال رکھے تھے۔ ہر سال نیزہ بازی اور گھڑدوڑ میں باقاعدگی سے حصہ لیتے اور انعام جیت کر آتے۔ میرے ابو انتہائی خوب صورت گورے چٹے لمبے قد کے ساتھ وجیہہ جوان تھے۔ اِنتہائی رعب دار شخصیت کے مالک تھے وہ ہمیشہ بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی شلوار پہنتے۔ مجموعی طور پر وہ مردانہ وجاہت کا عملی نمونہ تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں ابو کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتیں اور ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ ابو کی دلہن بنے۔ مگر ابو کسی کو بھی گھاس نہ ڈالتے تھے۔ میری امی ساتھ والے گاؤں مٹھ پنڈ کے چوہدری نوازش کی بیٹی تھیں۔ امی کے حسن اور جوانی کا بھی خوب چرچا پورے گاؤں میں تھا۔ چوہدری نوازش بھی نیزہ بازی اور گھڑدوڑ کے بہت دلدادہ تھے۔ تو یہی وجہ تھی کہ ابو کی دوستی چوہدری نوازش سے ہوگئی حالانکہ اس وقت چوہدری نوازش کی عمر پچاس سال تھی اور ابو صرف بائیس سال کے تھے۔ ابو کا اُن کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ پھر پتا ہی نہ چلا ابو کب امی کی زلف کے اسیر ہوگئے۔ امی نے بھی جب ابو کو دیکھا تو پہلی نظر میں اپنا دل ہار بیٹھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوگئے۔

نانا جان ایک جہاندیدہ انسان تھے تو اُن کی نظر سے امی ابو کی محبت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ بہت جلد دونوں خاندانوں کی باہمی رضامندی اور مشاورت سے ابو کو چوہدری نوازش کے داماد کا مقام مل گیا۔ امی ابو کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، پانچ روز تک شادی کی تقریبات چلتی ہیں۔

شادی کے امی ابو کی محبت اور بڑھ گئی اور عشق میں بدل گئی دونوں یک جان دو قالب تھے۔ پورے گاؤں میں لیلیٰ مجنوں کے نام سے مشہور تھے۔ پورے گاؤں میں اُن کی محبت کے چرچے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اُن کا پیار مثالی تھا۔

شادی کے ایک سال بعد دلاور بھائی پیدا ہوئے اور

تین سال بعد میری پیدائش ہوئی۔ میرے امی ابو کے ہاں اور کوئی اولاد نہ ہوئی۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا امی ابو کی محبت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ شہر میں ہر سال میلہ منڈی لگتی تھی جس میں دیگر رنگارنگ پروگراموں کے ساتھ نیزہ بازی اور گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے تو ابو ہر سال باقاعدگی سے ان مقابلوں میں حصہ لیتے تھی اور شرکت کے لیے دوماہ پہلے بھرپور تیاری شروع کر دیتے۔ چنانچہ



اس سال بھی ماہ اپریل میں میلہ منڈی کا انعقاد ہوا تو ابو مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اپنے ملازموں اور گھوڑوں کے ساتھ شہر گئے مگر یہ مقابلہ ان کی زندگی کا آخری مقابلہ ثابت ہوا تھا۔ ہوا یہ کہ ابو کا گھوڑا میدان میں سر پٹ بھاگ رہا تھا اور انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتے دوڑتے سب سے آگے جا رہا تھا کہ اچانک اُن کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ جس کے نتیجے میں گھوڑے کے ساتھ ہی ابو بھی بری طرح زمین پر گر پڑے اور پیچھے سے آنے والے تیز رفتار گھوڑوں نے انھیں روند ڈالا۔ آناً فاناً ابو کی موت واقع ہوگئی۔

ابو کی جب خون میں لت پت رندھی ہوئی لاش گھر میں آئی تو ان کی میت کو دیکھتے ہی امی کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ چکرا کر زمین پر گر گئیں۔ اور گرتے ہی ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

جب دو جنازے اکٹھے اٹھائے گئے تو پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہمارے دادا، دادی اس صدمے سے نڈھال ہو گئے تھے اُن کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ اس وقت دلاور کی عمر پندرہ سال اور میری بارہ سال تھی۔ اب دادا دادی نے ہماری پرورش شروع کر دی۔

کہتے ہیں اولاد کی اولاد بہت پیاری اور محبوب ہوتی ہے تو یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں بہن بھائی دادا دادی کی آنکھوں کے تارے بن گئے۔ دوسرا یہ کہ ہم بچپن میں یتیم ہو گئے تھے تو ہمارا بہت خیال رکھا جاتا، ناز نخرے اٹھائے جاتے کہ ہمیں ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہو۔

جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو ایک دن دادی بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ اس وقت میں نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی، گو کہ گھر میں کام کاج کے لیے نوکرانیاں موجود تھیں۔ مگر اب گھر کو میں نے سنبھالنا تھا۔ چنانچہ میں نے گھر داری کی ذمہ داری سنبھالنے شروع کر دیں۔ اسکول بھی باقاعدگی کے ساتھ جاتی اور گھر کے کام کاج میں بھی حصہ لیتی اور اس طرح گرتے پڑتے میں نے میٹرک کر لیا۔ دلاور تو مڈل کے بعد ہی اسکول کو خیر آباد کہہ چکا تھا۔ اس کا زیادہ وقت آوارہ گردی میں گزرتا۔ دراصل دادا، دادی کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔

اب وہ اٹھارہ سال کا جوان تھا، کسی کو خاطر میں نہ لاتا، بُرے دوستوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا، جس کی وجہ سے اس کی عادتیں بہت خراب ہوگئی تھیں۔ کام کاج کرنے کی بجائے اس نے بُرے مشاغل اختیار کر لیے تھے۔

اس نے دادا کی زندگی میں ہی کسی نہ کسی طریقے ساری زمین اپنے نام کروائی تھی اور رفتہ رفتہ آدھی سے زیادہ زمین بیچ دی اور رقم اپنی عیاشیوں کی نظر کر دی۔ دادا جان بہت پریشان رہنے لگے۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ دلاور سدھر جائے مگر وہ سدھرنے کی بجائے دن بدن بگڑتا گیا۔ ایک تو دادا جان بہت بوڑھے ہو گئے تھے، دوسرا جواں سال بیٹے اور بہو کی اچانک موت سے اُن کو بہت صدمہ ہوا تھا، تیسرا دادی جان بھی ان کو چھوڑ گئی تھیں اور چوتھا دلاور کی بے راہ روی اور زمین کے بک جانے کا ان کو بہت غم تھا تو وہ بے چارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے اور بیمار رہنے لگے۔

دلاور کئی کئی دن گھر نہیں آتا تھا ہم اس کی راہ دیکھتے رہتے۔ میٹرک کے بعد میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب کچھ دنوں سے مجھے بخار رہنے لگا تھا۔ پہلے تو گاؤں کے حکیم سے علاج ہوتا رہا مگر آرام نہ آیا۔ پھر گاؤں کے ڈسپنسر (کمپوڈر ڈاکٹر) کا علاج شروع ہوا۔ اس کی دوا سے وقتی طور پر بخار اُتر جاتا مگر پھر بخار شدت اختیار کر جاتا۔ جب کوئی افاقہ نہ ہوا اور بخار کے ساتھ اب میرے جوڑوں میں بھی درد شروع ہو گیا۔ جسم بہت کمزور ہو گیا تو ڈسپنسر نے مشورہ دیا کہ مریضہ کو شہر کے بڑے ہسپتال میں لے جائیں چنانچہ اگلے روز دادا جان مجھے اپنے ساتھ شہر لے جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔

ریلوے اسٹیشن ہمارے گاؤں عنایت پور سے پانچ کلو میٹر دور تھا۔ دادا جان نے شہر کے دو ٹکٹ لیے اور ہم پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین آ گئی تو ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔

ہمارے گاؤں سے شہر کافی دور تھا اور ٹرین پورے پانچ گھنٹے میں شہر پہنچتی تھی۔ گاڑی چل پڑی۔ یہ گاڑی پسنجر ٹرین نہیں ایکسپریس ٹرین تھی۔ ہر اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی کوئی بڑا اسٹیشن آتا تو دو یا تین منٹ کے لیے رکتی اور پھر چل پڑتی۔ مجھے کچھ بھوک لگ رہی تھی اور بوتل پینے کو بھی دل کر رہا تھا تو میں نے دادا جان سے فرمائش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکے گی تو وہ میرے لیے بوتل اور کھانے کی کوئی چیز لا دیں گے۔

ٹرین کو ہمارے گاؤں عنایت پور سے چلے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ ابھی پورے دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ گاڑی اپنی رفتار سے منزل کی طرف گامزن تھی۔ بہار کا موسم تھا کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ جو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مجھے اونگھ آنے لگی تو میں اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ سوتی رہی۔ جب اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھا بہت سارے مسافر کمپارٹمنٹ میں نہیں تھے اور دادا جان بھی سیٹ پر موجود نہیں تھے۔ میں سمجھی شاید واش روم گئے ہوں۔ ٹرین تیز رفتاری سے چل رہی تھی جب کافی دیر کے بعد دادا جان نہیں آئے تو میں نے جا کر واش روم دیکھا تو وہ خالی تھا پھر پورے ڈبے کا چکر لگایا مگر دادا جان کہیں نظر نہ آئے تو میں نے اپنی سیٹ کے قریب بیٹھے ایک مسافر سے دادا جان کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ پچھلے اسٹیشن پر جب ٹرین رکی تھی تو تمہارے دادا جان دوسرے مسافروں کے ساتھ نیچے پلیٹ فارم پر اترے تھے مگر واپس نہیں آئے اس نے سمجھا تھا کہ انھوں نے یہیں اُترنا تھا۔ میں نے جب یہ سنا تو میرے ہوش اُڑ گئے اور میں سخت پریشان ہو گئی۔ جب میں سو رہی تھی تو مجھے پتا ہی نہ چلا کب کوئی اسٹیشن آیا اور گاڑی رکی تو دادا جان نیچے

اُترے۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کوئی چیز کھانے اور بوتل کی فرمائش کی تھی تو یقیناً دادا جان وہی لینے کے لیے نیچے اُترے ہوں گے۔ مگر اب پریشانی یہ تھی کہ وہ واپس کیوں نہیں آئے......

میرا تو سخت دل گھبرانے لگا کہ اب کیا بنے گا میرے پاس تو ایک روپیہ بھی نہیں تھا اور ٹکٹ بھی دادا جان کے پاس تھے۔ اب میں کہاں جاؤں گی، کیا ہوگا اب؟

انہی سوچوں اور گھبراہٹ میں میرے آنسو نکل آئے۔ میں گم صم اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور آہستہ آہستہ ایک اسٹیشن پر رک گئی مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ دادا جان غلطی سے کسی دوسرے ڈبے میں نہ بیٹھ گئے ہوں۔ اب ٹرین رکی ہے تو شاید وہ آجائیں میں اُن کا انتظار کرنے لگی۔ مگر دادا جان تو نہیں آئے البتہ اس ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب آگئے اور ڈبے میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میرے پاس آکر رک گئے اور مجھ سے پوچھا کہ بیٹی آپ کا نام مسرت ہے؟ پہلے تو میں چند لمحوں کے لیے ڈر گئی جب ان کی طرف دیکھا تو وہ ریلوے کے سرکاری یونیفارم میں تھے اور ان کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس پچپن لگایا تو میں نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ جی میرا نام مسرت ہے۔

اس پر انھوں نے پوچھا کہ بیٹی آپ کہاں سے آرہی ہو تو میں نے بتایا کہ عنایت پور سے آرہی ہوں۔ تو وہ کہنے لگے بیٹی تمہارے دادا جان پچھلے اسٹیشن پر رہ گئے ہیں اور ان کے سوار ہونے سے پہلے گاڑی چل پڑی تھی تو وہ بہت پریشان اور فکرمند ہیں اور پچھلے ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب کے دفتر میں بیٹھے ہیں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب نے مجھے فون کر کے بتایا ہے۔ میرا نام انور ہے اور میں یہاں کا اسٹیشن ماسٹر ہوں تو بیٹی گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تو آپ میرے ساتھ آجاؤ۔

پھر انھوں نے میرا بیگ اٹھایا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنے دفتر میں لے آئے۔ جس ٹرین سے میں اُتری تھی اس کو انھوں نے روانہ کر دیا۔ اور ساتھ ہی پچھلے ریلوے اسٹیشن ماسٹر کو فون کیا اور بتایا کہ مسرت بیٹی کو میں نے ٹرین سے اُتار لیا ہے اور وہ میرے پاس بیٹھی ہے۔ اور میری بات دادا جان سے کروائی تو دادا جان نے مجھے تسلی اور دلاسہ دیا کہ پریشان نہیں ہونا تم انور صاحب کے ساتھ ان کے گھر چلی جاؤ۔ وہ بھی صبح آجائیں گے کیونکہ اب آنے کے لیے یہاں سے کوئی بس، ویگن یا ٹرین نہیں ملے گی تو وہ کل صبح پہلی ٹرین سے پہنچ جائیں گے۔

اس طرح انور صاحب مجھے اپنے گھر لے آئے کیونکہ پچھلے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب نے انور صاحب کو ٹرین پہنچنے سے پہلے فون کر دیا تھا کہ مسرت نامی جوان لڑکی ٹرین میں تنہا رہ گئی ہے۔ اس کے دادا ٹرین میں سوار نہیں ہو سکے تو وہ مسرت کو اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ اسی طرح دادا جان کو وہ اسٹیشن ماسٹر صاحب اپنے گھر لے گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ انور صاحب اس ریلوے اسٹیشن پھول نگر کے اسٹیشن ماسٹر تھے۔ پھول نگر ایک قصبہ تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر انور صاحب کا گھر تھا۔ جب میں انور صاحب کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو ان کی بیوی اور تین بیٹیوں نے بڑی حیرانگی کے ساتھ دیکھا تو انور صاحب نے فوراً مختصر طور پر انھیں میرے بارے میں بتا دیا۔

اس پر ان کی بیوی آنٹی جمیلہ نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ان کی تینوں بیٹیوں نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور مجھے کمرے میں بٹھا کر چائے پانی پلایا۔ انور انکل کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی تو وہ بھی یونیفارم تبدیل کر کے کمرے میں آگئے۔ انکل انور کی صرف تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی شکیلہ میری ہم عمر تھی اس سے چھوٹی شگفتہ تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام انیلا تھا۔

باتیں شروع ہوئیں تو میں نے انھیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ دادا جان کے ساتھ علاج کے لیے شہر جا رہی تھی۔ آنٹی جمیلہ میرے ساتھ ہی بیٹھی تھیں تو انھوں نے بڑے پیار سے مجھے اپنے ساتھ لگایا اور کہنے لگیں کہ مسرت بیٹی اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ بالکل بھی پریشان نہیں ہونا۔ جب انھوں نے مجھے چھوا تو میرا جسم بہت گرم تھا تو وہ کہنے لگی۔

ارے تمھیں تو بہت تیز بخار تھا۔ اوہ ہو چلو بیٹی لیٹ

جاؤ اور پوچھا کہ کوئی میڈیسن پاس ہے؟ تو میں نے کہا۔
آنٹی تقریباً ایک ماہ سے بخار جان نہیں چھوڑ رہا اسی کے علاج کے لیے ہی تو شہر جا رہی تھی۔ فی الوقت میرے پاس تو کوئی میڈیسن نہیں ہے۔
اس پر وہ بہت فکر مند ہوئیں اور انکل انور سے کہنے لگیں کہ پتا کریں ڈاکٹر ابوذر کا کلینک کھل گیا ہوگا۔ اس سے بچی کی دوا لے آئیں۔ تو انکل کہنے لگے کہ ابھی ٹیلی فون کرتا ہوں۔ جب انھوں نے فون کر کے میری کیفیت بتائی تو ڈاکٹر ابوذر نے کہا کہ مریضہ کو کلینک پر لے آئیں۔ چیک اَپ کے بعد میڈیسن دوں گا۔
چنانچہ آنٹی جمیلہ اور انکل انور نے مجھے اپنے ساتھ لیا ایک ٹانگے پر بٹھا کر کلینک لے گئے۔ ڈاکٹر ابوذر نے بغور تفصیلی چیک اَپ کیا۔ بخار کی ہسٹری اور دیگر علامات پوچھیں تو کہنے لگا کہ بخار پرانا ہے کچھ ٹیسٹ کروانے پڑیں گے۔
ڈاکٹر صاحب نے پرچی پر ٹیسٹ لکھ کر دیے اور لیبارٹری میں بھیج دیا جہاں سرنج کے ذریعے میرا خون کا نمونہ لیا گیا اور کہا گیا کہ رپورٹ کل ملے گی۔ تو ڈاکٹر ابوذر نے وقتی آرام کے لیے ایک انجکشن لگایا اور کھانے کے لیے میڈیسن دی اور اگلے دن رپورٹ لے کر آنے کا کہا تو انکل اور آنٹی مجھے گھر لے آئے۔
میں نے ہلکا پھلکا کھانا کھا کر میڈیسن کھائی تو تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔
صبح جاگی تو طبیعت کچھ بہتر محسوس ہوئی۔ صبح دس بجے دادا جان بھی پھول نگر پہنچ گئے تو انکل انور انھیں بھی گھر لے آئے۔
میں دادا جان کے گلے لگ کر رونے لگی کہ آپ کدھر رہ گئے تھے تو انھوں نے پہلے مجھے چپ کروایا۔ اور بتایا کہ تم ٹرین میں سو گئی تھیں۔ تو ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تمھیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور تمہارے لیے بوتل اور کچھ کھانے کی کوئی چیز لینے کے لیے ٹرین سے اتر کر ریلوے اسٹیشن سے باہر آیا۔ جب دکان پر پہنچا تو مجھے اچانک چکر آئے تو میں گر گیا دکاندار نے مجھے فوراً پانی پلایا تو کچھ طبیعت سنبھلی اس نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ جب چکر آنے بند ہوئے تو میں نے تمہارے لیے بوتل اور کچھ پھل لیے اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر آیا تو دیکھا ٹرین جا چکی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تو بہت پریشان ہو گیا۔ پھر اس اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب سے ملا تو انھوں نے مجھے تسلی دی اور بتایا کہ اب وہ ٹرین پھول نگر ریلوے اسٹیشن پر رکے گی تو میں اس کے اسٹیشن ماسٹر انور صاحب کو فون کر دیتا ہوں۔ پھر مجھ سے ٹرین کی بوگی، سیٹ اور تمہارا حلیہ پوچھا تو اس طرح جب انور صاحب نے تمہاری مجھ سے ٹیلی فون پر بات کروائی تو مجھے حوصلہ ہوا تو اب پہلی ٹرین سے یہاں پہنچ گیا ہوں۔
آنٹی جمیلہ نے دادا جان کو چائے وغیرہ پلائی اسی اثناء میں انکل انور لیبارٹری سے میرے بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ بھی لے آئے تو میں، دادا جان اور انکل انور ڈاکٹر ابوذر کے کلینک پر پہنچے۔
ڈاکٹر نے رپورٹ دیکھ کر بتایا کہ مناسب علاج اور تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے بخار بگڑ گیا ہے اور ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔ جس کا کم از کم چودہ دن لگاتار علاج ہوگا اور بلا ناغہ میڈیسن کھانی ہوگی۔ ہلکی غذا کھانی ہے اور دو ہفتے مکمل ریسٹ کرنا ہے اور ایک ہفتے کے بعد دوبارہ چیک اپ کے لیے آنا ہے۔ ڈاکٹر نے دوا کا نسخہ لکھ دیا۔
اس کے بعد دادا جان نے اپنے سر چکرانے کا بتایا تو ڈاکٹر نے ان کا بلڈ پریشر چیک کیا اور بتایا کہ آپ کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہے جس کی وجہ سے آپ کو چکر آتے ہیں۔ دادا جان کو بھی دوا لکھ دی کہ روزانہ بلا ناغہ کھانی ہے۔ انکل انور نے بتایا کہ ڈاکٹر ابوذر بہت سیانا، ہمدرد اور اچھا ڈاکٹر ہے اب اسی کا علاج شروع کر دیں آپ کو شہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
انکل انور نے ہمیں دوپہر کا کھانا کھلایا دادا نے ان کے پورے گھر کا شکریہ ادا کیا سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کے گھر سے بہت اپنائیت، پیار اور خلوص ملا۔ ان کی سب سے بڑی بیٹی شکیلہ تو میری سہیلی بن گئی۔ ایک تو وہ میری ہم عمر تھی دوسرا بہت سلجھی ہوئی نرم و نازک سی بہت پیاری تھی۔ پورا گھرانا بہت اچھا تھا ہم ان کے حسن سلوک اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے، کھانے کے بعد ان سے واپسی کی اجازت چاہی تو انکل انور نے تاکید کی کہ ہفتے بعد لازمی چیک اَپ کروانا ہے۔ دادا جان نے وہیں سے

اپنی اور میری میڈیسن خرید لی۔
انکل انور نے ہمیں دوپہر والی ٹرین میں بٹھادیا تو شام تک ہم گھر پہنچ گئے۔

☆☆☆

ہم دادا پوتی نے ڈاکٹر کے نسخے کے مطابق میڈیسن کھانی شروع کردی۔ ایک ہفتے کے علاج سے مجھے بہت افاقہ ہوا۔ میری صحت بحال ہوگئی۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق ہم دادا پوتی دوبارہ پھول نگر گئے۔ ڈاکٹر نے تسلی سے ہمارا چیک اپ کیا۔ آج میں نے ایک خاص بات نوٹ کی وہ یہ کہ ڈاکٹر ابوذر مجھ پر کچھ زیادہ ہی توجہ دے رہا تھا۔ اس کا پُراشتیاق اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھنا اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ مجھے کچھ اچھا بھی لگ رہا تھا اور میں شرما بھی رہی تھی۔ ڈاکٹر ابوذر نے دادا جان کا بھی بغور حال پوچھا اور ان کا تفصیلاً معائنہ کیا۔ انھیں دوا مستقل جاری رکھنے کی ہدایات دیں۔ اسی طرح مجھے بھی مزید ایک ہفتہ بلا ناغہ دوا کھانے کی تاکید کی اور اگلے ہفتے پھر آنے کو کہا۔ ہم انکل انور کے گھر آگئے تو پورے گھرانے نے ہمیں رات رہنے کے لیے روک لیا۔

مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر ابوذر پیار بھری نظروں سے مجھے کیوں بار بار دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے قدآدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے آپ کو دیکھا تو مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ میرے والدین دونوں ہی بے انتہا خوب صورت تھے تو خوب صورتی اور حسن مجھے بھی وراثت میں ملا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک حسن کا مجسمہ تھی۔ مجھ پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی تو ڈاکٹر ابوذر کا پیار سے مجھے دیکھنا بجا تھا۔

رات گیارہ بجے تک ہم جاگتے رہے۔ آنٹی جمیلہ، شکیلہ، شگفتہ اور انیلا سے خوب باتیں اور ہنسی مذاق ہوتا رہا جب میں سونے کے لیے لیٹی تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ڈاکٹر ابوذر کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ڈاکٹر ابوذر کی عمر ستائیس سال تھی گھنگریالے بال گورا رنگ لمبا قد خوب صورت نین نقش بلاشبہ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ اوپر سے اس کا اچھا اخلاق، میٹھے لہجے میں بات کرنا یہ سب کچھ میرے دل کو بھا گیا تھا۔ رات سوتے جاگتے گزری۔

صبح ہوئی سب نے مل کر ناشتا کیا آج واپس گھر جانا تھا مگر میرا گھر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ آج پھر ڈاکٹر ابوذر کو دیکھوں۔

جب دادا جان نے واپسی کے لیے کہا کہ تیاری کرو تو میں نے بہانہ بنایا کہ پیٹ میں درد شروع ہوگئی ہے اور جھوٹ موٹ درد کی اداکاری شروع کردی تو دادا جان فکر مند ہوگئے۔ چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ شام کو ڈاکٹر ابوذر کے کلینک مسرت کو لے کر جائیں گے۔

ڈاکٹر ابوذر دن کو ساتھ والے شہر کے سرکاری ہسپتال میں بطور میڈیکل آفیسر ڈیوٹی کرتے تھے۔ اور شام کو پھول نگر میں اپنے پرائیویٹ کلینک میں مریضوں کا علاج کرتے تھے۔

الغرض شام کو دادا جان مجھے اس کے کلینک لے گئے تو مجھے دیکھ کر ڈاکٹر ابوذر کھل اٹھے۔ دادا جان نے اسے بتایا کہ مسرت کے پیٹ میں درد شروع ہوگیا ہے۔ جب ڈاکٹر مجھے کاؤچ پر لٹا کر اسٹیتھو اسکوپ سے چیک اپ کیا تو اسے اندازہ ہوگیا کہ مجھے درد نہیں ہے۔

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے مسکرا کر کہا۔ صبح تو تھا درد مگر اب پتا نہیں کیوں ٹھیک ہوگیا ہے۔

اس پر ڈاکٹر ابوذر نے بھی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اوکے کوئی بات نہیں میں سمجھ گیا ہوں۔

چنانچہ اس نے بتایا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اصل میں بخار کی جو دوا کھا رہی ہیں ہوسکتا ہے اس کی وجہ سے درد ہوگیا ہو۔

اس نے نسخے میں ایک گولی کا نام لکھ کر دیا اور کہا کہ اگر دوبارہ درد ہو تو یہ گولی کھالیں۔

اگلے دن میں دادا جان کے ساتھ واپس اپنے گاؤں عنایت پور آگئی۔

☆☆☆

پلک جھپکتے ہی ہفتہ گزر گیا۔ میں نے چودہ دن مسلسل میڈیسن کا کورس کیا اب میں مکمل طور پر صحت یاب تھی۔ دادا جان کو کچھ ضروری امور نپٹانے تھے تو اس بار اُن کی جگہ بھائی دلاور میرے ساتھ آیا۔ حسب معمول ہم ریلوے ٹرین کے ذریعے پھول نگر پہنچے۔ اسٹیشن پر

اُتر کر سیدھے انکل انور کے آفس گئے پھر وہ ہمیں ساتھ لے کر گھر آ گئے۔ دلاور بھائی کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور میں آنٹی جمیلہ کے پاس بیٹھ گئی۔

انکل انور، آنٹی جمیلہ اور ان کی تینوں بیٹیاں بہت اچھی تھیں۔ شکیلہ تو میری پکی سہیلی بن گئی تھی۔ باتوں باتوں میں پتا ہی نہ چلا شام ہو گئی تو دلاور بھائی کے ساتھ ڈاکٹر ابوذر کے کلینک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر ابوذر نے بخار وغیرہ چیک کیا اور بتایا کہ مس مسرت اب آپ مکمل صحت یاب ہو گئی ہیں۔ لہٰذا میڈیسن کھانا بند کر دیں۔

میں نے ڈاکٹر ابوذر کا شکریہ ادا کیا کہ میں آپ کے علاج سے ٹھیک ہوئی ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ ادا ہوا کہ آپ تو ٹھیک ہو گئی ہیں مگر مجھے بیمار کر کے جا رہی ہیں۔

میں نے حیرانگی سے پوچھا جی...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

تو اس پر ڈاکٹر نے کہا کہ بہت بڑی مرض میں مبتلا کر دیا ہے میں نے اسے۔

پھر اس نے ایک ملٹی وٹامن کا شربت لکھ کر دیا اور کہا کہ دو یا تین دن روزانہ ایک چمچ پینا ہے اور مجھے فون کر کے بتانا ہے کہ شربت سے کیا اثر ہوا۔ ڈاکٹر کا پی ٹی سی ایل فون نمبر نسخے پر موجود تھا۔

جب میں واپس آنے لگی تو ڈاکٹر بہت اداس لگ رہے تھے۔ جبکہ میں بھی اندر سے اداس ہو رہی تھی۔ ہم انکل انور کے گھر آ گئے اور رات کا کھانا ہم سب نے مل کر کھایا۔

دلاور بھائی بڑے غور سے چوری چوری شکیلہ کو دیکھتے رہے۔

شکیلہ تھی ہی بڑی پیاری نرم و نازک سی کومل سی بہت خوب صورت۔

اگلے دن ہم دونوں بہن بھائی بذریعہ ٹرین واپس اپنے گاؤں آ گئے۔

تین دن کے بعد میں نے اپنے گاؤں کے نمبردار کے گھر سے شام کو ڈاکٹر ابوذر کو فون کیا تو میری آواز سن کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے پوچھا۔

جناب ڈاکٹر صاحب ذرا یہ تو بتائیں کہ میں نے آپ کو کون سے مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔

تو وہ بڑے رومانٹک موڈ میں بولا آپ کی محبت کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ میں آپ کا مریضِ عشق بن گیا ہوں۔ پھر انھوں نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا کہ مس مسرت آپ کو پیٹ درد نہیں تھا تو بہانہ کیوں بنایا تھا۔

اس پر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ آپ کی محبت کا درد تھا۔

یہ سن کر ڈاکٹر کھلکھلا کے ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ اچھا! آگ ہے دونوں طرف برابر لگی ہوئی۔ چنانچہ یہیں سے ہماری محبت کا آغاز ہو گیا۔

اب میں ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی بہانے نمبردار کے گھر جا کر ڈاکٹر ابوذر سے بات کرتی۔ پھر میرے اصرار پر دادا جان نے بھاگ دوڑ کر کے گھر میں ٹیلی فون لگوا لیا تو ساری ساری رات ڈاکٹر ابوذر سے خوب باتیں ہوتیں۔ اکٹھے مرنے جینے کی عہد کیے جاتے اور پھر اسی روٹین میں چھ ماہ گزر گئے۔

اسی دوران میں پانچ چھ بار دلاور بھائی کے ساتھ پھول نگر ڈاکٹر ابوذر کو ملنے گئی۔ ظاہر ہے بیماری کا کوئی نہ کوئی بہانہ بنانا پڑتا تھا۔ اسی عرصے میں دو تین بار انکل انور اور ان کی پوری فیملی بھی ہمارے گھر آ چکی تھی۔

شکیلہ ڈاکٹر ابوذر کے ساتھ میری محبت سے واقف تھی۔ وہ اکثر ڈاکٹر ابوذر کا نام لے کر مجھے چھیڑتی رہتی تھی۔ اِدھر دلاور بھائی بھی شکیلہ کی محبت میں پور پور ڈوب چکے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے رہتے تھے کہ دادا جان کے ساتھ جا کر شکیلہ کا رشتہ مانگو اور اسے اپنی بھابھی بنا لو تو میں کہتی دلاور بھائی شکیلہ تو بی اے پاس ہے اور آپ صرف آٹھ جماعت پاس ہو اور دوسرا کرتے بھی کچھ نہیں ہو۔ سارا دن آوارہ گردی کرتے ہو۔ کئی کئی دن گھر نہیں آتے تو ان حالات میں آپ کو کیسے رشتہ مل سکتا ہے شکیلہ کا......؟ اگر آپ کو شکیلہ پسند ہے تو پہلے اپنی عادتیں درست کرو۔ اپنے آپ کو بدلو۔

پہلے تو بھائی کہتا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے پھر حیرت انگیز طور پر بھائی میں تبدیلی آنی شروع ہو گئی اب وہ روزانہ گھر آنے لگا۔ زمین کے تمام

معاملات دیکھنے لگا۔ آوارہ گردی چھوڑ دی اور کافی سلجھ گیا۔ یہ ساری تبدیلی صرف شکیلہ کو پانے کے لیے تھی۔

ادھر ڈاکٹر ابوذر بھی میرے لیے بہت بے چین رہنے لگے تھے۔ وہ بھی جلد از جلد مجھے اپنا لینا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنے ابو امی کو بھیجو میرا رشتہ مانگنے کے لیے۔

چنانچہ ایک دن انکل انور کا فون آیا کہ ڈاکٹر ابوذر کے والدین عنایت پور آنا چاہتے ہیں۔ تو دادا جان اور بھائی دلاور نے بخوشی انھیں آنے کی اجازت دے دی۔ انھوں نے اتوار کو آنا تھا۔ ان کے آنے سے ایک دن پہلے گھر کی خوب صفائی ستھرائی کی گئی۔ اتوار کو گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر ابوذر کے امی ابو اس کی دونوں بہنیں انکل انور اور آنٹی جمیلہ آ گئے۔ میں بے انتہا حسین و جمیل خوب صورت تو پہلے ہی تھی اوپر سے خاص تیاری، میک اپ وغیرہ نے میرے حسن کو چار چاند لگا دیے۔ مجھے پسند کر لیا گیا ڈاکٹر ابوذر کی امی اور دونوں بہنیں مجھ پر صدقے واری جا رہی تھیں۔ مہمانوں کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ میں یہ بتانا بھول گئی کہ میرے نانا چوہدری نوازش، نانی، ماموں ممانی بھی آئے تھے سب کو یہ رشتہ پسند آیا۔

اب دلاور بھائی بھی زور دینے لگے کہ جلدی سے شکیلہ کا رشتہ بھی مانگا جائے۔ دلاور بھائی کے اطوار کافی بدل گئے تھے۔ اب وہ بہت ذمہ داری سے سب کام کرتا، فصلوں کی کاشت کٹائی وغیرہ کی خود نگرانی کرتا، شہر سے کھاد، بیج، اسپرے وغیرہ خود لے کر آتا تو دادا جان بہت خوش اور مطمئن تھے۔

اب شکیلہ کے رشتے کے لیے اس کا اصرار بڑھنے لگا۔ بالآخر دادا جان راضی ہو گئے۔

کچھ دن کے بعد دادا جان، نانا، نانی اور ماموں ممانی دلاور بھائی کے لیے شکیلہ کا رشتہ مانگنے انکل انور کے گھر گئے تو انھوں نے سوچ بچار اور صلاح مشورے کے لیے تھوڑا ٹائم مانگ لیا۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ دلاور بھائی کا رشتہ انکل انور قبول کر لیں گے۔ اب پروگرام یہ تھا منگنی وغیرہ کرنے کے بجائے ہم دونوں بہن بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی جائے۔

میں تو خوشی سے نہال تھی اور ہواؤں میں اُڑ رہی تھی کہ جسے چاہا تھا وہ ملنے والا تھا کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔

تقدیر ہم پر ہنس رہی تھی۔ ایک دم ہمارے سب خواب چکنا چور ہو گئے۔ ہوا کچھ یوں کہ دلاور بھائی کے کچھ دوست جو بہت لفنگے آوارہ گرد اور بدمعاش تھے انھوں نے ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا۔ بیس لاکھ کی ڈکیتی کی۔ اگلے دن ایک کوٹھی میں رات کو ڈاکہ ڈالا جہاں سے بہت سارا روپیہ اور زیورات لوٹے، خواتین کی بے حرمتی کی اور مزاحمت کرنے پر گھر کے سربراہ اور اس کی جوان بیٹے کو قتل کر دیا۔

اگلی رات وہ ڈاکو بازار حسن میں داد عیش دینے کے لیے چلے گئے اور ایک مشہور طوائف پر خوب نوٹوں کی برسات کی۔ اسے تحفے کے طور پر لوٹے ہوئے زیورات دیے وہاں سے وہ ڈاکو بھائی دلاور کے پاس آئے مگر اسے نہیں بتایا کہ انھوں نے ڈاکے ڈالے ہیں۔ انھوں نے لوٹا ہوا زیور اور پیسوں سے بھرا اٹیچی کیس بطور امانت بھائی کے پاس رکھوایا۔

دلاور بھائی ان سے دوستی ختم کر چکے تھے تو انھوں نے انکار کیا مگر ڈاکوؤں نے پرانی دوستی کا واسطہ دیا۔ منتیں کیں کہ چند دن کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ وہ ڈاکو خود بھی دو تین بھائی کے ڈیرے پر رہنا چاہتے تھے، انھوں نے جھٹ یہ بولا کہ ان کی دشمنی ہے تو وہ دشمنوں سے بچنے کے لیے چند دن رہنا چاہتے ہیں۔ تو بہت منت سماجت کے بعد دلاور بھائی نے بادل نخواستہ انھیں اپنے پاس چند دن ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اُدھر پولیس بڑی مستعدی سے ان ڈکیتوں کا سراغ لگانے میں مصروف تھی۔ کیونکہ دو دن کے اندر بہت بڑی ڈکیتیاں ہوئیں تھیں۔ تمام اخبارات میں ان ڈکیتوں کو اچھالا جا رہا تھا۔ وہ طوائف جس کو ڈاکوؤں نے زیورات دیے تھے وہ بہت گھاگ تھی اسے اندازہ تھا کہ یہ زیورات لوٹ کا مال ہے۔ ان زیورات کی وجہ سے وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے تو اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اسی وقت پولیس سے رابطہ کیا اور سارے زیورات اُن کے حوالے کر دیے۔ پولیس نے وہ تمام زیوران گھر

والوں کو دکھائے جہاں ڈاکوؤں نے ڈکیتی کی تھی تو انھوں نے فوراً پہچان لیے کہ یہ اُن کے ہی زیور ہیں۔ اب پولیس کا کام آسان ہوگیا تھا۔

اس طوائف نے تمام ڈاکوؤں کے حلیے بھی بتا دیے ان میں سے ایک کو وہ ذاتی طور پر بھی جانتی تھی اس کے بارے میں پوری تفصیل بتادی۔ پولیس نے اپنے مخبر چاروں طرف پھیلا دیے اور بالآخر چوبیس گھنٹے کے اندر پولیس نے ڈاکوؤں کا سراغ لگالیا اور بھاری نفری اسلحہ کے ساتھ دلاور بھائی کے ڈیرے پر چھاپہ مارا۔ سب ڈاکو گرفتار کرلیے گئے۔ زیورات اور پیسوں سے بھرا اٹیچی کیس بھی برآمد کرلیا۔ بدقسمتی سے اس وقت دلاور بھائی بھی وہاں موجود تھے تو ڈاکوؤں کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔

اگلے روز ملک کے تمام بڑے اور قومی اخبارات میں ڈاکوؤں کی گرفتاری، ان کی تصاویر اور ناموں کے ساتھ شہ سرخی لگادی گئی۔ پولیس کی کارکردگی کو بہت سراہا گیا تھا۔ ڈاکوؤں کی تصاویر کے ساتھ بھائی دلاور کی تصویر اور نام نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ گو کہ دلاور بھائی سوفیصد بے گناہ تھے۔ ان ڈکیتیوں سے ان کا کوئی واسطہ تعلق نہ تھا مگر بدقسمتی سے پیسہ اور زیور ان کے ڈیرے سے برآمد ہوا تھا۔ اور وہ خود بھی وہاں موجود تھے تو انھیں بھی ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھا گیا۔

دلاور بھائی کی گرفتاری کی خبر اخبار میں ڈاکوؤں کے ساتھ ان کے نام اور تصویر چھپنے سے ہم پر قیامت ٹوٹ گئی۔

ہر طرف یہ خبر گردش کررہی تھی کہ دلاور ڈاکوؤں کا ساتھی ہے۔ دادا جان پہلے ہی بہت کمزور نحیف لاغر تھے ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے، بہت بوڑھے ہوچکے تھے تو یہ خبر ان سے برداشت نہ ہوئی ان پر شدید فالج کا حملہ ہوا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔

تمام ڈاکوؤں کے ساتھ دلاور بھائی پر بھی ڈکیتی اور قتل کا الزام لگا کر ان کے خلاف پرچہ درج کرلیا گیا۔ پولیس نے ان پر بہت تشدد کیا کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرلیں مگر وہ بے گناہ اور بے قصور تھے تو جرم قبول نہ کیا مگر انھیں مجرم قرار دیا جارہا تھا۔ پولیس تفتیش کررہی تھی بالآخر انھیں جیل بھیج دیا گیا اور کیس عدالت میں۔

ان حالات میں ڈاکٹر ابوذر کے والدین نے میرا اور ڈاکٹر ابوذر کا رشتہ ختم کردیا کہ وہ ایک ڈاکو کی بہن کو اپنی بہو نہیں بنا سکتے۔

میں نے ڈاکٹر ابوذر کو فون کرکے اپنے بھائی کی بے گناہی کا یقین دلایا بہت قسمیں کھائیں وہ خود بھی بہت پریشان اور دکھی تھے مگر اس کے والدین نے سختی سے انکار کردیا کہ یہ شادی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ ابوذر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے غریبی میں اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا تھا۔ وہ اپنی دو بہنوں اور والدین کا سہارا تھا۔ اپنے ماں باپ سے بغاوت نہیں کرسکتا تھا۔ میں دن رات روتی رہتی دکھوں نے میرے اندر ڈیرے ڈال لیے۔ اور میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔

نانا جان اور ماموں نے پیسہ پانی کی طرح بہانا مگر نہ ہی دلاور بھائی کی ضمانت ہوسکی اور نہ ہی ان کی بے گناہی ثابت ہوسکی۔ کیس عدالت میں چل پڑا۔ ہماری رہی سہی زمین اور گھر بھی بک گیا۔ مجھے نانا جان اپنے پاس مٹھ پنڈ لے گئے۔ مجھے دن رات ڈاکٹر ابوذر کی یادیں ستاتیں۔ میں اس کی محبت، بھائی کے غم اور دکھ میں سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔

ایک دن پولیس کی وین قیدیوں کو لے کر عدالت میں پیشی کے لیے لے جارہی تھی اس وین میں ڈاکوؤں کے ساتھ دلاور بھائی بھی تھے تو راستے میں ڈاکوؤں کے ساتھیوں نے ان کو چھڑانے کے لیے حملہ کردیا جس کے نتیجہ میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا کچھ حملہ آور مارے گئے اور کچھ پولیس والے زخمی اور شہید ہوگئے۔ وین کا دروازہ توڑ دیا گیا اور سب قیدی فرار ہوگئے۔ بھائی کو بھی ان ڈاکوؤں نے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر اس گاڑی میں بٹھالیا جو ڈاکوؤں کو چھڑانے کے لیے آئی تھی وہ گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی پولیس نے وائرلیس کرکے قریبی علاقے کی پولیس کو بلالیا اور پولیس کی بھری نفری اپنی گاڑیوں میں اس کا تعاقب کررہی تھیں۔

کافی لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی جب پولیس اُن

تک پہنچ نہ پارہی تھی پولیس نے ڈاکوؤں کو چھڑانے والی گاڑی پر فائرنگ شروع کردی جس کے نتیجہ میں گاڑی کے پیچھے دونوں ٹائر برسٹ ہوگئے اور گاڑی ہچکولے کھاتی سڑک سے اُتر کر کھڈوں میں اُچھلنے لگی اور رک گئی۔ جیسے ہی گاڑی رکی جس کا جدھر رخ ہوا سب بھاگنے لگے۔ بھائی بھی ایک سمت بھاگنے لگا تھوڑا سا آگے جاکر ایک ریلوے لائن آگئی دلاور بھائی ریلوے لائن کے ساتھ دوڑنے لگے۔ پولیس ان کا پیچھا کررہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی ریلوے اسٹیشن آگیا تھا پولیس بھائی کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ وہ بار بار بھائی کو رک جانے اور گرفتاری کا بول رہے تھے مگر بھائی پلیٹ فارم پر بھاگے جارہا تھا۔ اب پولیس والوں نے اسے روکنے اور ڈرانے کے لیے فائرنگ شروع کردی تھی کہ اسٹیشن پر کافی رش نظر آرہا تھا اور بھائی اُس رش میں غائب بھی ہوسکتا تھا۔ پولیس کی فائرنگ سے بھائی کو کمر اور ٹانگوں پر گولیاں لگ گئیں وہ پلیٹ فارم پر گرگیا۔ چند لمحوں کے بعد پولیس اس کے سر پر تھی۔ بھائی نے وہیں ریلوے اسٹیشن پر تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

اگلے دن اخبار میں پہلے صفحے پر خبر شائع ہوئی کہ قیدیوں کی پولیس وین پر حملہ کے نتیجے میں قیدیوں کو چھڑانے والے تین حملہ آور ہلاک چار پولیس اہلکار شہید دو شدید زخمی اور فرار ہونے والے تمام ڈاکو گرفتار کرلیے گئے۔ ایک دلاور نامی ڈاکو پھول نگر کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھاگتے ہوئے پولیس مقابلہ میں فائرنگ سے ہلاک۔

دو دن کے بعد دلاور بھائی کی نعش پوسٹ مارٹم کے بعد نانا جان نے وصول کرلی اور اسی دن بھائی کو سپرد خاک کردیا گیا۔

وہ پھول نگر جو مجھے دنیا کے سب شہروں اور علاقوں سے خوب صورت اور پیارا لگتا تھا۔ جہاں میری محبت پروان چڑھی تھی۔ اسی پھول نگر کے پلیٹ فارم پر میرا سگا بھائی جو کہ بے گناہ تھا۔ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

پے در پے صدموں نے مجھے توڑ دیا۔ میں بیمار رہنے لگی اور دن رات کھانسی کا دورہ پڑتا رہتا اور بلغم کے ساتھ خون بھی آتا۔ میرا سارا حسن کملا گیا رنگ کالا ہوگیا۔ اور میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔

ماموں مجھے علاج کے لیے شہر لے گئے تو وہاں انکشاف ہوا کہ مجھے ٹی بی کا مرض لاحق ہوچکا ہے۔ جس کا بہت لمبا علاج ہے۔ نانا جان اور نانی جان کا انتقال ہوچکا ہے۔ ماموں نے گاؤں کی ساری زمین بیچ کر شہر میں گھر بنالیا ہے اور وہ دن رات اپنے بزنس میں مصروف رہتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوذر کے متعلق پتا چلا کہ انھوں نے کسی اور لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا اور اسپیشلائزیشن کرنے کے لئے ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ مجھے گورنمنٹ کے ٹی بی اسپتال میں داخل کروادیا گیا ہے جہاں میرا علاج ہو رہا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ مکمل صحت یاب ہونے کے لیے چھ ماہ سے ایک سال کا عرصہ لگے گا۔

حسرت ناتمام کے ساتھ ایک موہوم سی امید ہے کہ شاید ڈاکٹر ابوذر واپس آکر مجھے اپنالیں کیونکہ مقدمے کی سماعت کے دوران ثابت ہوگیا تھا کہ بھائی ڈکیتی میں ملوث نہیں تھا۔ جس گھر میں ڈاکہ ڈالا گیا تھا تو ان لوگوں نے باقی تمام ڈاکوؤں کو شناخت کرلیا تھا اسی طرح بینک کے عملے نے بھی گواہی دی تھی کہ دلاور بھائی ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکوؤں نے بھی اپنے بیان میں کہا تھا کہ دلاور بھائی ڈاکے ڈالتے وقت ان کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ تو زبردستی پناہ لینے کے لیے ان کے پاس گئے تھے تو پولیس نے ڈاکوؤں کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کرلیا تھا۔ مگر اب اس گواہی کا کیا فائدہ میرا ماں جایا بھائی تو ڈاکو کی حیثیت سے پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔

مجھے اب بھی ڈاکٹر ابوذر کا شدت سے انتظار ہے۔ میں نے وہ سب اخبارات سنبھال کر رکھے ہیں جس میں مقدمے کی ساری روداد لکھی ہے، جس کے مطابق ثابت ہوگیا تھا کہ بھائی بے گناہ تھا۔ باقی تمام ڈاکوؤں کو سزائے موت ہوگئی تھی۔ مجھے امید ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر میرا ڈاکٹر ابوذر سے سامنا ضرور ہوگا اور میں اسے اپنے بھائی کی بے گناہی کا یقین دلانے میں کامیاب ہوجاؤں گی کیونکہ میری محبت سچی ہے۔ دعا کریں مجھے میری محبت مل جائے۔

☆☆☆

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،
جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا۔

(تیسرا حصہ)

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ اتنا ہی کہہ پائے۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں ابو۔ آپ کی زندگی تو قرآن اور حدیث کی کتابوں تک ہی محدود رہی ہے۔ میں کیا ہوں؟ کیسا ہوں، کن مسائل کا شکار ہوں کبھی جاننے کی کوشش کی آپ نے۔" اسفر کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ پر آواز پہ غم کے ساتھ غصے کی بھی اجارہ داری تھی۔ زوار کچھ نہ کہہ پائے۔

"ساری زندگی کن مسائل میں گھرا رہا کبھی آپ آگے نہ بڑھے مجھے سہارا دینے کے لیے۔ آپ کے ہوتے ہوئے میں نے یتیموں جیسی زندگی گزاری ہے۔" لفظوں کا چابک زوار کی گردن پر پڑا تھا۔

"ایسے مت کہو اسفر میں تم سے غافل نہیں رہا۔"

"آپ غافل رہے ابو، آپ رہے۔ جب سہارا نہیں دے سکتے تھے تو پیدا ہی کیوں کیا" کہاں کی بات کہاں آ رکی تھی۔ کہاں کا غصہ کہاں آ نکلا تھا۔ اسفر کی آنکھوں سے دو بے رنگ آنسو ٹپکے۔ اسفر نے آنکھیں صاف کیں۔

"آپ اپنی دکان پر آرام سے بیٹھ کر یہ حدیثوں کی کتاب پڑھیے۔ میں جا رہا ہوں۔" اسفر نیچے اترا اور سڑک پر سیدھی سمت چلنے لگا۔ یہ سمت گھر کی طرف نہ جاتی تھی۔

"اسفر میرے بیٹے" زوار نے پکارا تھا۔ زبان سے نہیں دل سے۔ پر دل کی آواز بھلا انسان کہاں سن سکتا ہے۔ اسفر دور جاتا دکھائی دیتا رہا' اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا۔

زوار شکستہ سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ کتنے عرصے بعد ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"بچے تو باغ کے پھول ہیں۔" اسفر کے آنے سے چند منٹ پہلے پڑھی حدیث ان کے دماغ میں ابھری تھی۔

"میرے باغ کا پھول جانے کون چرا لے گیا۔ میرے باغ کا پھول" سوچوں کی تکرار ہونے لگی۔ دو آنسو آنکھوں سے ٹپکے اور قمیض کے دامن میں جذب ہو گئے۔

☆......☆......☆

پورے تین دن اور تین راتیں گزر گئیں۔ سونی گھر نہ آئی۔ یہ معمول کی بات تو نہ تھی لیکن سب نے اسے معمول کی طرح ہی لیا۔ پہلے ایسے کبھی ہوا نہ تھا کہ کوئی بنا بتائے اتنے دن غائب ہو جائے۔ یہاں تک کہ جب چنبیلی گوجرانوالہ گئی تھی۔ سبھی کو پتا تھا اور اب یہ

سونی کا بغیر مطلع کیے غائب ہونا۔

پھر چوتھا دن پانچواں دن۔ ایک ہفتہ، دس دن، تشویش پریشانی میں بدل گئی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ سونی خود ہی کہیں چلی گئی ہو اور انھیں مطلع نہ کرنا چاہتی ہو۔ لیکن لڑکیوں کو انہونی کا احساس ہونے لگا۔

اور پھر ایک دن خبر ملی ایک لڑکی کی لاش راوی کے کنارے ملی ہے۔ برہنہ لاش جسے داغا گیا تھا اور پھولی ہوئی تھی۔ غالباً کئی دنوں سے راوی کے پانی کے رحم و کرم پر تھی اسی لیے پھول گئی تھی۔

بات معمولی تھی کہ نہیں پر میڈیا نے خوب کوریج دی۔ صبح شام کی خبروں میں اس خبر کو شامل کیا جاتا۔ بے فائدہ ٹاک شوز کیے جاتے۔

آمنے سامنے کمرے والے گھر میں سوگ نے ڈیرہ ڈال دیا۔ لڑکی کا چہرہ اخباروں کی زینت بھی بنا تھا اور الیکٹرونک میڈیا پر بھی دکھایا گیا تھا۔ پھولا ہوا چہرہ۔ اجنبی لوگوں کے لیے تو پہچاننا مشکل تھا لیکن اس گھر کے باشندوں کا تو سالوں کا ساتھ تھا۔

اخبار اور الیکٹرونک میڈیا پر اعلان تو کیا گیا تھا کہ ورثاء آکر لاش لے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس نہج پر بات نہ کی۔ لاش لینے جاتے تو مرجانے والے سے اپنا کیا تعلق بتاتے؟ لاش لے بھی آتے تو تدفین کے انتظامات کون دیکھتا وہ پانچ لڑکیاں یا پھر وہ ہیجڑا؟

آخر خبروں میں یہ خبر آنے لگ گئی کہ ایک خیراتی ادارے کی سرپرستی میں اس جوان لڑکی کی لاش کو سپرد خاک کردیا گیا پر اس گھر کی سوگواری میں کمی نہ آئی۔

ایک لڑکی جوان میں سے تھی۔ بچپن، لڑکپن کے ادوار اکٹھے گزارے تھے۔ سالوں سے مشترکہ چھت تلے رہ رہی تھی۔ جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھی یوں اچانک۔۔۔



سونی کا دکھ بھی تھا اور یہ خوف بھی کہ ان کی آئندہ کی زندگی کیسے ہوگی۔

سونی جو ان میں سے سب سے سادہ لڑکی تھی۔ جسے بناؤ سنگھار سے دلچسپی نہ تھی۔ جو سادہ کپڑے پہنتی تھی۔ جسے زبان کا چسکا بھی نہ تھا۔ جو ملتا چپ کر کے کھالیتی۔ جس کا کبھی کسی سے جھگڑا بھی نہ ہوا تھا۔

''اس سے تو بہتر تھا نوید ازندہ ہی رہتا کم از کم تسلی تو ہوتی۔'' ایک دن چندہ نے جلے دل کے ساتھ کہا تھا۔ چنبیلی بنا کوئی جواب دیے یونہی آنکھیں موندے لیٹی رہی۔

''میرا خوف بے جا نہ ہوتا تھا۔ اب چنبیلی یہ سب تیرے یا میرے ساتھ ہوگیا تو۔۔۔۔'' چندہ اٹھ کر چنبیلی کی چارپائی پر آبیٹھی تھی۔ چنبیلی بھی لیٹے سے اٹھ بیٹھی۔

''تو کیا ہوگا۔ تیرا یا میرا جسم بھی راوی کنارے ملے گا یا پھر کسی گندے نالے سے۔'' چنبیلی نے سفاکی سے کہا تھا۔ چندہ دہل کر رہ گئی۔

''چنبیلی یوں تو ناں کہہ۔''

''تو کیا کہوں! یہ سچ ہے چندہ ہم اس معاشرے کا فضلہ ہیں۔ جو اگر مر کھپ جائیں تو بھی کوئی پروا نہ کرے گا۔'' دکھی دل کے ساتھ چنبیلی کہہ رہی تھی اور چندہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

اسی لمحے سیفی کمرے میں آیا اور لڑکیوں سے مخاطب ہوا۔

''باہر جا رہا ہوں کچھ منگوانا ہے تو بتادو'' سیفی کی بھی شادی نہ ہوسکی تھی۔ وہ خواجہ سرا فراڈیا نکلا تھا۔ شادی سے دو دن پہلے سیفی سے ادھار پیسے مانگے۔ سیفی نے بھی بلا تامل پیسے دے دیئے کہ جب ساری زندگی اسی کے ساتھ گزارنی ہے تو پیسوں کا کیا لین دین۔ اور وہ خواجہ سرا اسی دن سے غائب تھا۔ ٹھکانہ بھی چھوڑ دیا تھا اور فون بھی بند کر دیا۔ حالانکہ سیفی نے کوئی ایسا قارون کا خزانہ بھی نہ تھمایا تھا۔ پر شاید وہ اسی قابل تھا۔ سیفی نے بھی اس بات کا زیادہ سوگ نہ کیا تھا۔

''نہیں کچھ نہیں منگوانا'' سیفی جواب سن کر چلا گیا۔ چنبیلی اٹھی اور بوسیدہ ٹرنک سے ساڑی نکال کر دیکھنے لگی۔ سرخ بلاؤز والی اس کی اکلوتی ساڑی جس کے بلاؤز پر رفو کا تھوڑا سا نشان بھی تھا۔

ساڑی نکال کر چنبیلی نے استری لگائی اور ساڑی استری کرنے لگی۔

''یہ ساڑھی کیوں استری کر رہی ہے؟'' چندہ نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔ ایسے شوخ لباس تو وہ پہن کر راتوں کو گھر سے باہر گاہک کی تلاش میں نکلتی تھیں۔

''آج رات کام پر جاؤں گی۔'' استری کرتے ہوئے چنبیلی کا انداز مصروف سا تھا۔

''لیکن کیوں؟'' اس وقت سب لڑکیوں نے طے تو کیا تھا کہ سونی کے چالیسویں تک ہم یہ کام نہیں کریں گے۔'' چندہ کو لگا شاید چنبیلی بھول گئی ہے۔

''چالیسویں تک کام کو نہ گئی تو بھوکی مر جاؤں گی۔

''کل سے پیسے ختم ہوگئے ہیں۔'' بلاؤز آگے سے استری ہوگیا تو چنبیلی نے اسے پلٹا اب وہ پچھلے حصے کو استری کر رہی تھی۔

''اور ہاں چندہ زندگی رو دھو کر گزار دو یا ہنس بول کر نصیب تو ہمارا یہی ہے۔ اسی لیے جو جیسا ہے اسے قبول کر کے جینا سیکھ لے۔'' چنبیلی کا لہجہ عام سا تھا۔ چندہ گنگ سی بیٹھی چنبیلی کو دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

رات کچھ تاریک سی تھی۔ سرخ بلاؤز، سنہری پلو والی ساڑی باندھے چنبیلی جیسے آتش ساماں ہی تھی۔ یہاں سے وہاں ٹہلتے ہوئے وہ کسی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ آج وہ اکیلی تھی۔ ساتھ والی لڑکیوں نے سوگ مناتے ہوئے ابھی نہ آنے کا ارادہ ظاہرہ کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے تو کوشش کی تھی کہ چنبیلی بھی نہ جائے لیکن چنبیلی نے کسی کی نہ سنی اور اکیلی آگئی۔

شہر کا یہ علاقہ جہاں چنبیلی ٹہل رہی تھی یوں تو ایک پوش علاقہ تھا۔ ساتھ ہی اشیائے خورد و نوش کی بڑی مارکیٹ بھی تھی۔ لیکن یہ جگہ اور یہ فٹ پاتھ دہائیوں سے ایسی لڑکیوں کے لیے مخصوص تھا۔ کبھی کبھار نوٹس لے لیا تو لے لیا۔ ورنہ سب چل چلا چل تھا اور جب

سے چنبیلی باقاعدہ طور پر یہاں کھڑی ہونا شروع ہوئی تھی تب سے ملک کے خارجی اور داخلی حالات ہی اس قدر خراب تھے کہ دستِ راست کے لوگوں نے اس مسئلے کو مستقبل کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ کتنے سالوں سے چنبیلی یہاں آ کر کھڑی ہوتی اور طرح طرح کے مردوں کے ساتھ چلی جاتی کبھی مسئلہ نہ ہوا۔ سوائے ایک مرتبہ جب بدر نے اسے تھپڑ مارا تھا۔

چنبیلی ٹہل رہی تھی جب ایک گاڑی آ کر رکی۔ مخالف سمت میں رکنے والی گاڑی کو دیکھنے کے لیے چنبیلی مڑی اور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر اپنی ہی ہم عمر لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر رک سی گئی۔

لڑکی گاڑی سے اتری اور چنبیلی کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔

''السلام علیکم'' لڑکی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ایک جائزہ لیتی نظروں سے چنبیلی کو دیکھا تھا۔

''چنبیلی نے ہاتھ ملایا اور سوالیہ نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگی۔ خیر سگالی کی مسکراہٹ چہرے کی زینت بناتے ہوئے لڑکی بولنے لگی۔

''میرا نام ردا ہے۔ میں ایک جرنلسٹ ہوں۔ صبح ایک چینل پر شو ہوسٹ کرتی ہوں۔''

لڑکی کا لہجہ متاثر کن اور شستہ تھا۔ لڑکی نے تعارف کروایا تو چنبیلی کے ذہن میں خاکے ابھرنے لگے وہ بھی ایک آدھ بار اس لڑکی کو ٹی وی پر دیکھ چکی تھی۔

''اصل میں ہمارا ٹی وی چینل کو ریج دینا چاہتا ہے۔ آپ کون ہیں؟ کیسے اس پروفیشن سے وابستہ ہوئیں؟ مستقبل کیا ہے؟ یہ پروگرام دراصل اس لیے کرنا چاہ رہے ہیں تاکہ ہمیں پتا چلے کہ اس نسل میں یہ سب کہاں سے آرہا ہے اور ہماری نیت اچھی ہے۔۔۔'' ردا قائل کرنے والے انداز میں کہے جا رہی تھی۔ چنبیلی خاموش نگاہوں سے اس ماڈرن لڑکی کو دیکھتی رہی۔

''اب دیکھیں کچھ دن پہلے ایک لڑکی کی برہنہ لاش راوی کے کنارے سے ملی اور لاش کی جو حالت تھی صاف بتاتی تھی کہ اسے پامال کیا گیا ہے۔ ہم ان باتوں کو بھی ہائی لائٹ کرنا چاہتے ہیں۔'' ردا کو اندازہ نہ ہو پا رہا تھا کہ سامنے کھڑی Prostitute کیا سوچ رہی ہے۔ ''میری باتوں کا مائنڈ مت کیجیے گا۔ میں نے پچھلے کچھ عرصے سے آپ پر نظر بھی رکھی تھی۔ آپ روزانہ یہاں آ کر کھڑی ہوتیں پھر درمیان میں آپ نے ناغے بھی کیے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم معاوضہ بھی دیں گے اور اگر آپ کو پرسنل ایشوز ہیں تو آپ نقاب کر کے بھی ہمارے شو میں آسکتی ہیں۔'' اپنے پیشے سے مخلص ردا بطور خاص چاہتی تھی کہ چنبیلی اس کے شو میں آئے۔ وہ معاشرے کے اس طبقے کو سامنے لانا چاہتی تھی۔

چنبیلی خاموش تھی اور چنبیلی کی خاموشی ردا کو مایوس کر رہی تھی۔

''اس شو سے لوگوں میں آگاہی ہوگی اور۔۔۔''

ردا لوگوں کی آگاہی سے متعلق مزید کچھ کہتی لیکن چنبیلی نے اس کی بات کاٹی۔

''وہ لاش جو راوی کے کنارے ملی تھی۔ وہ میری سہیلی کی تھی اور میں آپ کے شو میں ضرور آؤں گی۔''

☆......☆......☆

اس خاندان میں لڑکیاں پیدا نہیں ہوتی تھیں۔ آخری لڑکی جو پیدا ہوئی تھی اس وقت متحدہ ہندوستان میں غدر کا عروج تھا اور یہ چار نسلیں پہلے کی بات تھی۔ اس کے بعد یہ خاندان خدا کی رحمت سے محروم ہی رہا۔ یہاں تک ایک صدی سے بھی کئی سال اوپر ہو گئے۔

یہ بیسویں صدی کی اسی کی دہائی تھی جب زوار یونیورسٹی سے فارغ التعلیم ہونے کے بعد ملازمت تلاش کر رہے تھے۔ ادھر ملازم ہوئے ادھر والدین نے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دیں اور جس لڑکی کی قسمت چمکی اس کا نام رخسار تھا۔

نہ حسب نسب دیکھا گیا، نہ مال و دولت کو تولا گیا اور نہ ہی شکل وصورت کو اہمیت دی گئی۔ پانچ بہنوں میں رخسار کا نمبر تیسرا تھا۔ اس کی ماں چھ بہنیں اور ان کا ایک بھائی تھا۔ بس اسی بات کو اہمیت دی گئی کہ ان کے ہاں بیٹیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ والد نے پرزور اصرار کیا تھا اور وہ رشتے کے حق میں تھے۔ والدہ صاحبہ مجازی خدا کی بات کہاں جھٹلانے والی تھی۔

چنانچہ رخسار زوار کی دلہن بن کر آ گئی۔
شکر گزار زوار اور قناعت پسند رخسار کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ اہم سے اہم تر ہوتا گیا اور یہ دنیا ہی ان کے لیے جنت بن گئی۔ حسین جنت۔
زوار اگر رخسار کے سلیقے کے قائل تھے تو رخسار ان کے طریقے کو سراہتی۔ محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور جب ان کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے خدا نے ایک نئی جان رخسار کے پیٹ میں ڈالی تو گھر میں خوشی و انبساط کے ساتھ اضطراب نے ڈیرے ڈال لیے۔ والدہ صاحبہ تو چلو غیر خاندان سے تھیں۔ بہنوں، بھانجیوں اور بھتیجیوں والی لیکن والد صاحب محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً نسلوں سے گھر میں بیٹی کی قلقاریاں سننے کو بے تاب تھے۔ جب ان کا اپنا زمانہ تھا تب بھی انھوں نے ہر مرتبہ بیٹی کا انتظار کیا تھا لیکن خدا نے ان کی خواہش کو تشنہ رکھا۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ زوار کے وقت اپنے دوست کی بیٹی کو زوار کی دودھ شریک بہن اور اپنی رضاعی بیٹی بنایا۔ لیکن کمی اس طرح سے پوری نہ ہوئی جس طرح سے حقیقی بیٹی پوری کرتی۔
یوں تو والد صاحب فارغ وقت میں افقی بچھی چارپائی پر بیٹھے سلیقے سے پگڑی سر پر جمائے، حقے کی نے منہ میں دبائے گڑگڑاتے ہوئے دھواں ہوا کے سپرد کرتے رہتے لیکن اضطراب ان کی ہر حرکت سے واضح ہوتا۔
بیوی سے اصرار کر کے انھوں نے دور محلے کی دائی بھی بلوائی جو دوران حمل زچہ کی چال سے بتا دیتی کہ لڑکا ہوگا کہ لڑکی۔ دائی کا تجربہ دہائیوں پر محیط تھا۔
''لے سردار علی فیصلے خدا کی ذات کے۔ ہم کون ہوتے ہیں مخل ہونے والے پر میرا تجربہ بتاتا ہے کہ لڑکی ہوگی باقی خدا کی مرضی۔'' دائی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے تھے۔ سردار علی اتنے مسرور ہوئے کہ ایک سبز کڑکڑاتا نوٹ دائی کی جھولی میں ڈالا۔ سبز نوٹ کی اس زمانے میں بے تحاشا وقعت تھی۔ مگر دائی نے جو خبر سردار علی کو سنائی تھی وہ خبر کہیں زیادہ بڑی تھی۔
زمانے کی رفتار ان دنوں ایسی تیز نہ ہوتی تھی۔ الٹرا ساؤنڈ اتنا عام نہ تھا اور یوں بھی لوگ الٹرا ساؤنڈ لگوا کر بچے کی جنس معلوم کروانا گناہ کبیرہ خیال کرتے تھے اور پھر وہ وقت آ گیا۔ جس کا انتظار کیا تھا۔
تجربہ کار دائی کو ہی بلایا گیا تھا۔ زوار کو بھی بیٹی کی تمنا تھی لیکن سردار علی کے انداز ہی نرالے تھے۔ لمحہ جاں گسل پگھل پگھل کر سرکتا رہا۔ یہاں تک کہ تمتماتے چہرے کے ساتھ دائی اور زوار کی والدہ صاحبہ باہر آئیں۔ والدہ صاحب کے ہاتھ میں گرم کپڑوں میں لپٹا وجود تھا۔
''صد مبارک سردار علی۔ یوں تو میں نئی زندگی کی مبارک باد سب سے پہلے باپ کو دیتی ہوں لیکن تیری خوشی دیکھ کر مجھے آج تو مبارک کا زیادہ حق دار لگ رہا ہے'' سردار علی تو جیسے خوشی سے دیوانے ہو گئے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ پوتی کو ہاتھوں میں تھاما تھا۔
''یہ میری بیٹی ہے'' سردار علی کی آنکھوں میں جھلمل آنسو چمکے۔
''بیٹی کے باپ کو بھی صد مبارکاں'' دائی نے کہا۔
باپ اور دادا نے دائی کو مٹھائی کے پیسے دیے اور توقع سے بڑھ کر دیے۔ دائی دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئی۔
''سردار علی بچی چھوٹی ہے کہیں۔ ورد ہی نہ اتار دو۔'' والدہ صاحبہ نے ٹوکا تھا تو بمشکل تمام سردار علی نے بچی بیوی کے حوالے کی۔
بیٹے کو ساتھ لگایا تو کتنی دیر ساتھ بھینچے کھڑے رہے۔
''تجھے یقین آئے یا نہ آئے زوار پر یہ سچ ہے اتنا خوش میں کبھی نہ ہوا'' سردار علی کے لہجے میں مسرت تھی۔
بچی کے نام رکھنے کا وقت آیا تو کسی نام پر اتفاق ہی نہ ہوتا تھا۔ یونہی ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا اور پھر ڈیڑھ ہفتے بعد سردار علی کی رائے کو مقدم جان کر بچی کا نام سونیا رکھا گیا۔
''سونیا سردار'' باپ کی خوشی کے لیے زوار نے بیٹی کے نام کے ساتھ اپنے نام کی بجائے باپ کا نام جوڑا تھا۔ سونیا گھر بھر کے آنکھ کا تارا تھی۔ ایک دن

رخسار نے یونہی پیار میں سونی بلایا تو سونی پیار کا نام ٹھہرا۔

گھر بھر میں آسودگی تھی۔ سونی کی قلقاریاں گھر میں گونجتیں تو سارا گھر جھوم اٹھتا اور کبھی جو سونیا بیمار ہوتی تو سارا گھر پریشان ہو جاتا۔ یونہی وقت گزرتا گیا۔

سونی دو سال کی ہوئی تو سردار علی پر فالج آن گزرا۔ فالج کا پہلا حملہ ہی جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ والد صاحب کے گزرنے کے چند ماہ بعد والدہ صاحبہ بھی خالق حقیقی سے جا ملیں۔

زوار نے یہ دکھ صبر سے سہے کہ یہ لمحہ تو ہر کسی نے صبر سے سہنا ہی ہوتا ہے۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ چلتی رہی کہ ایک دن۔۔۔۔۔۔۔

☆......☆......☆

تتلی ہوں میں تتلی ہوں
پھولوں سے میں نکلی ہوں
ٹھنڈا پانی پیتی ہوں
اوپر پنکھا چلتا ہے
نیچے منا سوتا ہے
منے کی ماں موٹی
کھائے ڈبل روٹی
ڈبل روٹی خراب
منے کی ماں ناراض

سونی لہکتی جاتی اور کہتی جاتی۔ ستون سے گلے لگ لگ کر وہ کتنی دیر یہ نظم گاتی رہی اور پھر دھیان سامنے پڑے اپنے تین پہیوں والے سائیکل کی طرف گیا تو دوڑ کر سائیکل کی طرف گئی اور سائیکل پر بیٹھ گئی۔

تتلی ہوں میں تتلی ہوں
پھولوں سے میں نکلی ہوں

اب آواز پہلے سے بھی اونچی ہو گئی تھی۔ پورا زور لگا کر گا رہی تھی۔ تین پہیوں والا سائیکل ابھی پیڈل کے ساتھ چلانا نہیں آتا تھا۔ پاؤں دھکیل دھکیل کر سائیکل گھسیٹتی۔

ٹھنڈا پانی پیتی ہوں
اوپر پنکھا چلتا ہے
نیچے منا سوتا ہے

زوار نے کروٹ بدلی۔ گھڑی پر ٹائم دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ جولائی کے گرم دن تھے۔ پانچ بجے کافی دن نکل آتا تھا۔ کچھ دیر یونہی کسلمندی سے لیٹے رہے۔ پھر اٹھے۔ واش روم کا رخ کیا۔ منہ پر چھینٹے مار کر آئے اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔

اس وقت صحن میں دو چارپائیاں بچھی تھیں گرمیوں کے دنوں میں میاں بیوی صحن میں سوتے تھے۔

رخسار برآمدے میں چوکی پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔

''اٹھ گئے آپ، ضرور سونی کے شور کی وجہ سے اٹھے ہوں گے۔ کل دوپہر کو سوئی تو شام کو کتنی کوشش کی مگر یہ محترمہ نہیں اٹھیں اور صبح ہمیں تنگ کرنے کے لیے چار بجے ہی جاگ گئی'' رخسار نے آٹے کو مکیاں مارتے ہوئے کہا تھا۔

منے کی ماں موٹی
کھائے ڈبل روٹی
ڈبل روٹی خراب
منے کی ماں ناراض

سونی سائیکل گھسیٹتی جاتی اور کہتی جاتی۔ زوار نے گردن موڑ کر دلاری کو دیکھا۔ بے ساختہ بے تحاشا پیار امڈ آیا۔

''سونی ادھر آؤ'' زوار نے پکارا۔ سونی سنی ان سنی کرتی سائیکل گھسیٹتی رہی اور گنگناتی رہی۔

''کیسا صاف بولتی ہے ماشاء اللہ۔ سکول داخل کروا دینا چاہیے۔'' زوار رخسار سے مخاطب ہوئے۔

''نہ جی اگلے سال داخل کروائیں گے۔ ابھی تو صرف تین سال کی ہے۔ ابھی تو کھیلنے دیں۔'' آٹا گندھ چکا تو رخسار پرات لے کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

''تتلی ہوں میں تتلی ہوں'' ایسے لگتا تھا کہ سونی یہ گاتے کبھی بیزار ہو گی اور نہ کبھی تھکے گی۔

''اوت تتلی ذرا ادھر تو آ۔۔۔۔'' زوار نے ایک بار پھر بیٹی کو پکارا تھا۔ سونی سائیکل چھوڑتی دوڑ کر باپ کے پاس آئی اور باپ کی گود میں چڑھ گئی۔

''آرام سے آرام سے۔۔۔۔'' سونی کی رفتار

دیکھ کر زوار کو ڈر سا لگا کہیں گر ہی نہ جائے۔

"ابو آپ میرے لیے وہ آئس کریم نہیں لائے ناجو گائے کھاتی ہے۔" آج کل ٹی وی میں ایک آئسکریم کی کمرشل آرہی تھی جس میں کارٹون گائے آئسکریم کھاتی تھی۔ سونی کے حواسوں پر آج کل وہ آئسکریم طاری تھی۔ سوتے جاگتے۔ کھیلتے کودتے بس آئسکریم کو سوچ جاتی۔

زوار مسکرا دیئے۔

"بیٹا وہ یہاں سے ملتی نہیں نا اور آج کل گرمی بہت ہے۔ میں دور سے لاؤں تو پگھل جائے گی۔" زوار نے کہا تو سونی نے منہ بسورا۔

"میں پگھلی ہوئی کھالوں گی۔" تین سالہ بچی پگھلی کو پلگھی کہہ رہی تھی۔ زوار نے مسکراتے ہوئے بیٹی کے گال پر بوسہ دیا۔ سونی منہ بسورے بیٹھی رہی۔

"چلو ایسے کرتے ہیں، شام کو میں جب دفتر سے آؤں گا تو پھر آئسکریم کھانے چلیں گے۔ میں، تم اور امی" سونی نے ہونٹ دباتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں ابھی" سونی سے کہاں صبر ہوتا تھا۔

زوار ایک بار پھر ہنس پڑے۔

"سونی ابو کو تنگ مت کرو۔ انھوں نے کام پر جانا ہے۔ شام کو آئسکریم کھلانے لے جائیں گے نا۔" رخسار کچن کے دروازے پر کھڑی کہہ رہی تھی۔ سونی نے تیوری چڑھا کر ماں کو دیکھا اور کچھ کہے بنا باپ کی گود سے اتر گئی اور پھر سے سائیکل پر آن بیٹھی۔

"تتلی ہوں میں تتلی ہوں" راگ ایک بار پھر جاگ اٹھا تھا۔

"تیار رہنا تم بھی شام کو پھر گائے والی آئسکریم کھانے چلیں گے۔" رخسار ناشتا لے کر آئی تو زوار نے شرارت سے کہا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ سارا دن دفتر میں گزار کر آپ اتنے تھکے ہوئے آتے ہیں۔ گرمی بھی تو بہت ہوتی ہے۔ دوبارہ سے کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ آرام کیجئے گا۔ جمعہ کو آپ کو چھٹی ہوگی چاہے اس دن چلے جائیں گے۔ سونی تو بچی ہے۔ ایسی چھوٹی موٹی چیزوں کے لیے اس کا دل تو ہمکتا ہی رہے گا۔" رخسار اپنے لیے بھی ناشتا لائی تھی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ دونوں میاں بیوی میں خوب محبت تھی۔ شادی کے چار سال بعد بھی ایک ہی برتن سے کھاتے۔

"جمعہ تو بہت دور ہے۔ ہم آج ہی چلیں گے۔" زوار نے کہا تو رخسار نے دوبارہ سے تردید نہ کی۔ جانتی تھی شوہر نامدار کہاں رکنے والے ہیں۔ ان دنوں جمعے کو چھٹی ہوا کرتی تھی۔ اسی لیے گھر کے کام اور تفریح کے ارادے جمعے کے روز کے لیے اٹھا رکھے جاتے۔

"آؤ سونی ناشتا کرلو" رخسار نے سونی کو بلایا تھا۔

"مجھے نہیں کھانا" سونی کھیلتی رہی۔ صبح صبح وہ دودھ بھی پی چکی تھی اور آم بھی کھا چکی تھی۔ اب کہاں کچھ کھانا تھا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ اپنی رحمت کی چادر مسلسل ہمارے اوپر تانے ہوئے ہے۔" ناشتا ختم ہوا تو زوار ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔ "جی بالکل" رخسار نے ناشتے کے برتن سمیٹے اور کچن کی طرف چل دی۔

"تتلی ہوں میں تتلی ہوں" سونی کا راگ جاری تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر کا وقت تھا۔ گرم لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ انسان حیوان، چرند پرند بھی اپنے ٹھکانوں میں دبکے تھے۔ دھوپ میں جھلسا دینے والی تمازت تھی۔

نوید دور سے چل کر آرہا تھا۔ پسینے میں شرابور قمیض بدن سے چپکی ہوئی۔ حلق خشک، ایسے لگتا جیسے کانٹے اگے ہوئے ہوں۔ زمین کی گرمی سلیپر سے پیروں کو منتقل ہو رہی تھی۔ گھروں کی دیواروں کے سائے اتنے لمبے نہ تھے کہ بندہ ان میں ستا سکے۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا، گرمی کو کوستا وہ سایہ دار جگہ کے لیے دیکھتا جا رہا تھا کہ سامنے مسجد کے مینار نظر آئے اور جان میں جان آئی۔

مسجد میں جا کر سب سے پہلے وہ رفع حاجت سے فارغ ہوا۔ وضوگاہ میں بیٹھ کر کتنی دیر منہ پر چھینٹے مارتا رہا۔ سر بھی گیلا کیا۔ پاؤں بھی دھوئے اور سیر ہو کر پانی پیا۔ مسجد کا پانی کا ذائقہ تھوڑا نمکین تو تھا پر پینے لائق تھا۔ اس سب سے جسم کو لگی آگ تھوڑی ٹھنڈی ہوئی تو اس نے اندرونی حصے کا رخ کیا۔

اتنی لمبی دوپہر تھی سوچا تھوڑا دیر ستا لے۔ ظہر کی جماعت کو ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ اس مسجد میں نماز ظہر اول وقت میں ادا کر لی جاتی۔ اس وقت مسجد میں مولوی صاحب کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

''مسافر لگتے ہو؟'' مولوی صاحب نے نویدے سے پوچھا تھا۔

''جی'' نوید ابولا تو پان کی تیز خوشبو مولوی صاحب کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ مولوی صاحب نظر انداز کر گئے۔ یوں بھی وہ ظاہری شخصیت پر دھیان دینے والے نہ تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ ظاہر باطن کے اظہار کا ذریعہ نہیں ہوتا تھا۔

''نماز ظہر ادا کر لی؟''

''جی'' نویدے نے جھوٹ بولنے میں عار محسوس نہ کیا۔

''ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تھی۔ ادھر کام کے سلسلے میں جا رہا تھا۔ گرمی برداشت نہ ہو رہی تھی سوچا کہ تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں'' نویدے کا لہجہ بازاری تھا۔ اگلے بندے کی سماعت پر گراں گزرنے والا تھا لیکن یہاں سامع مولوی صاحب تھے۔

''اچھا، اچھا'' مولوی صاحب دوبارہ سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ وہ مسجد کے قرآن مجید ترتیب سے رکھ رہے تھے۔ قرآن مجید کے کئی نسخے تھے۔ محلے کی آبادی کے تناسب سے زیادہ۔ مولوی صاحب ترتیب دیتے رہے اور نویدا آلتی پالتی مارے بیٹھا مسجد کے در و دیوار دیکھتا رہا۔ تھوڑا سا سمے دراز ہوا تب تک مولوی صاحب قرآن مجید ترتیب سے رکھ چکے تھے۔

''مسافر تو مسجد میں قیام کر سکتا ہے۔ بیٹا میں گھر جا رہا ہوں۔ مسجد کا دھیان رکھنا۔'' مولوی صاحب جوتوں کے ایک ڈبے سے اپنے کھسے نکالے اور چلے گئے۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد نویدا یونہی چھت گھورنے لگا۔ چھت کافی نیچی تھی۔ پرانی وقتوں کی بنی مسجد تھی۔ دیکھتے دیکھتے نویدے کی نظر گول گھومتے چھت والے پنکھے پر پڑی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو کھڑکی کے کواڑ کے پاس چھری بھی پڑی نظر آئی۔ لیٹے سے اٹھ بیٹھا اور تھوڑی دیر سوچتا رہا۔

اس گرمی میں بھلا کس نے مسجد میں آنا تھا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک کمینی مسکراہٹ آن ٹھہری۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کس چیز پر کھڑے ہو کر پنکھا اتارا جا سکتا ہے۔ مسجد میں سٹول، میز، کرسی طرز کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس نے تین چار بار نگاہیں ادھر سے ادھر دوڑائیں۔ مسجد میں صفوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تھوڑا مایوس ہونے لگا تو عقبی دیوار میں بنے اوپر نیچے کے طاقوں میں قرآن مجید نظر آئے۔ قرآن مجید کے کئی نسخے تھے۔ اتنے کہ چاروں طاق ترتیب میں لگے قرآن مجید سے پر تھے۔ ملعون ذہن میں ملعون سوچ آئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جا کر مسجد کا داخلی دروازہ بند کر آیا۔

اول تو کوئی آتا نہ اور اگر کوئی آ بھی جاتا تو اس نے زیادہ سے زیادہ مارنا ہی تھا۔ نویدا مار سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ اس گرمی میں لوگوں کو بھی تو جمع نہیں کیا جا سکتا تھا اور نویدا بھاگنے میں یوں بھی تو ماہر تھا۔

داخلی دروازے کی کنڈی لگانے کے بعد اس نے قرآن مجید کے نسخے نکالے۔ پنکھے کے نیچے ان کی ڈھیری لگائی۔ ترتیب سے اوپر نیچے رکھنے سے وہ کم از کم دو فٹ اونچائی میں آ گئے۔

نویدا ان کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ کلام اللہ پیروں کے نیچے تھا اور وہ چھت سے پنکھا اتار رہا تھا۔ آسانی سے پنکھا اتر گیا۔ جب نیچے اترنے لگا تو قرآن مجید کے نسخے ادھر ادھر کو لڑھک گئے۔

''کس نے کہا تھا یوں ڈھیر لگا کر مسجد بھر دیں۔'' نویدے نے ساتھ ہی ناقابلِ اشاعت گالی بکی تھی۔

پنکھے کے پر اس نے چھری سے کھولے یہ تمام واردات سات منٹ میں ہو گئی۔ پنکھا اور پر بغلوں میں دبا تا وہ مسجد سے نکل گیا۔

پنکھے کو قریب ترین کباڑیے کی دکان پر اونے پونے بیچا۔ جو پیسے ہاتھ لگے اس میں سے سب سے پہلے ایک گلاس ٹھنڈی سکنجبین لی۔ ''گرمیوں میں ٹھنڈے مشروب کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔'' جب وہ گلاس منہ سے لگاتا تھا تو سکنجبین کا مشروب اس کی مونچھوں کو گیلا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

دو بجے کے قریب رخسار نے سونی کو تھپک تھپک کر سلایا اور تین بجے وہ دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوتے میں بھی اس کے خواب وہ آئسکریم آتی رہی جو گائے کھاتی تھی۔ رخسار کی ابھی بمشکل آنکھ لگی تھی کہ چارپائی ہلی اور کھٹکا ہوا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو سونی چارپائی سے اتر رہی تھی۔

''توبہ کس قدر شرارتی ہے'' رخسار سوچ کر رہ گئی۔

''باہر مت جانا سونی'' رخسار نے مندی مندی آواز میں کہا تھا۔ گرمیوں میں وہ صبح نماز کے وقت اٹھتی تو دوبارہ نہ سوتی اس لیے دوپہر کو طبیعت پر کافی کسلمندی سی چھا جاتی۔ دوپہر کو سونا اس کے معمول کا حصہ تھا۔

سونی کمرے سے باہر آئی اور برآمدے میں پڑے اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ کھلونوں سے باتیں بھی کرتی اور انھیں الٹ پلٹ بھی کرتی۔ لیکن جلد ہی بیزار ہوگئی۔ کھلونوں کو پرے دھکیلا اور دوبارہ کمرے میں آگئی۔ اس وقت تک وہ ننگے پاؤں تھی۔ کمرے سے اپنا میجک سٹرپ والا جوتا اٹھا لائی اور پہن لیا۔ چارپائی پر چڑھی اور چہرہ کہنی پر ٹکائے زوار کا انتظار کرنے لگی۔

زوار کی نو سے پانچ والی ڈیوٹی تھی گھر پہنچتے پہنچتے عموماً انھیں ساڑھے پانچ، پونے چھ ہو جاتے تھے اور ابھی تو ساڑھے تین بجے تھے۔

سونی نے ایک نظر پاؤں میں پہنے جوتوں کو دیکھا۔ اسے ابھی دائیں اور بائیں پاؤں کے جوتے کا نہیں پتا چلتا تھا۔ غور سے جوتوں کو دیکھا تو لگا غلط پہنے ہوئے ہیں اتار کر دایاں جوتا بائیں پاؤں میں اور بایاں جوتا دائیں پاؤں میں پہن لیا۔ صحیح انداز میں پہنے ہوئے کو اتار کر غلط انداز میں پہننے کے بعد وہ مطمئن ہوئی کہ اب صحیح پہنے ہیں۔

تتلی ہوں میں تتلی ہوں
پھولوں سے میں نکلی ہوں
ٹھنڈا پانی پیتی ہوں
اوپر پنکھا چلتا ہے
نیچے منا سوتا ہے
منے کی ماں موٹی
کھائے ڈبل روٹی
ڈبل روٹی خراب
منے کی ماں ناراض

گاتے گاتے اس نے نظر برآمدے میں لگی دیوار گیر گھڑی پر ڈالی۔ بس یہ پتا تھا کہ گھڑی سے وقت کا پتا چلتا ہے اور کچھ نہیں پتا تھا۔ گھڑی سے نظریں ہٹا کر پھر سے گانے لگی۔

''ٹھنڈا پانی پیتی ہوں''

''ٹھنڈا پانی پیتی ہوں''

''ٹھنڈا پانی پیتی ہوں'' ایسے جیسے ٹیپ ریکارڈ کی کیسٹ پھنس گئی ہو۔ ایک ہی فقرے کو بار بار آواز میں اتار چڑھاؤ لائے بغیر گاتی رہی۔

''ٹھنڈا پانی پیتی ہوں'' چارپائی سے اٹھی اور صحن پار کرتی گھر کے دروازے تک آئی کنڈی نیچی تھی۔ سونی ایڑیاں اٹھا کر پنجوں کے بل کھڑی ہوئی تو با آسانی کنڈی کھول لی۔

دروازے میں کھڑے ہو کر گلی میں دیکھا ابو آ تو نہیں رہے۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ لو کے جھونکے مٹی کے ذرات اڑا رہے تھے۔ مایوس ہو کر دروازے میں کھڑی رہی۔

''ابو آجائیں'' دیوار پر ہاتھ جمائے نگاہیں گلی کے نکڑ پر جمادیں۔ تبھی نوید اگلی کی نکڑ پر نمودار ہوا۔

''بچی کیا کر رہی ہو۔'' نوید نے دروازے پر رک کر سونی کو نظروں میں تولا تھا۔

''میرے ابو نے آنا ہے۔ ہم نے آئسکریم کھانے جانا ہے۔ وہ جو ٹی وی میں گائے کھاتی ہے۔'' سونی کی نگاہیں گلی کی نکڑ سے ہٹتی نہ تھیں۔ جیسے بس چند سیکنڈ زمیں زوار نے آجانا ہے۔

بچی سرخ انار جیسی تھی۔ دیکھتے ہی چھونے کا دل کرتا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟'' نوید نے پان زدہ دانتوں کی نمائش کی تھی۔

''سونی''

''تمہارے ابو کا کیا نام ہے؟''

''ابو کا نام ۔۔۔۔۔'' سونی نے لمحے بھر کو نگاہ نکڑ سے ہٹائی اور سامنے کھڑے انکل کو دیکھا کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر بولی۔

''ابو کا نام ابو ہے'' نویدے کے ہونٹ پھیل گئے۔ اس نے گلی میں نظر دوڑائی بالکل سنسان تھی۔

''سونی مجھے تمہارے ابو نے بھیجا ہے۔ کہا ہے سونی کو لے آؤ۔ وہ آئسکریم والی دکان پر ہیں۔''

کوفت سے نگاہیں نکڑ پر جمائے سونی کی آنکھیں لمحے بھر میں چمک اٹھیں۔

''امی نے بھی جانا ہے ان کو لے آؤں'' سونی جلدی سے اندر کو مڑنے لگی تو نویدے نے اس کی کلائی پکڑی اور گود میں اٹھالیا۔

''نہیں امی کے لیے ابو ساتھ لے آئیں گے۔'' نویدے نے پچکارا تھا۔

''ساتھ لے آئیں گے تو آئسکریم پگھل جائے گی۔'' اتنا تو سونی کو پتا تھا۔

''نہیں کچھ ہوتا آؤ ہم چلیں۔ تم بتاؤ کتنی آئسکریم کھاؤ گی؟''

''اتنی'' سونی نے ہاتھ پھیلا کر اشارہ کیا۔ نویدے تیز قدم اٹھا گلی پار کرتا گیا۔

جیب میں پنچھے کو بیچنے سے ملی ہوئی رقم موجود تھی۔ قریب ترین جو بھی آئسکریم کی دکان آئی وہاں سے سونی کو آئسکریم لے کر دی تاکہ وہ بے چین ہو کر رونا اور چیخنا نہ شروع کر دے۔ آئسکریم کھاتے ہوئے سونی بے انتہا خوش تھی۔ اتنی خوشی کہ حساب ہی نہ تھا۔

☆......☆......☆

نویدا کا اصل نام نوید نہیں تھا۔ وہ نویدا ہی تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے آپ کو اس محلے کے ایک گھر کی ڈیوڑھی پر پایا تھا۔ جس کے بارے میں شریف لوگ سوچنے سے بھی کتراتے تھے۔

کسی کو اس کی پروا نہ تھی۔ پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملتا۔ جہاں کچھ کھانے کو دیکھا وہاں جھپٹ پڑا۔ جانوروں کی طرح بغیر پرورش و تربیت کے وہ بڑھتا رہا۔ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ کڑیل جوان ہو گیا۔

اب نویدے کو اہمیت ملنا شروع ہو گئی تھی؟ کئی کام وہ اپنے زور بازو پر کرتا تھا۔ اونچے اونچے گھروں والے پیسوں کا ڈھیر لگا دینے والے مرد ڈھونڈ لاتا۔

اسی ملک کی پیداوار ہونے کے باوجود ملک کے کسی ادارے یہاں تک کہ شناختی کارڈ دفتر میں بھی اس کا اندراج نہ تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس محلے کے اکثر لوگ (جن میں اکا دکا مرد اور بے تحاشا عورتیں تھیں) یونہی بے نشاں تھے۔

ایسے ہی ایک دن ایک خوب پیسوں والے صاحب نے فرمائش کی۔ Pedophilia کا رواج نہ تھا پر گلی کے کتے بلیوں کی طرح خود بخود جوان ہونے والا نویدا اتنا ہی خود غرض اور خود پرست تھا جتنا ایک گلی کا کتا ہوتا ہے۔ چھوٹی بچی چرا لایا۔

انھی دنوں اس کے ذہن میں خیال آیا کیوں نہ وہ خود کاروبار شروع کرے۔ چھوٹی بچیاں لے آئے گا تو چند سالوں بعد وہ اس کے لیے سونے کا انڈہ دینے والی مرغیاں ہی ثابت ہوں گی۔

چنانچہ اس نے دور کے گلی محلوں سے بچیاں چرائیں۔ پانچویں بچی پر اکتفا کرلیا۔ آخر انسان تھا کوئی کتا تو نہیں کہ بس بھرتا جاتا بھرتا جاتا۔ تھوڑا اور اچھے کا فرق تو انسان کو پتا ہوتا ہے اسی لیے وہ ہمیشہ تھوڑے اچھے کو زیادہ برے پر فوقیت دیتا ہے۔

☆......☆......☆

جہلم سے افسر بھائی، اسلام آباد سے ملازم بھائی اور گاؤں سے راشدہ آپا دوڑے چلے آئے۔ خبر ہی کچھ ایسی تھی۔

کہاں گئی سونی؟

گھر پر ایک سکوت بھری خاموشی نے ڈیرہ ڈال دیا۔

اخبارات میں اشتہارات دیے گئے۔ ٹی وی اور ریڈیوں پر اعلانات کیے گئے۔ زوار نے خود گلی گلی جا کر سونی کو ڈھونڈا پر تمام کوششیں لاحاصل ٹھہریں۔

سونی لاپتا ہو گئی۔ وہ رحمت جو چار نسلوں بعد خدا نے اتاری تھی۔ پتا بھی نہ چلا کھو گئی۔

''صبر کرو زوار'' صفدر بھائی نے خوب دلاسے

دیئے۔ جہلم میں ان کے پاس افسری کا عہدہ تھا۔ تعلقات بھی کچھ نہ کچھ تھے لیکن تمام تعلقات استعمال کرنے کے باوجود سونی کا پتا نہ چل سکا تھا۔

''صبر۔۔۔۔'' زوار نے درد سے سوچا تھا۔

''میری بیٹی کھوگئی اور آپ کہتے ہیں صبر کروں'' زوار چیخ پڑے۔

صفدر بھائی نے زوار کا ہاتھ پکڑا اور ہولے ہولے دبانے لگے ان کے لمس میں پیار بھری تسلی شامل تھی۔

زوار نے لمحے بھر میں ہاتھ جھٹک دیا۔

''مجھے آپ کی ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔ کیسے افسر ہیں آپ ایک بچی کو نہیں ڈھونڈ سکتے۔'' زوار ہذیانی انداز میں چیخنے لگے۔ نم آنکھوں والی راشدہ رضاعی بھائی کو درد بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

''زوار تم خود کو پریشان نہ کرو، سونی مل جائے گی۔ انشاء اللہ'' اسلام آباد سے آئے اسلم بھائی تسلی دیتے تھے۔

''کیسے مل گے، دو ہفتے ہونے کو آئے ہیں اور کوئی سراغ ہی نہیں مل رہا۔ میں کیا کروں۔ خودکشی ہی نہ کرلوں۔'' زوار رونے لگے اور روتے ہی چلے گئے۔

کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ انھیں چپ کروائے۔

زوار کے بالمقابل بیٹھی رخسار خالی نظروں سے زوار کو دیکھتی رہ گئی۔ پچھلے دو ہفتے میں اس نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اب لگتا تھا جیسے آنکھیں ہی خشک ہوگئی ہیں۔

''صدیوں بعد ہمارے خاندان میں بیٹی پیدا ہوئی تھی سب کتنے خوش تھے۔'' زوار روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ سب سر جھکائے بیٹھے رہ گئے۔

''ابو کی خوشی کا تو ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ میری سونی کا نام سونیا بھی انھوں نے ہی رکھا تھا اور مجھے یاد ہے کہ سونی کی پیدائش پر ابو نے مجھ سے کہا تھا کہ اتنا خوش وہ کبھی نہیں ہوئے تھے۔'' الفاظ ٹوٹنے لگے تھے۔

''سونی کہاں ہو؟ یا اللہ یہ کیسی آزمائش ہے؟'' زوار چیختے رہے، روتے رہے، رونے کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟

☆......☆......☆

اور پھر سونی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔

دور سے آئے بہن بھائی تسلیاں دیتے اور صبر کی تلقین کرتے رخصت ہوگئے۔ وہ بھائی جنھوں نے اپنے ہر بیٹے کی پیدائش پر بیٹی کی تمنا کی تھی اور زوار کے ہاں سونی کی پیدائش پر اتنے ہی خوش تھے جیسے خود ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے جاتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

''شکر خدا کا کہ اس نے ہمیں بیٹی نہ دی۔ اگر وہ گم ہوجاتی تو۔۔۔۔'' اس سے آگے وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

گھر میں چھائی خاموشی گھٹا ٹوپ ہونے لگی تھی۔

زوار بولائے بولائے سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے اور پھر سے پہلے کمرے میں آجاتے۔

رخسار الٹ پلٹ کر سونی کے کھلونوں کو دیکھتی اور سینے سے لگا کر رونے لگ جاتی۔ بھوک کا احساس ہوتا تو بھی دونوں میاں بیوی ڈھیٹ بنے بھوک کے درد کو برداشت کرتے رہتے۔ کئی کئی پہر حلق سے ایک نوالہ نہ اتارتے۔ گھر ایسا میلا ہوگیا جیسے صدیوں سے صفائی نہ کی گئی ہو۔ خود رخسار اور زوار کس قدر ملگجے حلیے میں رہنے لگے تھے۔

غم ایسا تھا کہ لگتا تھا کہ کلیجہ درد سے ہی پھٹ جائے گا اور وہ مرجائیں گے لیکن عجب بات تھی نہ کلیجہ پھٹتا تھا اور نہ ہی وہ مرتے تھے۔ دن کے دن گزر جاتے دونوں میاں بیوی بات نہ کرتے۔ کرنے کو جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔

ایسے ہی دن گزرتے جارہے تھے۔ دفتر سے ایک خط آیا، دوسرا خط آیا اور پھر تیسرا اور آخری خط آیا۔ تیسرے خط میں مطلع کیا گیا تھا کہ زوار کو نوکری سے برخاست کردیا گیا ہے۔

جب تیسرا خط موصول ہوا تھا اور زوار بیٹھے پڑھ رہے تھے تب رخسار بھی ساتھ والی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ نگاہیں زوار پر جمائے زوار کو دیکھتے ہوئے بھی انھیں نہ دیکھ رہی تھی۔

''دفتر سے خط آیا ہے۔ مجھے برخاست کردیا گیا ہے'' خط پڑھنے کے بعد زوار نے خود ہی کہا تھا۔ خط

ساتھ تپائی پر پھینکنے کے انداز میں رکھا تھا۔ رخسار نگاہوں کا زاویہ تبدیل کیے بغیر زوار کو یونہی دیکھتی رہی۔ جیسے اس خبر کا ہونا نہ ہونا ایک سا تھا۔

کئی لمحے یونہی خاموشی میں گزر گئے۔ دونوں میاں بیوی خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر رخسار بولی۔ جیسے مدت بعد میاں بیوی مخاطب ہوئے ہیں۔

''سونی کب ملے گی زوار؟''

زوار جواب نہ دے پائے۔ جواب دینے کے لیے ان کے پاس الفاظ نہیں تھے اور ایک بار پھر خاموشی چھاگئی۔ ایسی خاموشی جو زندگی کو نگلنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد زوار بولے۔ ان کی آواز میں کرب تھا۔

''سوچتا ہوں کہ ہم شہر کی بجائے کسی چھوٹے سے گاؤں میں رہتے۔ یوں میری بیٹی تو نہ گم ہوتی''

رخسار کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ رخسار کو روتے دیکھا تو زوار کی آنکھیں بھی خود بخود بھر آئیں۔

''خدا نے مجھے بیٹی دی تو خدا کا شکر ادا نہ کرتے تھکتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ کاش بیٹی کی جگہ بیٹا ہوتا۔ پتا نہیں اس ظالم زمانے نے میری بیٹی کے ساتھ کیا حال کیا ہوگا۔'' رخسار تڑپ اٹھی۔ شوہر کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''ایسی باتیں مت کرو زوار۔ میری سونی بہت چھوٹی ہے۔'' رخسار کے رونے میں روانی آگئی تھی۔

''ہاں ہماری سونی تو بہت چھوٹی ہے۔ ابھی تو اسے دائیں اور بائیں جوتے کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ آنسوؤں نے زوار کا پورا چہرہ بھگو دیا تھا۔ لاڈلی کی ہر ہر بات یاد آتی تھی۔

''ہاں زوار۔ وہ خود سے صحیح جوتا بھی نہیں پہن سکتی تھی۔ اور کولر سے پانی بھی نہیں بھر سکتی تھی۔ اسے کولر کی ٹونٹی دبانا نہیں آتا تھا اور اسے پیاس بھی ہر آدھے گھنٹے بعد لگتی تھی۔ سارا دن میرا سر کھاتی رہتی کہ پانی بھر دو اور جب پانی پیتی تو سارے کپڑے بھی گیلے کر دیتی۔ گلاس کا منہ بڑا ہوتا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے پانی بہتا۔ دونوں میاں بیوی کا ایک ہی غم تھا۔

''اور وہ نظم جو وہ صبح شام گاتی تھی مچھلی ہوں میں مچھلی ہوں۔۔۔'' آنکھیں آنسوؤں سے اتنی بھر گئیں کہ سامنے بیٹھی رخسار دھندلی دکھائی دینے لگی تھی۔

''مچھلی نہیں تتلی، تتلی ہوں میں تتلی ہوں۔'' کہتے ہوئے رخسار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''تمھیں وہ نظم آتی ہے؟''

''تھوڑی تھوڑی''

''سناؤ پھر۔۔۔'' زوار نے بوجھل آواز میں فرمائش کی تھی۔

''نہیں۔۔۔'' آنسو صاف کرتے رخسار نفی میں سر ہلانے لگی۔

''پلیز۔۔۔'' زوار کے لہجے میں التجا در آئی۔

''سناؤ رخسار پلیز۔۔'' زوار نے آنکھیں رگڑی تھیں۔ ہچکیاں لیتی رخسار شوہر کو دیکھے گئی۔ پچھلے چند دنوں نے کیسے تومند سرخ چہرے والے زوار کو کمزور اور لاغر کر دیا تھا۔

چند لمحے خاموشی نے سمیٹ لیے اور پھر کمرے میں رخسار کی آواز گونجنے لگی۔

تتلی ہوں میں تتلی ہوں
پھولوں سے میں نکلی ہوں

آنسوؤں کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔

''ٹھنڈا پانی پیتی ہوں
اوپر پنکھا چلتا ہے
نیچے منا سوتا ہے''

ہچکیاں الفاظ بھی صحیح طرح سے ادا کرنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔

منے کی ماں موٹی
کھائے ڈبل روٹی
ڈبل روٹی خراب
منے کی مم ماں ناراض۔۔۔۔''

خاموشی سے روتے زوار نظم کے ختم ہونے تک بلند آواز میں رو رہے تھے۔

☆......☆......☆

(جاری ہے)

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں
دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے ٹکڑے بھی

گردش!



جاوید راہی

جاوید راہی کے شرربار قلم کا شاہکار، طویل کہانی نمبر کی سوغات

ایک ایسی ڈکیتی کی واردات، جو آپ کو کبھی نہ بھولے گی

بیگم احمد شاہ ایک معصوم صفت خاتون تھیں' دو بیٹیاں اور ایک بیٹی کی ماں تھیں' شوہر کی موت کے بعد کافی بیمار رہنے لگی تھیں لیکن دونوں بیٹے عثمان شاہ اور عادل شاہ ماں کے بڑے فرماں بردار تھے۔ عثمان شاہ بہترین ملازمت کرتا تھا جبکہ چھوٹا بیٹا عادل پڑھ رہا تھا۔ بیٹی ندیمہ کی شادی کر دی اور وہ امریکہ چلی گئی تھی۔ عادل شاہ' عثمان سے ایک سال چھوٹا تھا۔ بیگم احمد شاہ کی خواہش تھی کہ جلد از جلد عثمان کی شادی کر دیں مگر عثمان کا اصرار تھا کہ عادل کے ایم بی بی ایس مکمل کر لینے کے بعد دونوں بھائی ایک ساتھ شادی کریں گے۔

بیگم احمد شاہ نے اپنے شوہر کی زندگی میں اتنے راج نہ کیے ہوں گے جتنے عثمان نے انہیں کرا دیئے تھے۔ عثمان ایک ایسے سرکاری محکمے میں ملازم تھا جہاں اوپر کی آمدنی اصل آمدنی ہوتی ہے۔ پہلی تاریخ والی آمدنی تو اس کے گھر کی دو کاروں کا پٹرول بھی پورا نہیں کر سکتی تھی اور اب تو عثمان نے شہر کے فیشن ایبل علاقے میں جدید طرز کی ایک کوٹھی بھی خرید لی تھی جہاں وہ اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک خانساماں' ایک ڈرائیور' ایک ملازمہ اور دو خدمت گاران تینوں ماں بیٹوں کے ناز نخرے پورے کرنے کیلئے ہمہ وقت موجود رہتے۔ شام کو عثمان کے کچھ دوست آجاتے تو اوپر والے حصے میں اکثر تاش کی بازی جما کرتی۔

پھر عادل کا ایم بی بی ایس کا فائنل نتیجہ آ گیا جس میں وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب قرار پایا تھا۔ بس اس کے بعد تو بیگم احمد شاہ کے پاس اپنے دونوں بیٹوں کیلئے لڑکیاں دیکھنے کے سوا کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ عادل نے تو یہ کام اپنے ماں کی مرضی اور منشاء پر چھوڑ دیا تھا مگر عثمان کی خواہش تھی کہ وہ شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لے' چنانچہ اس کے دوستوں کی بیویاں اور بیگم احمد شاہ رات دن اسی کام میں لگی ہوئی تھیں۔

مگر اس وقت عثمان ہر بات کو بھول گیا جب اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی گلی میں کار موڑی اس وقت اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ گلی میں خلافِ معمول لوگ کھڑے تھے اور اس کے گھر کے سامنے پولیس کی ایک وین بھی موجود تھی' اس کا چھوٹا بھائی کسی پولیس والے سے گفتگو کر رہا تھا۔ عثمان نے

اپنے گھر کے دروازے پر نگاہ ڈالی تو وہاں اسے اپنی والدہ حیران پریشان کھڑی دکھائی دیں۔ عثمان نے والدہ اور بھائی کو دیکھ کر اطمینان کا سانس ضرور لیا مگر پولیس کی موجودگی حالات کی کسی بڑی خرابی کا سراغ دے رہی تھی اور اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے گھر یقیناً ڈاکہ پڑا ہے مگر اسی لمحے اس کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا تھا۔ تھانے کا انچارج خود بھی جائے واردات پر چار پانچ سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ عثمان نے کار ایک طرف کھڑی کی اور باہر نکلا تو عادل تیزی سے اس کی طرف آیا۔ عادل اس کے سامنے پہنچ کر روہانی صورت بنا کر بولا۔

"بھیا!؟ ڈاکو سب کچھ لے گئے سب کچھ"

"اللہ مالک ہے یار" عثمان نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا اپنے آپ کو سنبھالنے کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا' پھر وہ اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے بولا۔

"آپ اندر جایئے امی۔" اور اس کی والدہ اس کے کہنے پر آنکھوں میں آنسو بھر لیے دروازے کی اوٹ میں ہو گئی تھیں۔ اپنی ماں کو اندر جانے کی ہدایت کر کے اور چھوٹے بھائی کی پیٹھ پر تسلی کی غرض سے ہاتھ تھپتھپاتا ہوا عثمان اس طرف بڑھا جہاں تھانہ انچارج کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پر تکلف انداز میں ہاتھ ملایا اور پھر عثمان نے اپنا تعارف کروانے کے بعد تھانہ انچارج کو گھر کے اندر چلنے کیلئے کہا۔

"ہم گھر کا معائنہ تو کر چکے ہیں جناب' ڈاکے کی پوری تفصیلات بھی معلوم ہو گئی ہیں' ڈاکوؤں نے آپ کے کمرے کی الماری بھی توڑ دی ہے۔" تھانہ انچارج نے کہا۔

"میرے کمرے کی الماری...... کیا مطلب؟" عثمان کی آنکھوں میں ایک لمحے کیلئے تشویش کی جھلک نظر آئی تھی۔

"ہمیں پورے ڈاکے کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے؟" انسپکٹر نے عثمان سے کہا۔ "آپ کے بھائی اور والدہ نے بتایا کہ شاید کچھ نقدی وغیرہ آپ کی الماری میں تھی مگر یہ بات انہیں نہیں معلوم کہ اس نقدی کی مالیت کیا ہے۔ یہ بات آپ ہمیں بتا دیں تاکہ ہم



دیگر کاروائی کرسکیں۔"
عثمان نے انسپکٹر کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے عادل سے پوچھا "کیا کیا چیز گئی ہے؟"
"امی کے سارے زیورات، پرائز بانڈ اور دس لاکھ روپے نقد جو امی کی الماری میں رکھے تھے" عادل نے روہانسے لہجے میں کہا۔
"سارے پرائز بانڈز" عثمان نے پوچھا۔
"جی ہاں تقریباً دو لاکھ روپے کے تھے وہ سب۔" عادل نے جواب دیا۔
"آپ کی والدہ کا خیال ہے کہ زیورات کی مالیت پندرہ لاکھ روپے تھی۔" انسپکٹر نے دونوں بھائیوں کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔
"آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے آدمی ہیں اتنی بھاری مالیت کے زیورات اور پرائز بانڈز آپ نے بینک کے لاکر میں کیوں نہیں رکھ دیئے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ حالات ان دنوں بہت خراب ہیں۔"
عثمان نے ایک بار پھر انسپکٹر کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس سے کہا وہ ذرا گھر کے اندر کا ایک چکر لگا آئے اور اپنے کمرے کو بھی چیک کر لے تاکہ ڈاکہ میں جانے والی اشیاء اور نقدی کا خود بھی اندازہ لگا سکے۔ وہ گھر کے اندر چلا گیا اور انسپکٹر قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جو ملازم نے تھوڑی دیر پہلے لاکر دی تھی۔
عثمان جیسے ہی پورچ سے ہو کر بند گھر میں داخل ہوا تو بیگم احمد شاہ اس کے گلے لگ کر رونے لگیں، ان کی آنکھوں سے برسات ہو رہی تھی، وہ روتے ہوئے بولیں۔
"میرے بیٹے کی محنت لوٹ کر لے گئے کمبخت مارے، خدا غارت کرے ان تینوں کو، برباد کر دیا میرا پورا گھر ظالموں نے۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگیں۔
"آپ کیوں فکر کرتی ہیں میرے ہاتھ کی لکیریں تو کاٹ کر نہیں لے گئے۔" عثمان نے اپنی ماں کی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کرتے ہوئے کہا۔
"آپ اپنی طبیعت ٹھیک رکھیں امی، ہر برے کام میں کوئی نہ کوئی اچھائی بھی ہوتی ہے، اگر وہ ڈاکو خدانخواستہ آپ کو یا عادل کو نقصان پہنچا دیتے تو۔" عثمان نے کمال ضبط سے اپنی ماں کو تسلی دی۔
"تو اپنا کمرا دیکھ لے بیٹا، تیری الماری بھی ان کمینوں نے توڑ ڈالی ہے۔" بیگم احمد شاہ نے بمشکل کہا۔
عثمان کو خود بھی اپنے کمرے میں جانے کی جلدی تھی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی نظر سب سے پہلے الماری پر گئی۔ جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اس نے سب سے پہلے الماری کے دونوں لاکر دیکھے جو ٹوٹے ہوئے تھے پھر اس نے جلدی سے اوپر والے خانے میں پوشیدہ لاکر کو دیکھا تو اس کا چھوٹا سا پٹ بھی کھلا ہوا تھا، عثمان نے جلدی سے اس میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو اندر کچھ بھی نہیں تھا، یک لخت اس کا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا، اس نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگوں کا دم کسی نے نکال لیا ہے اگر وہ عقب میں کھڑی ہوئی اپنی ماں کو نہ دیکھ لیتا تو شاید اپنی لڑکھڑاہٹ پر زبردستی قابو نہ پا سکتا جس نے اس کے جسم کو لرزا کر رکھ دیا تھا، اس کی ماں حیرت اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"کیا تیرے بھی کچھ پیسے یہاں رکھے تھے؟" بیگم احمد نے ہولے سے سرگوشی کی۔
"نہیں تھوڑے سے پیسے ہی تھے اوپر والے خفیہ لاکر میں۔" عثمان نے اپنی ماں کو جواب دیا اور قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے تولیے سے عثمان نے اپنے چہرے اور پیشانی کا پسینہ پونچھا اس کے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ لوٹ مار کرنے والے اس کی الماری کے خفیہ خانے سے ستر لاکھ روپے بھی لے گئے تھے۔ ان ستر لاکھ روپوں کے بارے میں عثمان نے اپنی ماں اور بھائی کو بھی نہیں بتایا تھا، اسے ویسے ہی اپنی آمدنی چھپانا مشکل تھی۔ لہٰذا ان ستر لاکھ روپوں کے بارے میں کیا بتاتا۔ اس کے چھوٹے بھائی کو تو کسی حد تک اندازہ تھا کہ عثمان

رشوت لیتا ہے مگر ماں نے جب بھی زیادہ آمدنی کے بارے میں سوال کیا تو عثمان نے اسے محض اللہ کا فضل ہے کہہ کر بات ٹال دی۔ بیگم احمد کا تعلق جس زمانے کی عورت سے تھا وہ واقعی اتنی ہی سیدھی سادھی ہوا کرتی تھیں کہ اولاد کی کوئی برائی اسے برائی ہی نہیں محسوس ہوتی تھیں۔

عثمان کو ملازمت کرتے ہوئے چار پانچ سال ہو گئے تھے مگر اس کی پوسٹنگ ایک ایسی سیٹ پر تھی جہاں دھن برستا تھا۔ ان چند برسوں میں اس نے اپنے آباؤ اجداد کی تمام کسریں پوری کر لی تھیں۔ بہت سی دولت اس نے اپنی بہن کے توسط سے امریکا منتقل کر دی تھی۔ اپنے گھر کے علاوہ اس کے چھ سات پلاٹ مختلف علاقوں میں تھے۔ اس کے علاوہ ایک انڈسٹریل پلاٹ بھی اس کی ملکیت تھا مگر اس تمام جائیداد میں سے کچھ بھی اس کے نام نہیں تھا' یا تو اس کے چھوٹے بھائی یا ماں کے نام تھا۔ دو پلاٹ تو اس نے اپنے گہرے دوستوں کے نام پر خریدے تھے۔ دوستوں میں عثمان کی مقبولیت کا سبب اس کا کشادہ دست ہونا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صرف اور صرف پیسے کو جمع کرنے کیلئے حاصل کرتے ہیں بلکہ اس کے مزاج کی رنگینی نے اسے کسی حد تک شاہ خرچ بھی کر دیا تھا' لہٰذا اس کا حلقہ یاراں بڑھتا ہی چلا گیا مگر آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہے۔ کہنے کو تو اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ اس کی الماری سے کچھ ہزار روپے غائب ہیں مگر اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا اور صحن سے ہوتا ہوا باہر گلی میں آ گیا جہاں اس کا چھوٹا بھائی اور پولیس والے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''میری الماری سے بھی پچیس ہزار روپے غائب ہیں انسپکٹر صاحب۔'' عثمان نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔ انسپکٹر نے کاغذ پر کچھ نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی والدہ نے پرائز بانڈز اور زیورات کی جو مالیت بتائی تھی کیا وہ درست ہے؟''

''وہ پرائز بانڈز دراصل میرے ایک دوست کے تھے لیکن اس میں سے بہت سے میں نے اپنے دوست کو واپس کر دیئے تھے' یہ بات میری والدہ کے علم میں نہیں تھی' میرا خیال ہے کہ ڈاکو تمام بانڈز لے گئے۔''

''اور زیورات کی مالکیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' انسپکٹر نے سوال کیا۔

''ان زیورات کی مالیت اگر میری والدہ پندرہ لاکھ کی بجائے پچاس لاکھ روپے بھی بتائیں تو کم تھی۔'' عثمان نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا' ذرا صاف صاف بات کریں؟'' انسپکٹر نے رکھائی سے کہا۔

''یہ دراصل جذبات کا معاملہ ہے۔'' عثمان نے آہستگی سے کہنا شروع کیا۔ ''وہ زیورات میری والدہ کے پاس میرے والد کی نشانی تھے' میرا مطلب ہے کہ وہ ان کی شادی کے وقت سے ان کے پاس تھے اور وہ انہیں سنبھال کر رکھتی تھیں۔'' عثمان نے ذرا سا توقف کیا اور پھر بولا۔

''آپ تو جانتے ہیں کہ انسانی جذبات اور احساسات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی مگر میرا خیال ہے کہ زیورات کی مالیت قیمتوں کے حوالے سے دو تین لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔''

انسپکٹر نے حیرت سے عثمان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ''میں آپ کی حقیقت پسندی اور سچائی سے بہت متاثر ہوا جناب' ورنہ آج کل تو لوگ چوری یا ڈاکے کے بعد اپنے سامان اور نقدی کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے' حالانکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکے یا چوری کا سامان شاز و نادر ہی واپس ملتا ہے'' انسپکٹر نے عثمان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ویسے آپ فکر نہ کریں میں کوشش کروں گا کہ ڈاکو بچ کر نکلنے نہ پائیں۔ آپ کے آنے سے پہلے ہی میں نے علاقے کی ناکہ بندی کا حکم دے دیا تھا۔''

''جی تھینک یو۔'' عثمان نے جواب دیا۔

انسپکٹر جمشید نے ذرا سے فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک شخص کو اشارہ سے اپنی طرف بلایا تو عثمان نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے یہ شخص معمولی حیثیت کا حامل دکھائی دیتا تھا۔ انسپکٹر کے بلانے پر وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا قریب آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اس نے تھکے انداز میں کہا۔

''جی سر۔''

''اب تم جاسکتے ہو اگر تمہاری ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لیا جائے گا۔'' انسپکٹر کا لہجہ تحکمانہ تھا۔''یاد رکھو' پولیس کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے کہیں باہر مت جانا۔''

''ٹھیک ہے سر۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

عثمان نے استعجابیہ انداز میں عادل سے پوچھا''کون ہے یہ؟''

''یہ لائن مین ہے بھائی' فرید خان ہے اس کا نام' جس وقت ڈاکو ہمارے گھر میں گھسے ہوئے تھے یہ ہمارا فون ٹھیک کرنے کیلئے آیا تھا' جب اس نے بیرونی گھنٹی بجائی تو ڈاکو چونک پڑے' ان میں سے ایک باہر آیا اور اس کو محکمہ ٹیلی فون کا بندہ جانتے ہوئے اندر لے گیا' یہ غریب سمجھا کہ گھر میں بلانے والا اہل خانہ کا کوئی فرد ہوگا چنانچہ یہ اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی ان لوگوں نے اس کے بھی ہاتھ پیر باندھے اور آپ کے کمرے میں ڈال دیا۔ انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا' جب وہ لوگ ڈاکہ ڈال کر فرار ہو گئے تو ہم نے اسے کھولا۔ یہ شدید دہشت اور خوف کا شکار ہے۔ پولیس والوں نے اسے بھی پوچھ گچھ کیلئے روک لیا تھا۔''

''تم نے کیا کیا دیکھا ہے؟'' انسپکٹر کی موجودگی میں عثمان نے فرید خان سے پوچھا۔

''دیکھنا کیا تھا صاحب جی۔۔۔ گھر میں گھستے ہی انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔'' فرید خان نے مسکینی سے کہا''میری جیب سے بھی پانچ سو روپے نکال کر لے گئے۔''

''کیا تم ان میں سے کسی کو پہچانتے ہو؟'' عثمان نے فرید خان سے سوال کیا لیکن جواب انسپکٹر نے دیا تھا۔

''میں اس سے پوچھ گچھ کر چکا ہوں' جو ڈاکو اسے اندر لے گیا تھا اس نے بس ذرا دیر کیلئے نقاب اُتاری تھی' باقی دونوں ڈاکو تو نقاب پہنے ہوئے تھے لیکن آپ یہ بتایئے کہ کیا آپ کو کسی پر شک ہے کیونکہ آپ کی والدہ اور بھائی نے تو کسی پر شبے کا اظہار نہیں کیا ہے؟'' انسپکٹر نے عثمان کی طرف رُخ کرتے کہا۔

''نہیں انسپکٹر صاحب! ہم لوگوں کی تو کسی سے دشمنی نہیں ہے لہٰذا ہم کسی پر شبہ کیسے کر سکتے ہیں؟''

انسپکٹر جمشید نے اس پر اصرار کرتے ہوئے کہا''آپ کا خیال درست ہوسکتا ہے ممکن ہے کہ یہ کوئی روٹین کی ڈکیتی ہو مگر پھر بھی ڈاکو ہمیشہ ڈاکہ ڈالنے سے پہلے حالات ضرور معلوم کر لیتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ اپنے ملنے جلنے والوں پر توجہ دیں۔ ہوسکتا ہے اس واردات میں کسی کا ہاتھ ہو؟''

''ٹھیک ہے' ہم لوگ غور کریں گے۔'' عثمان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' انسپکٹر نے عثمان اور عادل سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا''اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے فوری مطلع کریں۔'' انسپکٹر دیگر سپاہیوں کے ساتھ وین میں سوار ہو کر چلا گیا تو محلے کے دیگر لوگ اظہار ہمدردی کی غرض سے عثمان کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد عثمان ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا تو اہل محلہ میں سے کچھ لوگ بیٹھ کر ڈاکے کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔ عثمان کو ان لوگوں سے اُلجھن ہو رہی تھی وہ چاہتا تھا کہ اُٹھ کر اندر چلا جائے مگر کچھ تو مروت اور کچھ یہ کہ اندر گھر میں محلے کی عورتیں بھی اس کی ماں کے پاس موجود تھیں مجبوراً ڈرائینگ روم ہی میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے اس کا موبائل لا کر دے دیا جس کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ موبائل پر نمبر دیکھ کر عثمان نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگوں سے معذرت کی اور اُٹھ کر باہر آ گیا' باہر آ کر اس نے فوراً فون اُٹھا لیا۔

''میں نے تمہیں منع کیا ہے کہ دفتری اوقات میں مجھے فون نہ کیا کرو۔'' عثمان نے جھنجلاہٹ اور بیزاری

سے سرگوشی کی اس نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ اس کی آواز کوئی دوسرا فرد نہ سننے پائے۔

''تمہارے دفتر ہی فون کیا تھا تو پتا چلا کہ تم اچانک گھر چلے گئے ہو' گھر کا فون بھی نہیں مل رہا تھا۔ موبائل بھی اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا' اب جا کر تم نے فون ریسیو کیا ہے۔'' دوسری طرف سے زارا نے جواب دیا۔

''میں ابھی تم سے بات نہیں کر سکتا شام تک وقت ملے گا تو خود فون کروں گا۔'' عثمان نے رکھائی سے کہا۔

''کیا آج شام کو آؤ گے نہیں؟'' زارا نے نرمی اور لگاؤ سے پوچھا۔

''شاید نہیں بلکہ بالکل نہیں۔''

''کیا بات ہے؟ تم پریشان لگ رہے ہو' طبیعت تو ٹھیک ہے دفتر سے اچانک اُٹھ کر گھر کیوں آ گئے؟'' زارا نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال کر ڈالے۔

''میں کہہ رہا ہوں نا کہ شام کو بات کروں گا۔'' عثمان نے ترشی سے کہا اور سیل فون بند کر دیا۔

اگر عثمان اپنے گھر میں ہونیوالی ڈکیتی سے خستہ حال نہ ہوتا تو بھی وہ زارا سے اسی طرح بات کرتا۔ زارا اب اس کیلئے جی کا جنجال ہوتی جا رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس سے تعلقات کی اسے زندگی بھر قیمت ادا کرنی ہو گی۔ شروع شروع میں تو عثمان کو اس نے اپنے ایسے دکھڑے سنائے کہ وہ نرم پڑ گیا۔ اپنی اداؤں سے کچھ دنوں تک تو اس نے عثمان کو واقعی لبھایا بھی اور اس کے جسم و جان کی تشنگی کو دور بھی کیا' یہی وجہ تھی کہ عثمان نے اسے ایک فلیٹ کرائے پر لے کر دیا اور اسے بیس ہزار روپے مہینہ بھی لگا دیا۔

وہ اس فلیٹ میں اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی' عثمان ہفتے میں ایک آدھ رات زارا کے فلیٹ میں بسر کرتا۔ جس رات وہ زارا کے گھر میں ہوتا زارا کا ماموں کسی کام سے کہیں اور چلا جاتا' شب بسری کے جواب میں عثمان جو تحفے تحائف زارا کو دیتا وہ معمول کی رقم کے علاوہ ہوتے تھے یہی وجہ تھی کہ زارا اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے رکھتی۔

زارا نے عثمان کو بتا رکھا تھا کہ شادی کے چھ مہینے بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی بچی اپنی نانی کے پاس دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ عثمان غیر معمولی ذہانت رکھنے والا نوجوان تھا' اسے زارا کے ماضی سے کوئی غرض نہیں تھی وقت گزاری کیلئے زارا اسے میسر تھی لہٰذا وہ محض اسے اپنی رنگین مزاج طبیعت کو بہلانے کا ایک کھلونا سمجھتا' اس کے کچھ قریبی دوستوں کو بھی معلوم تھا کہ اس نے ایک داشتہ بھی رکھی ہوئی ہے۔

ان دنوں عثمان کا دل زارا کی طرف سے اس لیے اوبھ گیا تھا کہ اب وہ شادی پر اصرار کرنے لگی تھی اور یہ مطالبہ ماننا عثمان کیلئے تقریباً ناممکن تھا۔ عثمان کی پریشانی اور اُلجھن کا سبب یہ بھی تھا کہ زارا کے پاس عثمان کی کچھ تصویریں بھی تھیں اور جس فلیٹ میں وہ رہتی تھی اس کے کرائے دار کی حیثیت سے کاغذات پر عثمان کے دستخط تھے۔ ویسے ابھی تک زارا نے عثمان کو نہ تو کوئی دھمکی دی تھی اور نہ اس کی باتوں میں کسی طرح کی بلیک میلنگ کا شائبہ ہوتا تھا مگر عثمان کے اصرار کے باوجود اس نے وہ تصویریں واپس نہیں کی تھیں۔ تصویریں ان دونوں کی ایک ساتھ تھیں اور یہ تصویریں زارا کے ماموں نے بنائی تھیں۔

اس کے علاوہ ایک بار عثمان نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس سے بڑا اور خوبصورت فلیٹ اپنے نام سے کرائے پر لے لے تو زارا نے یہ بات نہیں مانی تھی۔ اس طرح کے کچھ اور ایسے معاملات تھے جن سے عثمان کو زارا کی نیت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ دوسری طرف زارا اس سے شادی کیلئے اصرار کرتی رہتی تھی۔ ایک بار تو اس نے زارا سے صاف کہہ دیا تھا۔

''زارا میں شادی کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

''کیا مطلب۔۔۔ کنوارے رہو گے؟''

''ہاں! مجھے یہی زندگی پسند ہے۔''

''مگر مجھے پسند نہیں ہے۔'' زارا نے کہا۔

"تو پھر۔۔۔؟"
"اس کا فیصلہ تم خود کرو گے۔" زارا نے بھی سخت لہجے میں کہا اور عثمان کو غصہ آ گیا۔
"ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے کہا۔
"غلط' تم مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔"
"کیسا جھوٹ؟"
"میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم جانتے ہو کہ میری زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے جبکہ مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری امی تمہارے لیے رشتے دیکھتی پھر رہی ہیں۔"
"کون کیا کر رہا ہے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
"مگر مجھے ہے۔"
اس دن کے واقعے کے بعد عثمان کے دل میں زارا کی طرف سے بال آ گیا تھا۔ زارا کی عمر بے شک زیادہ نہیں تھی لیکن وہ اندر سے بہت گہری تھی اور اسے اپنے تجربے کار ماموں کی پوری سپورٹ حاصل تھی اور ماموں اسے مشورے دیتا رہتا تھا۔ اب وہ مسلسل عثمان کے پیچھے لگی رہتی تھی کہ وہ اس سے شادی کرے لیکن عثمان اسے ٹالتا رہتا تھا لیکن ان باتوں سے اسے شدید اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔
وہ زارا کے نہ صرف سارے اخراجات اٹھاتا تھا بلکہ اس نے زارا کو اور بھی بہت کچھ دیا تھا۔ سونے کے خوبصورت زیورات، ہیرے کی انگوٹھیاں، لباسوں کے انبار البتہ اب زارا سے اس کی خاصی اَن بَن رہنے لگی تھی اس نے کہا بھی تھا کہ زارا تم مجھے پسند ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن شادی نہیں کر سکتا۔
"اس کے لیے تم نے کسی اور کا انتخاب کر لیا ہے؟" زارا نے طنز سے کہا۔
"یہ بات بھی نہیں ہے۔" عثمان نے بیزار لہجے میں کہا اور زارا نے ایکدم نرمی اختیار کر لی' غالباً اس نے مصلحتاً ایسا کیا تھا۔
ایک رات عثمان دوستوں کی محفل سے رنگ رلیاں منا کر نشے میں مخمور زارا کے فلیٹ پر گیا تو ماموں وہاں موجود تھا۔ زارا اور ماموں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ عثمان کو ان کی یہ ہنسی ناگوار گزری تھی تاہم اس نے کچھ نہ کہا لیکن ماموں طنزیہ انداز میں بولا۔
"لو بھئی زارا۔ تمہارے ان داتا آ گئے اب ہم چلتے ہیں۔"
ماموں یہ کہہ کر چلا گیا لیکن عثمان کو اس کے الفاظ اور انداز بہت برا لگا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا تو اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی فریم میں لگی اپنی اور زارا کی ایک تصویر پر پڑی۔ اس کے دماغ میں آگ لگ گئی اس تصویر کو فریم میں لگوانا بھی ماموں اور زارا کی ایک سازش تھی تاکہ دیکھنے والے ان دونوں کی قربت کا اندازہ لگا سکیں۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے تصویر کا فریم اٹھا کر زمین پر پھینک دیا۔ شیشے کی کرچیاں کمرے میں بکھر گئیں۔
زارا نے یہ دیکھا لیکن اس نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا اور اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر عثمان کا غصہ اسی پر ٹھنڈا نہیں ہوا۔ اس نے ٹوٹے فریم سے تصویر نکال کر پرزے پرزے کر دی اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔
"تصویروں کے نگیٹو کہاں ہیں؟"
"وہ میرے پاس سے ضائع ہو گئے ہیں۔"
"بکواس کرتی ہو" وہ بولا اور زارا نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں بیئر کی بوتل اور گلاس وغیرہ تھے۔
دوسری صبح عثمان پرسکون تھا۔ آنکھ کھلی تو زارا نکھری نکھری خوبصورت گھریلو لباس میں بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر اداسی کے سائے تھے۔
"ناشتا بنا لوں۔" اس کے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔
"ایں' ہاں بنا لو۔" وہ اٹھ گیا زارا نے اسے بڑی اپنائیت سے ناشتا کروایا اس کی ہر چیز جوتے' ٹائی وغیرہ اس طرح رکھی تھی جیسے رکھتی تھی۔ ناشتے کے

بعد جب وہ چلا تو وہ اس طرح پیار بھرے لہجے میں بولی۔

"کب آؤ گے؟"

"کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔" وہ سرد لہجے میں بولا اور وہاں سے چلا گیا۔

اسے فریم میں لگی تصویر پر بھی غصہ آیا تھا کہ زارا نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی قانونی رشتہ نہیں ہے اس طرح دیدہ دلیری سے تصویر فریم کر کے کمرے میں سجا دی تھی۔ عثمان کو زارا کے اس رویے سے کسی خطرناک ارادے کی بو آئی تھی اور وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس لمحے عثمان یہ بھی بھول گیا تھا کہ زارا کسی بھی قسم کے ردِعمل کا اظہار کرسکتی ہے' اس واقعے کے بعد عثمان زارا کے فلیٹ پر نہیں گیا اور اس بات کو اب تقریباً دس گیارہ روز ہو گئے تھے۔

گزشتہ ویک اینڈ پر بھی وہ عثمان کا انتظار کرتی رہی مگر عثمان نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ والدہ کے بیمار ہونے کے باعث نہیں آسکتا اور اب زارا روز فون کر کے اسے بلا رہی تھی مگر وہ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔ اب وہ زارا سے ملاقات کو خود پر بوجھ تصور کرنے لگا تھا۔ اس کے خیال میں زارا اب حد سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

زارا سے بات کرنے کے بعد عثمان ڈرائینگ روم میں جانے کی بجائے اوپر والے کمرے میں آ گیا۔ یہاں تنہائی تھی اور وہ تنہا ہو کر سوچنا چاہتا تھا اس وقت اس کا دماغ ہر ملنے جلنے والے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ گھر کے ملازمین سے لے کر دفتر کے ساتھی تک پر اس کی نگاہ شک بھرے انداز میں پڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے عادل کو بلا کر ہدایت کی کہ اس ڈکیتی کی خبر اس کے قریبی دوستوں کو دے۔ اچانک اس نقصان سے عثمان کو شدید ذہنی صدمے کا سامنا تھا اور مستزاد یہ کہ وہ اتنے بڑے نقصان کا دعوے دار بھی نہیں تھا۔ اگر پولیس رپورٹ میں وہ اتنی ڈھیر ساری رقم درج کروا دیتا تو مختلف حساب دیتا پھرتا۔ ظاہر ہے کہ کالے دھن کی قانونی حیثیت ثابت کرنا بہت دشوار بات تھی حالانکہ تین چار مرتبہ تو اس نے کافی بڑی مالیت کے بانڈز خریدے تھے تاکہ کالا دھن ٹھکانے لگے اور اس کی مالی حیثیت کا سرکاری طور پر جواز نکل آئے۔

عثمان کمرے میں اکیلا بیٹھا ادھیڑ بن میں لگا رہا اس کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اتنے زیادہ نقصانات نے اس کے صبر کا پیمانہ چھلکا دیا تھا اس نے اپنے بھائی اور ماں پر تو یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے کتنا بڑا خسارہ ہوا ہے مگر اندر ہی اندر جتنے پیچ و تاب کھا رہا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا اس کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا مگر ان میں سے ایک آدھ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اپنا اثر و رسوخ رکھتا ہو اور اس وقت اسے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو سرکاری حلقوں تک رسائی رکھتا ہو۔ اچانک عثمان کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ فوری طور پر سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے ڈرائنگ روم تک آیا اس نے دیکھا کہ اظہار ہمدردی کرنے والے لوگ جا چکے تھے مگر کچھ عورتیں اب بھی لابی میں بیٹھی اس کی والدہ کو تسلیاں دے رہی تھیں۔ اس نے عادل کو اپنے گھر سے باہر جانے کی اطلاع دی اور جلد ہی واپس آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ تیزی سے چل پڑا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر جمشید نے کسی سے بات کر کے ریسیور کریڈل پر رکھا اور گھنٹی بجا کر اپنے دونوں سب انسپکٹروں کو طلب کیا۔ اس نے پرتفکر انداز میں میز پر پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھا اور غیر محسوس انداز میں پیپر ویٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے گھمانے لگا۔ پیپر ویٹ کی گردش کے ساتھ اس کا دماغ بھی بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا وہ آپ ہی آپ کسی بات پر معنی خیز انداز میں مسکرانا چاہتا تھا کہ اس کے دونوں معاون مستعد انداز میں اندر داخل ہوئے اور اس کے اشارے پر میز کی دوسری طرف والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

انسپکٹر جمشید کو اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اس کا معاون عملہ اس کے

رعب و دبدبے سے بہت الرٹ ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی اس کے سامنے بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر ابراہیم خاں اور گل زمان خود سے کوئی گفتگو کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ انسپکٹر جمشید ان دونوں کو دیکھ رہا تھا اور وہ دونوں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اس کی خاموشی دونوں کو اُلجھن اور تذبذب میں ڈال رہی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے نظریں ملائیں اور سب انسپکٹر گل زمان نے اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہوئے انسپکٹر جمشید سے کہا۔

''جی سر کیا حکم ہے؟''

''آج پٹرولنگ پر کون گیا تھا؟'' انسپکٹر جمشید نے دیوار گیر گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں ہی تھے جناب' میری گاڑی مشرقی علاقے میں تھی اور مغربی علاقے میں ابراہیم اپنے سپاہیوں کے ساتھ تھا۔''

''کیا آپ دونوں نے اپنے اپنے علاقے مخصوص کر رکھے ہیں؟''

''نہیں سر۔'' گل زمان نے کہا۔ ''جب اور جہاں ضرورت ہوتی ہے ہم لوگ پٹرولنگ کے لیے چلے جاتے ہیں یہ تقسیم تو اپنی آسانی کیلئے بیان کی گئی ہے' کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم دونوں قریب قریب ہی ہوتے ہیں۔ ویسے چونکہ یہ علاقہ بہت بڑا ہے لہٰذا ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر طرف نظر رکھی جائے۔''

''آج کی ڈکیتی کے بارے میں کیا خیال ہے تم لوگوں کا؟''

''پتا لگ جائے گا سر' ہماری گاڑیاں اب بھی چیکنگ پر گئی ہوئی ہیں اور مشتبہ لوگوں کی ہم نگرانی کر رہے ہیں۔'' سب انسپکٹر گل زمان نے مستعدی سے جواب دیا۔

''تمہیں خبر ہے کہ کل بڑے صاحب ہم سب لوگوں کو لائن حاضر کر دیں گے' یہ ایک ہفتے میں چوتھی ڈکیتی ہے ہمارے علاقے میں۔'' انسپکٹر جمشید نے سرد لہجے میں کہا۔

''مگر یہ تو معمولی نوعیت کی ڈکیتی ہے سر۔'' سب انسپکٹر گل زمان نے دامن بچاتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے غصے بھرے لہجے میں اسے گھورتے ہوئے زور سے کہا ''کوئی ڈکیتی بھی معمولی نوعیت کی نہیں ہوتی ڈکیتی صرف ڈکیتی ہوتی ہے اور پولیس والوں کو اس کا جواب دینا ہوتا ہے' اگر ہم اس بار بھی ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہے تو یہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔'' انسپکٹر جمشید نے ذرا سے وقفے کے بعد میز پر جھکتے ہوئے جیسے سرگوشیانہ انداز میں اپنے معاونین سے کہا ''اور میرا خیال ہے کہ یہ ڈکیتی معمولی نوعیت کی ہے بھی نہیں۔''

''کیا مطلب سر؟'' دونوں بیک وقت تعجب بھرے انداز میں بولے۔

''مجھے شبہ ہے کہ پولیس والوں کو صحیح رپورٹ نہیں دی جا رہی اس ڈاکے میں جتنا مال گیا ہے اس کے مقابلے میں پولیس کو بہت کم بتایا گیا ہے۔''

''وہ کیوں سر؟'' انسپکٹر گل زمان نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

''میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا گمان ہے کہ جس گھر میں ڈکیتی ہوئی ہے اس کے گھر والوں نے مختلف بیانات کسی خاص سبب سے دیئے ہیں۔ ماں اور چھوٹے بیٹے نے کچھ کہا اور بڑے بیٹے نے آ کر اس کی تردید کر دی۔ مجھے ضرور دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔''

''یہ تو بڑا عجیب کیس ہے سر؟'' سب انسپکٹر گل زمان نے کہا۔

''ہاں عجیب تو ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا ''مگر ہمیں اس کو حل ضرور کرنا ہے' ڈاکو ہمارے شہر سے بھاگنے نہیں چاہیے ہیں۔''

''میں نے کنٹرول ٹاور کو بتا دیا ہے۔'' ابراہیم خاں نے کہا۔

''یہ تو خیر اچھا کیا' اب تم یہ کرو کہ لائن مین فرید خان کو یہاں بلواؤ۔''

''یہ وہی لائن مین فرید خان ہے جسے ڈکیتی کے دوران ڈاکوؤں نے باندھ کر ڈال دیا تھا۔'' گل زمان نے پوچھا۔

''ہاں ۔۔۔ ممکن ہے اس سے کچھ سراغ مل سکے۔'' انسپکٹر جمشید کے ماتھے پر شکنیں پڑ رہی تھیں۔

''تم اس کام کیلئے ابھی نکل جاؤ' یہ اس لائن مین کے گھر کا پتا ہے۔'' انسپکٹر نے گل زمان کو ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ گل زمان نے کاغذ تھامنے کے بعد انسپکٹر جمشید سے اجازت طلب کی اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ سب انسپکٹر ابراہیم بھی اس کے ساتھ ہی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا لیکن جمشید نے اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گیا جبکہ گل زمان سیلوٹ کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

عثمان کو اس بڑے اور پرانے طرز تعمیر والے پلازہ میں مرزا شاہد کا فلیٹ ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ مرزا شاہد سے عثمان کی گہری دوستی تو نہیں تھی مگر اتنا میل جول ضرور تھا کہ عثمان کو اس کے پاس جانے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کالج میں پڑھتے تھے' تعلیم سے فارغ ہو کر عثمان سرکاری ملازمت میں چلا گیا ور شاہد نے صحافت اختیار کر لی۔ شاہد کے پاس صحافت کی کوئی ڈگری تو نہیں تھی مگر وہ محنت کر کے ایک مقامی اخبار میں کرائم رپورٹر ہو گیا تھا اور صحافتی حلقوں میں اس لیے اہمیت رکھتا تھا کہ اس نے پیشہ ورانہ طور پر بہت سے ایسے پردے اُٹھائے تھے کہ پولیس افسران بھی اس کی صلاحیتوں کا لوہا ماننے لگے۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کے باعث مرزا شاہد کی رسائی حکام بالا تک تھی لہٰذا عثمان کو اس وقت اس سے بہتر کوئی اور مناسب آدمی نظر نہ آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد عثمان' مرزا شاہد کے گھر کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا اور پوری روداد سنا رہا تھا۔ مرزا شاہد اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرتا رہا اور جب عثمان نے تفصیل سے پوری بات بیان کر دی تو شاہد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کوشش کرتے ہیں یار' دیکھا جائے گا تم فکر نہ کرو مجھ سے جو بن پڑے گا میں کروں گا۔''

''بس یار' میں تمہارے پاس اسی لیے آیا ہوں کہ یہ سب باتیں میں کسی اور سے نہیں کر سکتا تھا۔'' عثمان کے لہجے میں قدرے ممنونیت تھی۔

''میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔'' شاہد نے عثمان سے کہا' ''ویسے تم نے اچھا ہی کیا کہ پولیس رپورٹ میں تمام رقم درج نہیں کرائی۔''

''یہ تو میری مجبوری تھی۔'' عثمان نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا' ''میرا بس نہیں چلتا کہ میں ان ڈاکوؤں کو ختم کر دوں۔''

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے عثمان' اس معاملے میں ٹھنڈے مزاج سے کام کرنا پڑے گا' میں ابھی اپنے اخبار کے دفتر جانے کیلئے نکلنے ہی والا تھا' تم نے بروقت مجھے اطلاع دے کر بہت اچھا کیا ہے۔'' پھر وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا ''آؤ۔۔۔ میرے ساتھ چلو' میں تمہارے علاقے کے تھانے میں چلتا ہوں' دیکھیں ایس ایچ او کیا کہتا ہے؟''

عثمان کے کہنے پر مرزا شاہد نے اپنا اسکوٹر گھر پر ہی چھوڑا اور اس کی کار میں آ بیٹھا۔ عثمان نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی جائے گا اس کو وہاں پہنچا دے گا۔

☆☆☆

عثمان جب شاہد کے ساتھ تھانے کی عمارت میں داخل ہوا تو اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ شاہد کے تعلقات تھانے میں کیسے ہیں۔ انسپکٹر جمشید کے کمرے میں وہ بغیر کسی اجازت کے اندر داخل ہو گیا۔ عثمان بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے گفتگو کے دوران نظریں اُٹھا کر ان دونوں کو دیکھا پھر فون بند کر کے کرسی سے ذرا سا اُٹھا اور مرزا شاہد سے ہاتھ ملایا پھر عثمان کی سمت دیکھ کر بولا۔

''یہ آپ کے دوست ہیں غالباً۔'' یہ کہہ کر اس نے عثمان کی طرف بھی مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھا دیا۔

''بالکل اور ہمارے دوست آپ کے بھی دوست ہوئے انسپکٹر صاحب۔'' شاہد مرزا نے بے تکلفی سے کہا۔

''اس میں کیا شک ہے۔'' جمشید نے خوش

اخلاقی سے کہا۔
''لیکن دوستوں کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہو تو افسوس ہوتا ہے۔''
''کیوں نہیں مجھے واقعی ان کے گھر ڈکیتی کا افسوس ہے بیٹھیے آپ لوگ۔'' انسپکٹر جمشید نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ دونوں بیٹھ گئے۔
''میں نے اپنے دوست کو بڑی امید دلائی ہے۔'' شاہد نے کہا۔
''کس بات کی۔''
''یہی کہ انسپکٹر جمشید مختلف انسان ہیں وہ ان کا مال ضرور برآمد کرلیں گے۔''
''یقینا لیکن ۔۔۔'' انسپکٹر جمشید معنی خیز انداز میں خاموش ہوگیا۔
''لیکن کیا؟''
''یہ خود بھی تو ہمیں اپنا دوست سمجھیں۔ تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی۔''
''براہ کرم وضاحت کریں۔'' شاہد بولا۔
''یہ ہم سے بھی بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ انسپکٹر جمشید نے گہری نظروں سے عثمان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ عثمان نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن شاہد نے کہا۔
''آپ کا خیال درست ہے انسپکٹر جمشید۔ ایک شریف آدمی بہت سی مشکلات کا شکار ہوتا ہے۔ عثمان بھی ایک شریف آدمی ہیں اور سرکاری ملازم ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ سرکاری ملازم ۔۔۔'' شاہد نے اتنا ہی کہا تھا کہ انسپکٹر جمشید نے درمیان سے جملہ کاٹ دیا اور کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔
''مگر انہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''
''میں نے عثمان سے یہی کہا کہ انسپکٹر جمشید ہمارے دوست ہیں اور اب یہ آپ کے سامنے کچھ سچ کہنا چاہتے ہیں۔'' شاہد بولا۔
''بس بات یہ ہے کہ میں سرکاری ملازم ہوں۔''
''اس بات کو بار بار نہ دہرائیں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ شاہد صاحب آپ انہیں میرے بارے میں بتا کر نہیں لائے۔'' انسپکٹر کا موڈ پھر خراب ہونے لگا۔
''تمہیں سب کچھ سچ بتانا ہوگا عثمان ورنہ میرا یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''
''میں جانتا ہوں۔'' عثمان آہستہ سے بولا
''اس وقت ہم ذاتی حیثیت سے بات کر رہے ہیں اور میں ذاتی طور پر کوشش کروں گا کہ ڈاکو میرے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے پائیں لیکن آپ کو میرے سامنے ایک ایک لفظ سچ بتانا ہوگا۔'' انسپکٹر کا لہجہ پھر نرم ہوگیا۔
''تم پورا بھروسہ کرسکتے ہو عثمان۔'' شاہد بولا۔
آخر کار عثمان نے زبان کھول دی اور ساری روداد انسپکٹر جمشید کو بتانے لگا۔ اس نے رقم اور زیورات کی تفصیلات سے بھی انسپکٹر کو آگاہ کیا۔ انسپکٹر جمشید کو بھی اس تفصیل پر حیرت ہوئی تھی۔ بات اس کی توقع سے کہیں آگے کی تھی۔ اگر یہ پوری تفصیل میڈیا اور اخبارات کو حاصل ہو جاتی تو زبردست حاشیہ آرائی ہوتی۔ اس نے سوچا کہ واقعی اس کا اندازہ ٹھیک تھا اس کے سامنے حقیقت نہیں آئی تھی اور ڈکیتی کی اس واردات کا اصل پہلو کچھ اور تھا۔
آخر کار پوری کہانی اس کے علم میں آگئی اور اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔
''ٹھیک ہے مسٹر عثمان صورت حال ایک نئی منزل میں داخل ہوگئی ہے میں پوری کوشش کروں گا کہ ڈاکو میرے ہاتھ لگ جائیں اور آپ کا سب کچھ واپس مل جائے۔''
''بہت شکریہ انسپکٹر۔'' عثمان نے کہا' کچھ دیر کے بعد دونوں وہاں سے نکل گئے تھے۔

☆......☆......☆

عثمان کافی رات تک جاگتا رہا تھا۔ رات کے تین بجے کے قریب اسے سونے کا موقع ملا تھا لیکن اس کے باوجود وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا کیونکہ اس واردات کے صدمے نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ دوست بھی اسے گھیرے رہے تھے جتنے منہ اتنی باتیں' سب اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے تھے۔
غرض یہ کہ دن اسی میں گزر گیا تھا۔ نادر اور عامر

بھی اس سے اظہار ہمدردی کرنے آئے تھے لیکن اس وقت عثمان موجود نہیں تھا۔ رات کو وہ طرح طرح کے خواب دیکھتا رہا۔

دوسری صبح دروازہ زور سے بجا تو اس کی آنکھ کھل گئی اس نے چونک کر دیکھا تو ابھی صرف صبح کے سات بجے تھے۔

اتنی جلدی۔۔۔کون ہو سکتا ہے۔ ذہن بری طرح تھکا ہوا تھا' سر میں درد کا بھی احساس ہوا۔

''کون آگیا؟'' وہ عام طور سے صبح ساڑھے آٹھ بجے تک سونے کا عادی تھا۔ ویسے بھی اتنی بڑی واردات ہوئی تھی آج تو آفس بھی نہیں جانا تھا۔

دروازہ دوبارہ بجا تو وہ جھنجھلا گیا ''کون ہے؟'' وہ زور سے چیخا۔

''میں ہوں بھیا۔ دروازہ کھولیے۔'' یہ آواز اس کے بھائی عادل کی تھی۔

''خیریت ہے عادل!'' وہ کسی قدر پریشان ہو گیا اور فوراً بستر سے نیچے اُتر آیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور دوبارہ بولا ''خیریت؟''

عادل کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور اس کے ہاتھ میں کھلا اخبار نظر آرہا تھا۔ اس نے اخبار عثمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ خبر پڑھیے'' اس نے کہا اور عثمان خبر پڑھنے لگا۔ اس کے گھر میں پڑنے والے ڈاکے کی خبر تھی لیکن اس کے علاوہ ایک اور خبر بھی تھی جس کے گرد عادل نے حاشیہ بنا دیا تھا۔ اس خبر نے عثمان کو بری طرح چونکا دیا۔

یہ خبر لائن مین فرید خان کے قتل کی خبر تھی۔ کسی نے اسے کل رات نو بجے کے قریب گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ قاتل اسے قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔

''لائن مین فرید خان۔'' عثمان کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

''ہاں یہ وہی ہے نا جو ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔'' ڈاکٹر عادل نے کہا۔

''ہیں۔۔۔لیکن۔'' اسے کیوں قتل کیا گیا؟'' عادل شاہ نے کہا اور عثمان چونک کر عادل کو دیکھنے لگا۔

یہ بات صرف وہ جانتا تھا کہ ان دونوں خبروں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ ایک لمحے کیلئے اسے سخت رنج ہوا' اسے معلوم تھا کہ بے چارے فرید خان کو محض موقع واردات کا گواہ ہونے کی سزا ملی ہے۔ اس نے یقیناً کسی ڈاکو کو پہچان لیا تھا اور پھر وہ اس واردات کا عینی گواہ تھا اور ڈاکوؤں کیلئے اس کا زندہ رہنا خطرناک تھا' بس یہی بات اس کی موت کا سبب بنی۔

عثمان کو فرید خان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا لیکن اس کے علاوہ اسے اس بات کا بھی شدید ملال تھا کہ ڈکیتی کی واردات کا واحد چشم دید گواہ ختم کر دیا گیا ہے۔

کل رات نادر اور عامر نے خاص طور سے کہا تھا کہ فرید خان اس کیلئے ضروری مہرہ ہے اسے ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے۔ عثمان الگ سے فرید خان سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے اس سے کچھ اہم باتیں کرنی تھیں لیکن انسپکٹر جمشید سے ملنے کے بعد اس نے فوری طور پر فرید خان سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ بات انسپکٹر کی مرضی کے خلاف ہو لیکن اب اسے فرید خان سے نہ ملنے کا افسوس تھا۔

''اسے صرف ہماری وجہ سے قتل کیا گیا ہے بھیا۔'' عادل نے کسی قدر خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''سو فیصدی۔'' عثمان بے خیالی کے عالم میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمیں بھی مار سکتے ہیں۔''

''ایں' کیوں ہم نے تو انہیں نہیں دیکھا۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہارا مطلب کیا ہے؟''

''فرید خان نے انہیں پہچان لیا تھا اسی وجہ سے اسے مار دیا گیا۔''

''ہاں' ہاں' ہاں۔'' عثمان نے کسی قدر غصے سے کہا پھر سنبھل کر بولا ''ہم سے تو انہیں یہ خطرہ نہیں ہے کہ ہم نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ڈاکو جو فرید خان کے گھنٹی بجانے پر باہر گیا تھا اپنی نقاب اُتار کر گیا تھا اور فرید خان نے اسے دیکھ لیا تھا۔''

''مگر فرید خان نے تو بیان دیا تھا کہ وہ اسے نہیں

پہچان سکتا کیونکہ وہ گھر میں فون کی لائن چیک کرنے داخل ہوا تھا اور اس نے یہ غور بھی نہیں کیا تھا کہ دروازہ کس نے کھولا۔''

''ڈاکو یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔''

''مگر انہوں نے اسے اس وقت کیوں نہیں مار دیا۔''

''یہ وہی بتا سکتے ہیں۔'' عثمان عادل شاہ کی بچکانہ باتوں سے اُکتا کر بولا۔ ویسے بھی اس پر نیند کا خمار طاری تھا۔ پھر وہ بولا'' جاؤ آرام کرو۔ میں کچھ دیر اور سونا چاہتا ہوں۔'' وہ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن اسے دوبارہ نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اسے رہ رہ کر فرید خان کی موت کا خیال آرہا تھا۔ جب کوشش کے باوجود نیند نہ آئی تو وہ اُٹھ کر غسل خانے میں داخل ہو گیا اور ٹھنڈے پانی کے غسل سے کافی حد تک طبیعت کو بحال کیا۔

ناشتے کی میز پر وہ اپنی والدہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ عادل نے ہوشیاری سے کام لیا اور والدہ کو فرید خان کے قتل کی خبر نہیں سنائی ورنہ اس وقت ان کی حالت کافی خراب ہوتی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد انہوں نے اسے مخاطب کیا'' عثمان!''

''جی امی۔۔۔''

''آفس نہیں جاؤ گے؟''

''آج نہیں جاؤں گا امی۔''

''کیوں؟''

''بس طبیعت میں سستی ہے' رات کو ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔''

''میں بھی غمزدہ ہوں۔ میرے بیٹے کی محنت کی کمائی اس طرح برباد ہو گئی۔''

''مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے امی لیکن میں آپ کے دُکھ کو جانتا ہوں مجھے پتا ہے کہ آپ کس چیز کیلئے غمزدہ ہیں۔''

''میں۔۔۔؟'' امی نے کہا۔

''ہاں۔ ابو کی نشانی وہ لاکٹ جس میں ابو کی تصویر تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ کس طرح تنہائی میں اسے کھول کر دیکھتی رہتی تھیں اور آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آج میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے وہ لاکٹ آپ کے گلے سے اُتروا کر تجوری میں رکھ دیا۔ صرف اس لیے امی کہ آپ نہ رویا کریں۔ آہ کاش ڈاکو سب کچھ رکھ لیں وہ لاکٹ مجھے واپس کر دیں۔''

امی پھر آبدیدہ ہو گئیں' پھر بولیں۔

''وہ مجھے تمہارے ابو نے رونمائی میں دیا تھا۔ اس وقت وہ بہت غریب تھے اور انہوں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر وہ ہلکا سا لاکٹ بنوایا تھا۔ اس وقت جب سونا بھی کوڑیوں کے مول بکتا تھا۔ آج کی طرح نہیں کہ کوڑیاں بھی سونے کے مول بکتی ہیں۔''

ابھی وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ سیل پر اشارہ موصول ہوا۔ عثمان نے موبائل دیکھا' انسپکٹر جمشید کی کال تھی۔'' عثمان شاہ صاحب!''

''جی بول رہا ہوں۔''

''ذرا تھانے آجایئے۔''

''کوئی خاص بات سر۔''

''ہاں آجایئے۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

سب انسپکٹر ابراہیم خاں نے انسپکٹر جمشید کو اطلاع دی تھی کہ فرید خان گھر پر نہیں ملا۔ ایک کچی آبادی میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے حیرانی سے پوچھا تھا کہ فرید خان سے اسے کیا کام ہے۔ ابراہیم خاں اسے ٹال کر چلا گیا تھا۔ اس نے انسپکٹر جمشید کو اس بارے میں اطلاع دیدی تھی کہ فرید خان اسے نہیں ملا' کل صبح وہ اس سے مل کر اسے تھانے لے آئے گا لیکن دوسری صبح کے اخبارات میں فرید خان کے قتل کی خبر ملی تو جمشید بھی حیران رہ گیا' اسے بھی فرید خان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ بے چارہ بال بچوں والا آدمی تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسی کیس کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ وہ اس کیس کی گہرائیوں پر غور کر رہا تھا کہ ابراہیم خاں نے اندر آکر سیلوٹ کیا۔

''کیا خبریں ہیں ابراہیم خاں؟''
''سب خیریت ہے سر جی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔''
''صبح کو اُٹھ کر اخبار نہیں پڑھتے؟''
''نہیں سر جی' گھر والی سے جھگڑا کرتا ہوں۔ ناشتا کرتا ہوں' بچوں کو اسکول چھوڑتا ہوں پھر تھانے آجاتا ہوں۔'' ابراہیم خاں کے انداز پر جمشید کو ہنسی آگئی۔ پھر اس نے کہا۔
''بیوی سے روز جھگڑا کرتے ہو؟''
''ضروری ہے سر جی۔''
''کیوں؟''
''میں شام کو واپس جاتا ہوں تو خوشامدیں کرتی ہے' اچھا لگتا ہے۔''
''ایک بُری خبر ہے۔'' جمشید نے کہا۔
''کیا سر جی؟''
''بے چارے فرید خان کو قتل کر دیا گیا۔'' جمشید نے کہا اور ابراہیم خاں بھی حیران رہ گیا۔ اس نے اخبار میں پوری خبر پڑھی پھر افسوس سے بولا۔
''یہ تو واقعی بُری خبر ہے۔ سر جی بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''
''یہ گل زمان کہاں رہ گیا؟ اسے ایک کام سونپا تھا ابھی تک اس کا پتا نہیں ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے اتنا ہی کہا تھا کہ گل زمان نے آفس آکر سلوٹ کیا۔ جمشید نے گردن ہلائی اور پھر بولا ''تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ بیٹھو' تم بھی بیٹھو ابراہیم خاں۔''
''شکریہ سر!'' دونوں بیٹھ گئے۔
''ہاں گل زمان کیا خبر ہے؟''
''آپ کا اندازہ ٹھیک تھا سر۔ یہ وہی گینگ ہے سر' ہم نے رات بھر اس جگہ کی نگرانی کی ہے' دو سپاہی میرے ساتھ تھے مگر رات کو کوئی اس طرف نہیں آیا۔''
''یہ جلیل خان والا گروہ ہے۔''
''پکا سر!'' گل زمان نے جواب دیا۔
''لیکن میری اطلاعات کے مطابق جلیل تو ملک سے باہر ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔
''جلیل خان اگر باہر ہے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اب تو اس کے گرگے اس کے بغیر بھی وارداتیں کر لیتے ہیں۔'' گل زمان یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔
''یہ میری بات کا جواب تو نہیں گل زمان' مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں جلیل کے گینگ پر شبہہ کیوں ہے؟''
''شبہہ نہیں مجھے یقین ہے سر' یہ لوگ ہر واردات کے بعد اپنی جگہ بدل لیتے ہیں۔ کل رات ان میں سے کسی کا بھی فلیٹ میں نہ آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اب انہوں نے وہ ٹھکانہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ آج دن میں اور پتا چل جائے گا۔''
''وہ فلیٹ کس کی ملکیت ہے؟''
''پلازہ کے چوکیدار نے بتایا کہ فلیٹ کا مالک سعودی عرب میں مقیم ہے اور چند روز پہلے ہی ایک بوڑھی عورت اور اس کے دو جوان بیٹوں نے وہ فلیٹ ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے کرائے پر حاصل کیا تھا۔''
''اسٹیٹ ایجنسی والے اتنی تحقیق کہاں کرتے ہیں انہیں تو اپنے کاروبار سے غرض ہے۔''
''وہ بوڑھی عورت کون ہو سکتی ہے؟''
''وہ تو کسی کی بھی ماں یا خالہ ہو سکتی ہے سر' ایسے لوگ مکان وغیرہ حاصل کرنے کیلئے اور پھر محلے والوں کو دکھانے کیلئے کسی عورت کو ضرور سامنے رکھتے ہیں' یہ انتظام تو ہو ہی جاتا ہے' اصل بات یہ ہے کہ اب وہ لوگ شہر کے کس حصے میں چھپے ہیں؟''
''جب وہ لوگ پچھلی واردات کے بعد اپنی پرانی کمین گاہ سے اس فلیٹ میں منتقل ہوئے تھے تو اس وقت بھی ان کی تلاش میں چار پانچ روز لگ گئے تھے مگر ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث ہم ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکے تھے۔''
''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بار وہ شہر ہی چھوڑ گئے ہوں۔''
''وہ پیشہ ور لوگ ہیں سر' ان کا کام یہی ہے اور یہ کام اس بڑے شہر میں کرتے ہوئے انہیں بہت سی سہولتیں رہتی ہیں۔ اس گنجان شہر میں خود کو چھپانا ان کیلئے بہت آسان ہے۔'' گل زمان نے اپنی رائے کا

اظہار کیا۔
"ہمارے مخبروں کا کیا حال ہے؟"
"وہ بھی لگے ہوئے ہیں سر! البتہ گینگ کے ایک آدمی کو گزشتہ ایک ماہ کے دوران تین چار مرتبہ بی ٹاؤن کے ایک پلازہ میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے"
گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ اردلی نے انسپکٹر کو عثمان کے آنے کی اطلاع دی۔ انسپکٹر جمشید نے عثمان کو اندر بلوالیا اور گل زمان کو اشارہ کیا' گل زمان باہر نکل گیا تھا۔ عثمان اندر داخل ہو گیا تھا' جمشید کے اشارے پر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا' انسپکٹر جمشید نے کہا۔
"میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اب اس ڈکیتی میں ایک قتل کا اضافہ ہو گیا ہے آپ نے آج کا اخبار تو پڑھ ہی لیا ہوگا۔"
"جی ہاں مجھے فرید خان کے قتل کی اطلاع مل چکی ہے' بہت افسوس ہوا۔" عثمان نے آہستگی سے کہا۔
"اب صرف افسوس کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ انسانی جان' مال و دولت سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس معاملے کو جلد از جلد حل کیا جائے۔"
"میں تو آپ سے ہر تعاون کیلئے تیار ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کو ساری بات بتادی ہے۔" عثمان کے لہجے میں کل والی جھجک ختم ہو گئی تھی۔
"پہلی بات تو یہ ہے عثمان صاحب کہ یہ کیس آپ کے بھرپور تعاون کے بغیر حل نہیں ہو سکتا لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس سلسلے میں جس کسی پر بھی شک ہو اس کا نام اور پتا مجھے بتادیں۔"
"یہ تو بڑی مشکل بات ہے انسپکٹر صاحب' حالانکہ مجھے تو کل سے اپنے سائے تک پر شبہ ہو رہا ہے مگر شبے کو یقین میں تبدیل کیے بغیر کسی کا نام بتانا تو زیادتی کی بات ہے وہ بیچارہ خوامخواہ پولیس کی زد میں آجائے گا اور شبے بے مقصد ثابت ہوئے تو میرے اور آپ کے تعلقات بھی کشیدہ ہوں گے' بہتر ہے کہ آپ اپنے طور پر ہی تحقیقات کریں اس سلسلے میں مجھے معاف ہی رکھیں تو بہتر ہے۔" عثمان نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔
"میرے علاقے میں کل اتنا بڑا ڈاکہ پڑا ہے عثمان صاحب اور پھر ایک بے مقصد سا آدمی اس سلسلے میں مارا بھی جا چکا ہے' میں مزید کسی غفلت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا' بہت ممکن ہے کہ مجرموں کے آئندہ اقدام اور بھی خطرناک ہوں۔ لہٰذا پلیز آپ مجھے۔۔۔" انسپکٹر کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا۔
"آپ کو چاہیے تھا کہ کل ہی اس لائن مین کو اپنی حفاظت میں لے لیتے۔"
"ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں یہ آپ ہم پر چھوڑ دیں اور ہمیں مشورے نہ دیں۔" انسپکٹر نے کس قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔
"سوری سر' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" عثمان نے جلدی سے معذرت کی۔
"ہمارے آدمی نے کل رات آٹھ بجے تک اس کا انتظار کیا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا۔
"اس کی موت کی خبر کب ملی؟"
"آج صبح اس علاقے کے ایس ایچ او نے بتایا ساتھ ہی کچھ اور تفصیل بھی۔"
"پوچھ سکتا ہوں کیا؟" عثمان نے کہا۔
"ہاں' رات کو نو بجے کے قریب فرید خان واپس آ گیا تھا۔ پھر وہ کھانے سے فارغ ہوا تھا کہ کوئی اسے بلانے آیا۔ وہ باہر نکلا پھر واپس نہیں آیا' اسے گلی سے دور ایک میدان میں لے جا کر گولی ماردی گئی۔ اس کی لاش کے بارے میں محلے کے لوگوں نے بتایا۔ اس کی بیوی نے آپ کے گھر پڑنے والے ڈاکے کے بارے میں بھی بتایا جس میں پولیس نے اسے بھی شامل تفتیش کر لیا تھا۔ اس علاقے کے تھانہ انچارج کا بھی یہی خیال ہے کہ ڈاکے اور فرید خان کے قتل کا واقعہ ایک دوسرے سے ملتا ہے۔"
"بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟"

"وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔" جمشید نے کہا۔

"کیا۔۔۔؟"

"یہی کہ آپ ہم سے تعاون نہیں کر رہے اور یہ آپ کے حق میں بھی برا ثابت ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

عثمان کو اندازہ ہو گیا کہ واقعی صورت حال اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ انسپکٹر کو ناراض کرنا کسی طور مناسب نہیں ہے اور پھر اب تو وہ اس کا رازدان بھی بن چکا ہے لیکن سمجھ میں آتا تھا کہ وہ کس پر شبہے کا اظہار کرے' آخر کار اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں انسپکٹر صاحب کہ آپ میرے لیے مخلصانہ کام کر رہے ہیں لیکن۔۔۔۔"

"غلط خیال ہے آپ کا۔" جمشید نے بات درمیان سے کاٹ دی۔

"جی۔۔۔؟" وہ حیرت سے بولا۔

"میں کوئی کام آپ کیلئے نہیں کر رہا۔ میں صرف اپنے فرض سے مخلص ہوں۔"

"بیشک، بیشک۔" عثمان جلدی سے بولا اور پھر کہنے لگا "میں آپ کو اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کے پتے لکھوا دیتا ہوں۔" ابھی عثمان نے اتنا ہی کہا تھا کہ جمشید نے پھر اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

"نہیں مسٹر عثمان' اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں ان سب کے بارے میں چھان بین کرتا پھروں آپ کچھ خاص نام مجھے بتا دیں لیکن وہ لوگ جن پر آپ کو واقعی شبہہ ہو۔"

عثمان اُلجھن میں پڑ گیا' پھر بولا "یہ ایک مشکل کام ہے۔"

"لیکن یہ آپ کو کرنا ہوگا۔ آپ ایک دولت مند انسان ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ آپ نے یہ دولت ناجائز ذرائع سے کمائی ہے مگر یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کون کون شخص آپ کی اس ناجائز کمائی کے بارے میں جانتا ہے' اتنا بڑا ڈاکہ مخبری کے بغیر نہیں پڑ سکتا۔"

عثمان گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ انسپکٹر بے حد چالاک آدمی ہے اور بہت گہرائیوں میں اُتر گیا ہے۔ وہ بات اس کے ذہن میں بھی کچوکے ڈال رہی تھی کہ معاملہ مخبری کا ہی ہے۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا جو اس کی اس زندگی کے بارے میں جانتے تھے۔

"آپ اب بھی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"

"وہ۔۔۔ دراصل انسپکٹر صاحب۔"

"دراصل کچھ نہیں ہوتا صرف اصل ہوتا ہے۔"

"میں وہ نام آپ کو بتا رہا ہوں۔"

"جی!" انسپکٹر نے رائٹنگ پیڈ سامنے سرکا لیا اور عثمان نے پانچ ایسے نام بتا دیئے جو اس کی نظروں میں مشکوک تھے لیکن اس کا دل لرز رہا تھا یہ نام لیتے ہوئے۔ یہ بہت خوفناک انکشاف تھا اگر وہ مرزا شاہد کے کہنے پر اپنی دولت کے بارے میں اعتراف نہ کرتا تو یہ نوبت نہ آتی لیکن اب وہ خود بھی مجرموں کی فہرست میں شامل تھا۔

"وہ انسپکٹر صاحب' اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا نام کہیں بھی سامنے نہیں آئے گا۔" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے جمشید پھر بول پڑا۔

"لیکن یہ لوگ آخر سمجھ ہی جائیں گے۔"

"وہ مجبوری ہے جس کیلئے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اب یہ صرف ڈاکے کا کیس نہیں رہا بلکہ قتل کا کیس بن چکا ہے۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہے۔" عثمان نے کمزور لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے آپ چاہیں تو جا سکتے ہیں۔" جمشید نے کہا اور عثمان اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ گردن تک دلدل میں پھنس گیا ہے۔ دولت چلی گئی تھی یہ بذات خود بہت بڑا المیہ تھا۔ جس کا اسے بے حد رنج تھا لیکن فرید خان کے قتل کے بعد تو یہ کیس انتہائی سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا اور اب وہ خود بھی خطرے میں پڑ گیا تھا جس کا اسے پوری طرح احساس تھا۔

☆......☆......☆

ان میں سے صرف دو کل رات گھر سے نکلے تھے۔ ان کے علاوہ ان تینوں نے اپنے آپ کو اس مکان میں بند رکھا تھا۔ خوف کے احساس نے انہیں اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ لوٹی ہوئی رقم اور اشیاء انہوں نے گھر کے مختلف حصوں میں چھپا دی تھیں۔ گھر میں انہوں نے کھانے پینے کی اشیاء کا کافی ذخیرہ کر رکھا تھا اس لیے انہیں اس کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔

ان تینوں میں سے کسی کی بھی عمر بیس یا بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

رات گہری ہوگئی تو وہ تینوں گھر کے ایک کمرے میں جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا ''تم نے اپنے ماموں سے اس گھر کی چابی لے کر بہت اچھا کیا ہے ناصر۔''

''ہاں یہاں ہمیں بہت آرام ہے فرہاد۔''

''میں نے کرائے کے گھر کی اس لیے مخالفت کی تھی۔'' تیسرے نے کہا۔

''پولیس سارے ہتھکنڈے جانتی ہے' کرائے کے گھر کا وہ آسانی سے سراغ لگا سکتی تھی۔''

''ماموں سے تم نے کیا کہا تھا؟''

''اتفاق سے وہ کچھ عرصے کیلئے ملک سے باہر جا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پرسکون رہ کر اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں اس لیے گھر کی چابی مجھے دے دیں۔''

''ویری گڈ۔۔۔ اور تم خوب اسٹڈی کر رہے ہو۔'' فرہاد نے ہنس کر کہا۔

''ہاں گھر کے لوگ یہی سمجھ رہے ہیں۔''

''ہم تینوں ہی بڑے ہونہار بچے ہیں'' ناصر نے کہا اور تینوں ہنسنے لگے۔

''جلیل خان کو ہمارے اس کارنامے کی خبر ہے؟'' تیسرے نوجوان کمال نے کہا۔

''یقیناً ہوگی وہ ہماری پوری خبر گیری رکھتے ہیں اور پھر ڈاکے کی خبر اخبار میں بھی چھپ چکی ہے۔'' فرہاد نے کہا۔

''اخبار نے اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں لکھا تھا۔''

''تو پھر؟ اس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میرا مطلب ہے جلیل خان صاحب نے اس معمولی ڈاکے پر غور بھی نہیں کیا ہوگا حالانکہ ہم دس لاکھ کا حصہ دے چکے ہیں۔''

''خان صاحب خوش نہیں تھے۔''

''وہ خوش کہاں ہوتے ہیں۔ سب کچھ خود ہی ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔''

''یار وہ بڑا باخبر آدمی ہے اسے اصل رقم کا اندازہ ہے'' کمال نے کہا۔

''معلوم ہے تو معلوم رہے۔ سب اسے ہی تو نہیں دے سکتے ابھی تو دوسرا حصے دار بھی آنے والا ہے۔''

''یار یہ ہے بڑے تکلیف کی بات۔''

''کیا؟''

''ہم کب تک حصے بانٹتے رہیں گے۔ محنت ہم کریں' زندگی کی بازی ہم لگائیں اور آدھی سے زیادہ رقم یہ حصے دار لے جائیں ہمیں کیا ملتا ہے؟''

''نہیں ایسے مت سوچو ہماری حفاظت بھی تو کی جاتی ہے۔ اتنی رقم ہم ساری عمر نوکریاں کر کے بھی نہیں جمع کر سکتے تھے۔ بس تھوڑا وقت اور' اس کے بعد ملک سے باہر نکل جائیں گے اور اس کے بعد عیش ہی عیش۔''

''واقعی یہ خیال سب سے خوبصورت ہے۔''

''اور سب سے بھیانک بھی۔''

''بھیانک کیوں؟''

''ڈیڑھ دو سال میں ہم ایک رات بھی سکون کی نیند نہیں سوئے ہیں۔''

''کچھ کرنے سے کچھ ملتا ہے دوست' دنیا کو غور سے دیکھو اور خود کو دیکھو اپنی ہی بات لے لو' بیشک ڈیڑھ دو سالوں سے تم سکون کی نیند نہیں سوئے لیکن ان ڈیڑھ دو سالوں میں تم نے پوری شان و شوکت سے اپنی بہن کی شادی کی اپنے والد کی بائی پاس سرجری کرائی جس پر لاکھوں خرچ ہوئے اپنی ماں اور بھائی کو فلیٹ خرید کر دیا۔ یہ سب کچھ ان بے سکون راتوں کا ہی صلہ ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''ویسے ایک کام بہت خطرناک ہوا ہے۔''
''کیا؟''
''ایک خون بھی ہمارے سر آ گیا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔''
''یہ بھی تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ تمہارا پڑوسی تھا' بس ذرا سی دیر کیلئے میرا چہرہ کھل گیا تھا اور اس نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن اس حد تک جانے کی کیا ضرورت تھی؟''
''ضروری تھا یار! ورنہ خطرہ ہی خطرہ تھا۔''
''یار چھوڑو ان باتوں کو۔ آگے کی سوچو اب کیا کرنا ہے؟''
''مال یہاں سے منتقل کرنا ہے' ویسے فی الحال یہ جگہ محفوظ ہے۔''
''اور وہ دوسرا حصے دار؟''
''ہاں!'' دوسرے نے گہری سانس لی پھر بولا ''آج کی رات تو یہاں گزارنی ہوگی۔ فرید خان کے قتل کے بعد تو پولیس بری طرح ہماری تلاش میں لگ جائے گی۔''
''کوئی ثبوت تو نہیں چھوڑا ہم نے پولیس ہم پر شبہ کیوں کرے گی؟''
''او یار بچوں کی سی بات نہ کرو' پولیس کوئی معمولی نہیں ہوتی۔''
اس وقت دروازے کی بیل بج اٹھی اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر شدید خوف کے آثار اُبھر آئے۔ تینوں نے پھرتی سے ریوالور نکال لیے تھے۔ اس گھر کا کوئی پچھلا دروازہ بھی نہیں تھا جہاں سے فرار ہوا جا سکتا تھا اور پھر کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔
ناصر نے کمال کو اشارہ کیا اور کمال بلی کی سی چال چلتا ہوا پورچ میں آ گیا جہاں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح آگے بڑھ کر ایک دیوار کے پاس پہنچ گیا۔
''تم ادھر'' ناصر نے سرگوشی کی اور اس کے اشارے پر فرہاد چھت پر چلا گیا۔
گھنٹی دوبارہ بجی تو کمال نے ہولے ہولے سر اُٹھا کر بڑی احتیاط سے باہر جھانکا تب اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے گھنٹی بجانے والے کو پہچان لیا۔
یہ پچاس پچپن سال کی عمر کا ایک مجہول سا آدمی تھا' اس کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ نشے میں دھت ہے۔
''خدا تمہیں غارت کرے آؤ۔ مرو'' کمال نے گیٹ کھول کر اسے اندر کھینچ لیا۔ وہ نشے میں لڑکھڑاتا اندر آ گیا۔ ناصر اور فرہاد نے بھی اسے پہچان لیا تھا وہ سب پھر اکٹھے ہو گئے۔
''تم اس وقت کیوں آئے چچا سکندر؟'' کمال نے تلخی سے کہا۔
''ضرورت کا کوئی وقت نہیں ہوتا پیارے بچو مگر تم نے یہ اسلحہ کیوں نکال رکھا ہے۔ کیا چاند ماری کر رہے تھے؟'' نشے میں ڈوبے شخص نے کہا۔
''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' ناصر غرایا۔
''کیوں۔۔۔ میرا حصہ نہیں دو گے؟''
''ہم نے کہا تھا تمہارا حصہ تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔''
''اور میں نے کہا تھا کہ میں خود لینے آ جاؤں گا۔''
''تمہیں معلوم ہے کہ پولیس ہمیں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔''
''وہ پولیس کا کام ہے۔ تم اپنا کام کرو' کتنا مال نکلا؟'' سکندر نشے میں ضرور تھا لیکن اپنے کام میں چوکس نظر آ رہا تھا۔
''چھوڑو چچا نام ہے سکندر اور تقدیر کے بندر۔'' ناصر نے کہا۔
''کیوں۔ کیا ہوا؟'' سکندر نے پوچھا۔
''تمہاری اطلاع غلط تھی۔'' ناصر بولا۔
''وہ کیسے؟'' بوڑھے نے پوچھا۔
''آٹھ دس ہزار روپے اور چند زیورات۔ بس یہ نکلا'' کہہ کر ناصر نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور سکندر کی طرف بڑھا دیا۔
''کتنے روپے ہیں اس میں'' سکندر نے پوچھا۔
''پانچ ہزار' یہی تمہارا حصہ بنتا ہے۔''
''ناممکن ہی نہیں ہے۔ غلط کہہ رہے ہو'' سکندر نے بگڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہی سچ ہے چچا سکندر تم نے بلاوجہ ہم سے اتنی محنت کرائی۔ اتنا خطرہ مول لیا ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ یقین نہ آئے تو اخبار میں ڈاکے کی تفصیل پڑھ لینا۔ چلو شاباش پیسے رکھو اور پھوٹو یہاں سے۔'' ناصر نے ہاتھ میں دبے ریوالور کو انگلیوں میں نچاتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' سکندر نے لفافہ جیب میں رکھا اور بولا ''چلتا ہوں''

''احتیاط سے جانا چچا اور کوئی اچھی سی ٹپ لاؤ تاکہ تمہارا بھی کام بنے اور ہمارا بھی۔'' بوڑھا خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

عثمان تین دن کے بعد دفتر آیا تھا۔ اس کے گھر پڑنے والے ڈاکے کی خبر سب کو تھی۔ دفتر کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے افسوس کرنے لگے۔ بڑے افسران نے بھی اسے آفس بلوا کر اظہار افسوس کیا۔ ظاہر ہے اس نے یہاں بھی لوٹی جانے والی رقم کی تفصیل نہیں بتائی لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ بات چھوٹی سی نہیں جس سیٹ پر عثمان ہے وہاں دولت کی بارش ہوتی ہے۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیے تھے۔

''سنا تم نے۔'' انور علی نے نوید شان سے کہا۔

''کیا؟''

''چند ہزار اور تھوڑے سے زیور۔''

''ڈاکوؤں کو خودکشی کر لینی چاہیے۔''

''ابے نہیں یار سب ایک دوسرے کو ٹریٹ دے رہے ہوں گے' یہ چند ہزار یعنی چند' انہیں پچیس پچاس لاکھ سے ضرب دے لو۔''

''چھوڑو یار ہمیں کیا۔''

''بس اس جھوٹ پر ہنسی آ رہی ہے۔''

''بری بات'' الیاس بیگ نے کہا ''آج کل جھوٹ پر ہنستے نہیں۔'' یہ سن کر سب ہنس پڑے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عثمان ذہنی طور پر بہت پراگندہ ہو چکا تھا اتنا بڑا مالی نقصان اور اس پر مستزاد یہ کہ اس نے اپنے قریبی حلقے میں سے پانچ افراد کے نام بھی انسپکٹر جمشید کو بتا دیے تھے۔ ان پانچوں کا تصور ذہن میں آتے ہی عثمان کے اندر ایک احساس جرم بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ ان میں سے ایک نام ایسا تھا جو عثمان کے شبہے کی بنیاد پر کم اور انتقام کے باعث زیادہ شدت رکھتا تھا۔ باقی چار نام وہ بتانے پر اس لیے مجبور تھا کہ ان کے سوا اس کی دولت کا حقیقی اندازہ کسی اور نہیں تھا۔ نادر اور عامر پر تو رہ رہ کر کف افسوس مل رہا تھا مگر وہ کیا کرتا' انسپکٹر جمشید نے اسے مجبور ہی اتنا کر دیا تھا۔

اب اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ نادر اور عامر اگر بدنیت ہوتے تو انہیں اس ڈاکے کی پشت پناہی کی ضرورت کیا تھی۔ ان کے نام عثمان نے لاکھوں روپے مالیت کے پلاٹ خرید رکھے تھے اور اگر وہ دونوں چاہتے تو اس پلاٹ سے مکر جاتے کہ وہ جائیداد عثمان کی نہیں بلکہ ان کی ہے' باقی دو نام دفتر کے ساتھیوں کے تھے جن سے عثمان کی دفتری رقابت تھی اور وہ لوگ جانتے تھے کہ عثمان کے پاس بے پناہ دولت ہے۔

جس بات نے عثمان کو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ دو دن گزر جانے کے باوجود انسپکٹر جمشید کی طرف سے کسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا' نادر اور عامر بدستور اس کے گھر آ رہے تھے اور آج اس دفتر میں آ کر علم ہوا کہ اس کے دفتری رقیب بھی حسب معمول اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے کام میں مشغول ہیں۔ کل شام زارا سے بھی بات ہوئی تھی اور وہ اس سے ملنے کیلئے اسی طرح بیتاب تھی جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انسپکٹر جمشید بھی اس کیلئے کچھ نہیں کر رہا تھا۔

عثمان دن میں دو مرتبہ انسپکٹر جمشید کو ضرور فون کرتا مگر وہ تھانے میں موجود نہ ہوتا البتہ کل رات وہ فون پر مل گیا اس نے بتایا کہ وہ بہت جلد عثمان کو خوشخبری سنانے والا ہے۔ یہ بات معمول کے لہجے میں کہی گئی تھی لہٰذا عثمان اسے طفل تسلیوں سے زیادہ گردانتا تو اس کی بیوقوفی ہوتی۔ مرزا شاہد بھی اس دن کے بعد سے غائب تھا۔ آج صبح دفتر جانے سے پہلے عثمان اس کے گھر گیا تو وہ کسی ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ عثمان اس کے گھر پر اپنا وزٹنگ کارڈ چھوڑ کر آ گیا۔

عثمان اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف شاہد تھا "ہیلو عثمان، تم جلدی سے سی آئی اے سینٹر پہنچ جاؤ۔"

"کوئی خاص بات ہے شاہد؟"

"وقت برباد مت کرو یار، جو کہہ رہا ہوں وہ کرو، میں تمہیں گیٹ پر مل جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے شاہد نے فون بند کر دیا۔ عثمان نے اپنے سینئر کو بتایا کہ وہ ضروری کام سے باہر جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ واپسی میں دیر ہو جائے یا پھر وہ آج لوٹ کر نہ آئے۔

تھوڑی دیر بعد عثمان کی گاڑی سی آئی اے سینٹر کی طرف برق رفتاری سے جا رہی تھی۔ اس کے دماغ میں شاہد کے الفاظ گونج رہے تھے اس کا مطلب ہے کہ معاملہ سی آئی اے تک پہنچ گیا ہے، یہ بات عثمان کی سمجھ سے بالاتر تھی، جب اس کی گاڑی سی آئی اے سینٹر کے قریب پہنچی تو خوف کی ایک لہر اس کے دل میں موجزن ہو کر رہ گئی، شاہد حسب وعدہ گیٹ کے قریب کھڑا تھا۔

"مبارک ہو عثمان۔" مرزا شاہد نے اس کی طرف لپکتے ہوئے کہا "مگر یار تم نے تین دن سے میرا سونا جاگنا حرام کر رکھا ہے۔"

"کیا ڈاکو پکڑے گئے؟" عثمان نے بیتابی سے پوچھا۔

"باقی تفصیلات تھوڑی دیر بعد" شاہد نے کہا اور اسے لیے ہوئے ایک بڑے افسر کے کمرے میں پہنچ گیا یہاں انسپکٹر جمشید بھی موجود تھا۔ انسپکٹر جمشید نے انسپکٹر مجید کا تعارف عثمان سے کرایا۔ تھوڑی دیر بعد عثمان کو اندازہ ہو گیا کہ کمرے کا ماحول نسبتاً بے تکلف ہے اور دونوں انسپکٹروں کی آپس میں خاصی انڈر سٹینڈنگ ہے۔ انسپکٹر جمشید نے شاہد کو مخاطب کر کے کہا۔

"عثمان صاحب کو مبارکباد دی ہے یا نہیں"

"مبارکباد کے مستحق تو آپ لوگ ہیں" شاہد کے لہجے میں خوشی اور طمانیت تھی۔ عثمان بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے بولا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب۔"

"اگر انسپکٹر مجید تعاون نہ کرتے تو شاید یہ معاملہ اتنی آسانی سے قابو میں نہ آتا۔"

"ہاں جی، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" شاہد نے توصیفی نظروں سے انسپکٹر مجید کو دیکھتے ہوئے کہا جو منکسرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر انسپکٹر مجید نے اپنے دائیں جانب رکھے شیلف میں سے ایک تھیلی اور ایک بریف کیس نکال کر عثمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کی امانت ہے عثمان صاحب اگر اس میں کوئی کمی بیشی ہے تو اس کی ذمہ داری پولیس پر عائد نہیں ہوتی۔"

عثمان نے بے تابی سے بریف کیس کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور پھر تھیلی میں زیورات کے ساتھ ساتھ وہ یادگار لاکٹ بھی تھا جو اس کی والدہ کی زندگی بھر کا حاصل تھا۔ خوشی سے عثمان کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ اس نے ممنون نگاہوں سے باری باری کمرے میں موجود تینوں لوگوں کو دیکھا اور بولا "میں آپ لوگوں کا کس طرح شکریہ ادا کروں؟"

"میں بھی زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔" شاہد نے بھی دونوں انسپکٹروں سے کہا "آپ لوگوں نے واقعی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"

عثمان نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انسپکٹر جمشید سے پوچھا "کیا میرے بتائے ہوئے کسی نام کا بھی اس ڈکیتی میں ہاتھ تھا؟"

"اگر ہم آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے تو شاید کبھی بھی مجرموں کو نہ پکڑ سکتے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ تو محض اتفاق ہے کہ ۔۔۔" انسپکٹر جمشید ابھی اپنا جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ دو سپاہی ہتھکڑی لگے ہوئے ایک شخص کو اندر کمرے میں لائے "اسے خاص طور پر آپ کیلئے بلوایا ہے۔" انسپکٹر مجید نے عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اس کا نام سکندر ہے اور یہی اس ڈاکے کا اصل محرک ہے۔"

عثمان کو جیسے کرنٹ لگ گیا ہو وہ اچھل کر اپنی

کرسی سے کھڑا ہو گیا' اس کے لیے زارا کے ماموں کو پہنچانا مشکل نہ ہوا۔ اس نے لرزتے ہوئے کہا۔

''تو کیا' کیا زارا بھی اس ڈکیتی میں ملوث ہے انسپکٹر۔''

''جی نہیں' اس میں زارا بالکل بے قصور ہے۔'' شاہد بیچ میں بول پڑا ''اور تم سے یہ بات پوری تحقیق کے بعد کی جا رہی ہے اس سلسلے میں انسپکٹر جمشید کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے' میرا گزشتہ تین روز سے ان کے ساتھ مسلسل رابطہ رہا ہے۔ آپ کا اصل مجرم یہ ہے جس نے آپ کے سامان کی مخبری کی اور ڈاکوؤں نے اپنا کام دکھایا۔''

''مگر یار شاہد'' عثمان نے الجھتے ہوئے کہا۔

''بہتر یہ ہے شاہد کہ آپ انہیں پوری تفصیل خود بتا دیں' ہمیں مزید کام سے جانا ہے۔''

عثمان ان کا مدعا سمجھ گیا وہ لوگ زیادہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتے تھے اور اب جبکہ اس ساری کارروائی کا علم شاہد کو تھا اور اس کا تمام مال بھی برآمد ہو گیا تھا۔ سکندر کو واپس لے جایا گیا اور عثمان اور شاہد ان دونوں سے رخصت ہو کر باہر آ گئے لیکن اس کے ذہن میں بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے۔ عثمان نے شاہد سے پوچھا۔

''کیا سکندر ڈاکوؤں کے گینگ کا آدمی ہے؟''

''براہ راست نہیں' ہاں البتہ اگر پکڑا نہ جاتا تو ہمیشہ کیلئے ڈاکوؤں کا آلہ کار بن جاتا۔'' شاہد نے جواب دیا۔ ''یہ دراصل کسی بدنام اڈے پر ان ڈاکوؤں سے ملا تھا پھر ان میں راہ و رسم ہو گئی۔ سکندر نے تمہارے زارا سے تعلقات کے دوران تم پر پوری ورکنگ کی تھی اور تمہارے گھر کا' تمہاری سرکاری حیثیت کا پتا لگایا تھا اور اسے پوری طرح اندازہ تھا کہ تم اس قدر موٹی آسامی ہو۔ اس نے ان ڈاکوؤں کو تمہارے بارے میں مخبری اس بنیاد پر کی تھی کہ ڈکیتی کی رقم میں سے چوتھائی حصہ سکندر کا ہو گا۔''

''لیکن پھر پولیس ان ڈاکوؤں تک کس طرح پہنچی اور مال کیسے برآمد کیا جبکہ چوری تو سکندر نے نہیں کی تھی۔''

''انسپکٹر جمشید نے تمہارے بتائے ہوئے پانچ ناموں کے بارے میں نگرانی شروع کر دی مگر اس نے بھی سب سے زیادہ توجہ زارا پر ہی دی تھی پھر تمہارے فلیٹ کی نگرانی کے دوران آدھی رات کے وقت سکندر کو کہیں جاتے ہوئے دیکھا گیا اور اس کا پیچھا کیا گیا۔ سکندر اس رات ان ڈاکوؤں سے ملنے ان کے فلیٹ پر آ گیا تھا۔ پولیس نے اس کی سخت نگرانی کی اور جب سکندر واپس فلیٹ سے نکلا تو کچھ دور جا کر پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ یہ اس وقت نشے میں تھا اور اس کی جیب میں پانچ ہزار روپے کی رقم کا ایک لفافہ تھا پولیس نے اپنے مشہور طریقہ کار سے ایک گھنٹے کے اندر اندر اس سے سارا راز اگلوا لیا۔ بس اس کے بعد ان ڈاکوؤں کے فلیٹ پر راتوں رات ریڈ کی گئی جب پولیس نے ڈاکوؤں کی کمین گاہ پر ریڈ کی تو ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پولیس ان تک پہنچ جائے گی۔ وہ تینوں ایک ہی کمرے میں تھے چنانچہ ان سے ہتھیار ڈلوانا مشکل ثابت نہ ہوا۔''

''کون لوگ تھے وہ؟''

''وہ دراصل جلیل خان والے گینگ کے آدمی ہیں' بہر حال یہ پولیس کی بڑی کامیابی ہے کہ انہوں نے اس گینگ کے اہم ترین افراد کو پکڑ لیا ہے''

''لیکن ان کا سرغنہ جلیل۔''

''اس کے بارے میں تحقیق ہو چکی ہے وہ ابھی تک ملک سے باہر ہے اور اس خبر کے بعد وہ ملک میں شاید ہی داخل ہو۔''

''کب شائع ہو گی یہ خبر؟''

''کل صبح کے اخباروں میں' ابھی تک اس خبر کو دانستہ چھپایا گیا ہے' اس میں میرا مشورہ بھی شامل تھا کیونکہ اس کیس کا ایک مجرم آج صبح پکڑا گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' عثمان نے تعجب سے پوچھا ''وہ کونسا بڑا مجرم تھا؟''

''یہ اس پورے واقعے کا افسوس ناک کردار تھا مگر وعدہ کرو کہ اس مجرم کا نام کبھی زبان پر نہیں لاؤ گے' میں تم پر اعتماد کر کے اس کا نام بتائے دیتا ہوں۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔'' عثمان نے کہا۔

''وہ مجرم سب انسپکٹر ابراہیم ہے جو گزشتہ کئی مہینوں سے اس گروہ سے تعاون کر رہا تھا اور اس کے

بدلے اسے خاصی رقم موصول ہو جاتی تھی۔"

"اوہ۔۔۔" عثمان کا منہ حیرت سے کھل گیا "مگر اس کے بارے میں خبر کیسے ہوئی؟"

"ان ڈاکوؤں نے اُگلا ہے۔"

"اب ابراہیم کا کیا بنے گا؟"

"اسی لیے میں تم سے رازداری برتنے کیلئے کہہ رہا ہوں' انسپکٹر جمشید نے فی الوقت اسے دو ماہ کی جبری رخصت پر بھیج دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ابراہیم خاں کو ہرگز معاف نہیں کرے گا مگر اس کیس پر ہاتھ ڈالنے کا مقصد یہ ہوتا کہ تم پر آنچ آتی اور میں اس کیلئے ہرگز تیار نہ تھا۔"

"ٹھیک ہے مگر یار یہ انسپکٹر جمشید ہے خوب آدمی۔"

"مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ فرید خان کے قاتل بھی پکڑے گئے۔"

"ارے یہ تو میں بھول ہی گیا۔ کیا انہی لوگوں نے اس غریب کو جان سے مارا ہے؟"

شاہد نے فرید خان کے قتل کی وجوہات اور واقعے سے آگاہ کرنے کے بعد کہا "یہ زارا کا کیا چکر لگا رکھا ہے تم نے اپنے ساتھ' مجھے اس کا بھی دکھ ہے۔"

"اس میں دکھ کی کیا بات ہے یار وہ بڑی کمینی عورت ہے۔" عثمان کے لہجے سے نفرت جھلک رہی تھی "اس نے تو مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔"

"نہیں یار آج بڑی تفصیل سے میری اس سے بات ہوئی۔ انسپکٹر جمشید نے اسے سی آئی اے سینٹر بلوایا تھا تاکہ اس کے ماموں کے کارنامے سے اسے آگاہ کر دیا جائے اور اگر قانونی طور پر وہ اپنے ماموں کے لیے کچھ کر سکتی ہے تو کر لے۔"

"پھر کیا کہا اس نے؟" عثمان نے پوچھا۔

"اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے ماموں کو گولی مار دیتی' وہ تو فرط غم سے دو بار بیہوش بھی ہو گئی' اس نے تم سے اپنی محبت کا اعتراف بھی کیا اور اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔"

"چاہتی تھی کیا مطلب' اگر میں آج راضی ہو جاؤں تو وہ ابھی۔۔۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے عثمان۔" شاہد نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک تو وہ شہر سے چلی بھی گئی ہو گی۔ وہ مجھے واپس آنے کا کہہ کر سی آئی اے سینٹر سے سیدھی اپنے فلیٹ گئی وہاں سے سامان سمیٹا' واپس یہاں آئی اور مجھے فلیٹ کی چابی دیتے ہوئے کہا کہ یہ اس فلیٹ کی چابی ہے جو تم نے اسے کرائے پر لے کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ چابی میں تمہارے حوالے کر دوں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مارے ندامت کے تمہارا سامنا نہیں کر سکتی وہ اپنے آپ کو تمہاری مجرم سمجھ رہی ہے۔" شاہد نے جیب سے ایک چابی نکال کر عثمان کی طرف بڑھا دی جو اس نے شاہد سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

پھر اس نے شاہد کو اس کے فلیٹ کے نیچے ڈراپ کیا' گاڑی سے اُتر کر وہ شاہد کے گلے ملا تھا اور اسے بہت شکریے کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ پھر وہ اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر کے اندر پہنچ کر اس نے زیورات کی تھیلی گاڑی میں سے نکالی بریف کیس اس نے وہیں رہنے دیا تھا۔ لابی میں اس کی ماں اور چھوٹا بھائی عادل گم صم بیٹھے تھے۔

عثمان نے ساتھ لائی ہوئی زیورات کی تھیلی اپنی والدہ کی گود میں اُلٹ دی اس کی والدہ اور عادل حیرت بھری نظروں سے اس تھیلی کو دیکھ رہے تھے' عادل بولا۔

"بھائی کیا کیا۔۔۔؟"

"ہاں عادل تمام رقم اور یہ زیورات کی تھیلی برآمد ہو گئی ہے۔ ڈاکو بھی پکڑے گئے ہیں لیکن ستو محلے میں ابھی خبر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' بات جب سامنے آئی ہو گی خود ہی منظر عام پر آ جائے گی۔"

اس کی والدہ تھیلی میں سے نکلے ہوئے زیورات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی' انہوں نے زیورات میں سے اپنا یادگار لاکٹ اُٹھایا پھر عثمان کو اپنے پاس بلایا اور اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی تھیں۔

☆☆......☆☆

ناول
کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 14

صنوبر اپنی ماما کے اس رویے پر ایک دم ہی پریشان ہوگئی مگر کوئی اس کے دل و دماغ میں گھس کر اس سے مسلسل یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو حماد کو اس گھر میں رکھنا ہے۔ کیوں؟ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

"ماما یہ چور نہیں ہے۔ یہ تو حماد ہے۔" صنوبر نے سنبھل کر کہا۔

"میں جانتی ہوں یہ حماد ہے مگر یہ جس طرح یہاں سے گیا تھا۔ بنا کسی کو کچھ بھی بتائے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اس نے ضرور چوری کی تھی ورنہ اس طرح جانے کی کیا ضرورت تھی؟" درشہوار نے حماد کی طرف بڑھتے ہوئے اور غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ حماد کو ایک ہی دھکے میں سیڑھیوں سے دھکیلنے والی ہے۔

یکا یک صنوبر نے سیڑھیوں کا ایک اسٹیپ عبور کیا اور اب وہ عین حماد کے سامنے کھڑی ہوئی تھی حماد اس کی پشت پر تھا۔ وہ بولی۔

"یہ مجھے بتا کر گیا تھا ماما۔۔۔ آئیں میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔" یہ کہہ کر صنوبر واپسی کے لیے اس طرح مڑی کہ اس کے ہاتھوں میں اپنی ماں کا ہاتھ تھا۔ حماد بھی نیچے اترنے لگا اور پھر تینوں نیچے والے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

صنوبر اور درشہوار دبیز صوفوں پر براجمان ہوگئیں اور حماد چپکے سے وہاں سے کھسک کر کچن میں چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔ جس میں سلیقے سے دو کپ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے چائے میز پر رکھی اور کپوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ درشہوار اس کی طرف دیکھنے لگی حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ابھی تو اسے رکھنے کا فیصلہ بھی نہیں ہوا اور اس نے کام شروع بھی کر دیا مگر وہ کہہ نہ سکی اور چپ رہی اسے چائے کا وہ ٹیسٹ یاد آ چکا تھا جو حماد کے ہاتھ کی چائے میں دنیا میں سب سے جدا تھا اور اس ٹیسٹ کو محسوس کر کے اسے جیسے حماد کی چائے اور اس کا کیا ہوا ہر کام یاد آنے لگا۔ اسے لگا کہ اس جادوگر لڑکے کو نہ رکھنے کی غلطی اسے نہیں کرنی چاہیے ورنہ یہ کہیں اور چلا گیا تو وہ ان سب چیزوں سے محروم ہو جائے گی جن کی وجہ سے اسے زندگی میں ایک نئے لطف اور روانی کا مزا آنے لگا تھا۔

چائے کا ایک سپ لیتے ہی وہ جیسے ایسے مسرور ہوئی کہ اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ جلدی جلدی وہ ساری چائے پی گئی اور حماد کی طرف دوسرے کپ کی چاہت سے دیکھنے لگی۔ حماد کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی اس لیے اس نے پہلے سے ہی کافی چائے بنائی تھی۔ صنوبر ابھی چائے پی رہی تھی اور دل ہی دل میں یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ جو کام اتنی دیر سے اس



کے سارے دلائل اور اس کی تاویلیں نہیں کر پائیں وہ حماد کی ایک کپ چائے نہ کر دیا تھا۔ وہ حماد کی اس ہوشیاری پر اس کی صلاحیت کی قائل ہو چکی تھی کہ وہ جانتا تھا اس کی چائے میں کیا جادو چھپا ہوا ہے۔ اسے خود بھی حماد کی چائے میں بہت لطف و سرور ملتا تھا لیکن یہ شاید اس سرور سے کچھ کم تھا جو اس کی ماما کو مل رہا تھا۔ چائے کا دوسرا کپ ختم کرنے کے بعد درشہوار کا رویہ کافی مصنوعی کا ہو گیا وہ یونہی بولی۔

''تم کیا سمجھتے ہو چائے پلا کر مجھے راضی کر لو گے اور میں بھول جاؤں گی کہ تم کیسے چوروں کی طرح یہاں سے گئے تھے۔''

صنوبر نے ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔'' مجھے معلوم ہے آپ اسے معاف کر چکی ہیں اب کیوں بے چارے کو پریشان کر رہی ہیں۔'' یہ دیکھتے ہی حماد نے فوراً ہی اپنی حرکت کی معافی مانگنا شروع کر دی اور درشہوار کو یقین دلایا کہ اب وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ یوں حماد کی نوکری پھر سے اس گھر میں پکی ہو گئی۔

حماد نے صنوبر کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے اور اپنی اس پریشانی میں بھی اس نے اس کی مجبوری کو سمجھا اور اسے اپنے گھر میں پھر سے ملازمت دلوانے میں دل و جان سے کوشش کی۔ صنوبر پریشان ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ کیوں؟ اب وہ سوچ رہا تھا کہ صنوبر کی پریشانی کو کیسے معلوم کرے۔۔۔ اسی سوچ و بچار میں دن ختم ہو گیا اور شام ہو گئی۔ کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا کہ وہ صنوبر کے پاس جائے اور اس سے اس کی پریشانی کی بابت پتا کرے۔ سوچ کے دائرے بنتے اور الجھتے چلے جاتے۔

صنوبر اداسی اور فکروں میں گھری ہوئی تھی جاتے ہوئے وہ شرجیل سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی کہ اس سے سلمان نے کیا کہا تھا جس سے اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اسی پریشانی میں اس نے شرجیل کو فون کیا۔ شرجیل جو خود صنوبر کو فون کرنے کا سوچ رہا تھا۔ صنوبر کا نام اپنے موبائل پر دیکھ کر فوراً ہی فون ریسیو کر کے بولا۔

''ہاں صنوبر کیسی ہو تم؟''

''تم اسکول کیوں نہیں آئے؟ مجھے تم سے ملنا تھا۔'' صنوبر نے جواب دیا۔

''ملنا تو مجھے بھی تھا تم سے۔ لیکن کچھ ایسی پریشانی رہی کہ سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں؟''

''کوئی نئی بات ہوئی ہے کیا؟ میں تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی سلمان نے تم سے کیا کہا تھا؟''

صنوبر نے ایک ہی سوال میں دو سوال کر لیے۔ دونوں سوالوں کا جواب ایک ہی تھا۔

''سلمان نے کیا کہا یہی ہے وہ نئی پریشانی اس لیے میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔''

شرجیل نے سوچ کی اتھاہ سے ایسے کہا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ اس سے پہلے کہ صنوبر کوئی اور سوال کرتی وہ پھر بولا۔

''سلمان نے مجھ سے کہا اچھا تو وہ تم ہو جو صنوبر کی زندگی کو مشکل بنا رہے ہو۔ جانتے ہو فارس تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے اگر تم کہیں بھی مل گئے تو تمہیں شاید اندازہ بھی نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔۔۔ بندہ غائب کرنا تو اس کے لیے چٹکیوں کا کام ہے۔''

''کیا۔۔۔۔ سلمان نے یہ کہا تم سے؟'' صنوبر کی پریشانی جیسے چھت سے لگ گئی۔

''ہاں۔۔۔'' ایک ہارے ہوئے آدمی کی سی آواز تھی جو اس وقت شرجیل کے منہ سے نکلی۔

''اسی لیے تم آج اسکول نہیں آئے؟'' صنوبر اس سوال کا جواب ہاں میں دینے کا مطلب تھا کہ وہ فارس سے ڈر گیا ہے۔ کچھ دیر وہ چپ رہا کچھ بولا نہیں تو صنوبر خود ہی بولی۔

''پھر تو تم نے بہت اچھا کیا شرجیل۔ ہمیں کسی سے بھی لڑنا نہیں ہے۔''

''ایسا نہیں ہے صنوبر کہ میں فارس کے ڈر سے اسکول نہیں آیا۔ میں یہ سوچتا رہا ہوں کہ اگر تمہارا اور میرا رشتہ ہونے سے پہلے اگر میرا فارس سے سامنا ہو گیا اور بات بڑھ گئی تو میرے لیے وہ ایک راستا بھی مشکل ہو جائے گا کورٹ میرج والا۔ اس لیے میں احتیاطاً نہیں آیا۔ اس سے جھگڑا ہونے کی صورت میں یہ بات میرے اور اس کے پیرنٹس کو پتا چل

جائے گی اور فارس کے والد یہ جاننے کے بعد میرے والد سے شکایت کریں گے۔ اس سب کے بعد اگر میں نے تم سے کورٹ میرج کی تو وہ سمجھیں گے میں نے تنبیہ کے بعد بھی ایسا کیا ہے تو وہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیں گے اور اس طرح میرا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں مگر میرے خاندان کا تو اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ انھیں کیوں سزا ملے۔ اس لیے میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' شرجیل نے تفصیل سے اپنی پریشانی اور اپنے اسکول نہ آنے کے بارے میں بتایا۔

یہ سب سن کر صنوبر گہری سوچ میں چلی گئی اسے شرجیل کی باتوں میں سچائی اور احتیاط دونوں نظر آئے اور اسے لگنے لگا کہ ایسی صورت حال میں تو کورٹ میرج کے علاوہ اور کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ تو کیا اس کی محبت کے لیے بس یہی ایک رستا باقی بچا ہے؟''

وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی۔ ایک مڈل کلاس لڑکی کے لیے کورٹ میرج کرنا جتنا مشکل ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل اس وقت صنوبر کے لیے تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنے ماں باپ کو اس بات پر راضی نہیں کر سکے گی کہ وہ اس کی کورٹ میرج کو سپورٹ کریں اور اوپن رشتا یا شادی ہونے کی صورت میں فارس اور اس کے خاندان کو پتا چلنا لازمی تھا۔ دونوں طرف کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر صنوبر نے کہا۔

''مجھے تم سے ملنا ہے شرجیل''

''میں بھی تم سے ملنا چاہتا ہوں صنوبر'' شرجیل کی گہری اور بھاری سی آواز میں جو بے بسی چھپی ہوئی تھی اسے صنوبر نے محسوس کر لیا۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس سے کیسے اور کہاں مل سکتی ہے۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم ندا کے گھر ملیں؟'' صنوبر نے اپنی دوست کا نام لیا تو شرجیل فوراً ہی سمجھ گیا کہ صنوبر کس ندا کی بات کر رہی ہے۔

''اچھا ایک بات بتاؤ کیا میرا بھائی سلمان تم سے ملنے کے بعد یہ جان چکا ہے کہ تمہارے والد کون ہیں اور تم کس خاندان سے ہو؟'' صنوبر کے ذہن میں اچانک ایک اور پریشانی نے سر اٹھایا۔

''کیوں۔۔۔۔تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟'' شرجیل نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اگر وہ یہ بات جانتا ہے تو وہ یہ بات اب تک فارس کمینے کو بتا چکا ہوگا۔''

''اوہ ہاں۔۔۔۔یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' شرجیل ایک دم ہی جیسے اچھل سا گیا۔

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سلمان میرے بارے میں کتنا جانتا ہے۔'' شرجیل کی آواز میں جو تشویش تھی اسے محسوس کر کے صنوبر کو لگا کہ پھر تو شرجیل کا کہیں بھی نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اب کیا کرے۔ اس طرح تو وہ شرجیل سے مل ہی نہیں سکتی۔ اور یہ بات اس کی روح تک اترنے والے دکھ کی طرح تکلیف دہ تھی۔ وہ ابھی سوچوں کی کھائیوں میں اتری ہوئی تھی کہ شرجیل بولا۔

''پتا نہیں تمہارا بھائی کس سوچ کا مالک ہے جو تمہیں ایک غنڈے کے ہاتھوں سونپنے پر راضی ہے۔ کیا بھائی بھی ایسے ہوتے ہیں۔ میری کوئی بہن ہوتی تو چاہے مجھے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑتی میں ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہونے دیتا۔ یہ بات میں نے سلمان سے بھی کہی تھی۔''

''تو اس نے کیا کہا؟'' صنوبر نے اپنے بے حس بھائی سلمان کے بارے میں سوچتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

''کچھ نہیں وہ یہ سن کر بس چپ رہا۔'' شرجیل نے کہا تو صنوبر کا دل زور سے دھڑکا اور وہ بولی۔

''میں تمہیں کچھ دیر بعد پھر سے فون کرتی ہوں'' اس سے پہلے کہ شرجیل یہ پوچھتا کہ کیا ہوا وہ کیوں بات کو درمیان سے منقطع کر رہی ہے صنوبر نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

فون بند کرتے ہی صنوبر کے دل میں جس خیال نے ہلچل مچائی تھی وہ اس کی تصدیق کے لیے سلمان کے کمرے کی

طرف چل پڑی۔ سلمان ابھی ابھی اپنے کمرے میں گھسا تھا۔ جانے سارا دن کہاں مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ اس نے صنوبر کو اپنے کمرے میں آتے دیکھا تو حیران ہوا کیونکہ اس دن کے جھگڑے کے بعد سے صنوبر تو اس سے بات تک نہیں کر رہی تھی اس کے کمرے میں تو وہ ویسے بھی نہیں آتی تھی۔ کوئی بہت ضروری کام ہوتا تو ہی آتی تھی۔ سلمان نے اسے مشکوک سی نظروں سے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

''تمہیں یاد ہے سلمان بچپن میں جب ماما اور پاپا کی لڑائی ہوتی تو ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سہم کر دبک کر ایک دوسرے کو پکڑ کے اس طرح چھپ جایا کرتے تھے جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو ان کے غضب سے بچانا چاہتے ہوں۔ ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے ان دونوں کا جھگڑا ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور وہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تو ضرور بلاوجہ اپنا غصہ ہم پر نکالے گا اور ہمیں مار پڑ سکتی ہے۔ تب مجھے یاد ہے تم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا تم بالکل مت ڈرو۔ تمہیں شاید یہ بات نہیں معلوم ہوگی میں تمہیں آج بتاتی ہوں جب تم مجھے تسلی دیا کرتے تھے تو مجھے تمہاری بات پر اتنا یقین ہوتا تھا جیسے تم واقعی مجھے دنیا میں کسی سے بھی بچا لو گے اور مجھے کچھ نہیں ہونے دو گے۔''

صنوبر اس کے بیڈ پر بیٹھی ہوئی اپنی بات ایسے کہے چلی جارہی تھی جیسے وہ کسی اسٹیج پر کسی کردار کے یاد کیے ہوئے مکالمے بول رہی ہو۔ سلمان اس کی طرف دیکھ کر شدید حیرت میں غوطے کھانے لگا۔

''اس وقت تو واقعی ایسا تھا میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ میری بہن تو بے قصور ہے وہ معصوم اور چھوٹی ہے اسے اگر ماما یا پاپا نے کچھ کہا تو میں انھیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ ان کے ہاتھ پہ کاٹ لوں گا یا پھر تمہیں لے کر کہیں دور بھاگ جاؤں گا۔ کہاں؟؟ یہ تو میں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا۔'' سلمان کو بھی جیسے اپنا بچپن اور اس کے مناظر یاد آنے لگے۔

''بچپن واقعی بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ رشتے اور سب چیزیں بہت واضح اور صاف دکھائی دیتی ہیں۔ دوست اور دشمن بھی کون ہیں سب کچھ بالکل سامنے ہوتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس وقت ہمیں اپنے ماں باپ ہمارے دشمن معلوم ہوتے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے جیسے سب سے اچھے دوست تھے۔ پتا ہے ایسا کیوں تھا؟'' صنوبر نے سلمان کی طرف دیکھا جو نہایت دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ایسا لیے تھا کہ بچے بھی جانوروں اور پرندوں کی طرح ہوتے ہیں جو اپنے جیسے اور اپنی طرح کے پرندوں سے نہ ہی ڈرتے ہیں اور نہ ہی انھیں اتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں کہ وہ ان سے خوف زدہ ہو جائیں۔ بچے بھی ایسا ہی سمجھتے اور سوچتے ہیں۔ اسی لیے بچوں میں ہمیشہ دوستی ہو جاتی ہے بچے بڑوں کے مجمع سے نکل کر اپنے جیسے بچوں کو تلاش کرتے ہیں اور ان کے ساتھ پہلے سے شناسائی نہ ہونے کے باوجود بھی ایک ہی پل میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے کھیلنے لگتے ہیں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔'' وہ جیسے سانس لینے کو رکی۔ ''بچپن واقعی زندگی کا سب سے خوبصورت عہد ہوتا ہے''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' سلمان نے یہ کہا اور پھر جیسے کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ دونوں خیالوں کی دنیا میں جانے کہاں سے کہاں چلے گئے۔ تاہم سلمان جلد ہی حال اور حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا اور اس نے خرد کی زمین پر قدم رکھتے ہی پوچھا۔

''یہ آج تمہیں اس قسم کی پرانی باتوں کا خیال کیوں آیا ہے صنوبر؟''

''میں سوچ رہی تھی کہ کیا تم میرے وہ ہی بچپن والے بھائی ہو؟'' صنوبر نے آنکھیں پھیلا کر چہرے کو اور بھی وسیع کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں وہ ہی ہوں۔۔۔ اس میں تمہیں کوئی شک ہے؟'' سلمان ڈھٹائی سے بولا۔

''نہیں۔۔۔ تم وہ نہیں ہو۔۔۔ اگر تم وہ ہوتے تو مجھے ایک غنڈے، ایک بدمعاش سے شادی کرنے کا مشورہ کبھی نہیں دیتے۔'' صنوبر نے جذبات کا سہارا لیا۔

''تم غلط سوچتی ہو۔ یہاں اس دنیا میں سب کسی نہ کسی شکل کے غنڈے ہیں۔ سب اپنے مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اور اسی کی پروا کرتے ہیں۔ فارس میں کچھ بری عادتیں ہیں لیکن اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ یہ سب عادتیں شادی کے بعد

چھوڑ دے گا۔ اور تمہیں اس کی ان عادتوں سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اس کلاس کی عورتوں کو مردوں کی شرافت کی نہیں ان کے بینک بیلنس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو فارس کے خاندان اور خود فارس کے پاس بہت زیادہ ہے۔"

"لیکن سلمان میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ محبت کرتی ہوں اس سے" صنوبر کی آواز ایک دم ہی اونچی ہوگئی۔

"محبت کا تو تم نام نہ لو۔ اس کلاس میں محبت تو بہت ہی ناپائیدار ہوتی ہے۔ یہاں سب کچھ پیسا ہے۔ اور شاید باقی دنیا میں بھی پیسے سے زیادہ مضبوط سہارا اور کوئی نہیں ہوتا۔ رہی تمہاری پسند کی بات تو پسند بھی حیثیت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔" سلمان اپنے حساب سے کافی سمجھداری کی باتیں کر رہا تھا۔

"لیکن میں شرجیل سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے ایسے کہا جیسے وہ التجا کر رہی ہو۔

"ہاں میں ملا ہوں اس لڑکے سے۔ لڑکا تو اچھا تھا وہ بھی مگر اس کی حیثیت فارس کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے ان فیکٹ اس کا خاندان تو فارس کے خاندان کا کافی محتاج ہے۔ فارس کے والد کے جتنے شیئرز شرجیل کے والد کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اگر فارس کے والد چاہیں تو اس کمپنی پر جب چاہیں قبضہ کرلیں وہ تو ان کی مہربانی ہے جو انھوں نے شرجیل کے والد کو فری ہینڈ دیا ہوا ہے۔ اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کچھ تمہیں فارس سے شادی کر کے مل سکتا ہے وہ شرجیل سے شادی کر کے کبھی نہیں مل سکتا۔"

سلمان کی بے تکی تقریر نے صنوبر پر کوئی اثر نہیں کیا اور وہ جو بات جاننے آئی تھی اس کے بارے میں پوچھنے کا اس سے اچھا موقع نہیں تھا۔

"اسی لیے تم نے شرجیل کے بارے میں سب کچھ اس کمینے فارس کو بتا دیا ہوگا ہے نا؟"

سلمان اس کی بات سن کر جیسے لمحے بھر کو چپ سا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے اب تک یہ سب فارس کو کیوں نہیں بتایا کہ شرجیل اس کے گھر اپنی ماں کے ساتھ رشتا لے کر آیا تھا۔ اور یہ شرجیل سرفراز ملک کا بیٹا ہے جو فارس کے والد کے پارٹنر ہیں۔

"میرے سوال کا جواب دو سلمان۔۔۔ کیا تم میرے دشمن بن چکے ہو۔ تمہیں میری خواہشات کا کوئی خیال نہیں ہے۔ کیا ایک بار پھر سے تم میرے لیے میرے وہ ہی بھائی نہیں بن سکتے جو بچپن میں مجھے سب لوگوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے کا یقین دلایا کرتا تھا۔" صنوبر کے دل میں امنڈنے والے جذبات اور احساسات مصنوعی نہیں تھے وہ حقیقت میں اپنے احساسات کی عکاسی کر رہی تھی جو اس وقت اس کے دل اور روح میں موجزن تھے لیکن جس مزاج اور جن خیالات کی مالک صنوبر تھی ایسی سب ہی باتیں اس طبقے میں مذاق سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔

لحظے بھر کو سلمان کا دل مچلا لیکن یہ وقت اتنا مختصر تھا کہ کسی اور کو تو کیا پتا چلتا خود سلمان کو بھی پتا نہیں چلا کہ اس کے اندر کچھ ہوا تھا۔ اس نے صنوبر کو ایک اجنبی مسخرے پن سے دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"تم آجکل انڈین فلمیں زیادہ دیکھ رہی ہو۔ اس قسم کی جذباتی باتیں ان فلموں میں چھوٹے اور معمولی لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کی جاتی ہیں۔ ان کا زندگی کی اصل حقیقت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔"

"میں جانتی تھی تم سے کوئی اچھی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔ تم اسی قسم کی باتیں کر کے میرا دل دکھاؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ سلمان اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ ابھی دروازے سے باہر نہیں نکلی تھی کہ وہ بولا۔

"تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے شرجیل کے بارے میں سب کچھ فارس کو بتا دیا ہوگا۔ تو میں خود حیران ہوں کہ یہ اتنی بڑی اور اہم بات میں نے اب تک فارس کو کیوں نہیں بتائی۔"

"کیا۔۔۔ تم نے فارس کو نہیں بتایا شرجیل کے بارے میں" صنوبر سے اس کی بے چینی اور خوشی چھپی نہیں رہ سکی اور سلمان سمجھ گیا کہ وہ اس سے یہی پوچھنے کے لیے آئی تھی۔

"اگر تمہیں اس بات سے کوئی فائدہ ہوتا ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں فارس کو شرجیل کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

سلمان نے پتا نہیں کس جذبے کے تحت یہ بات کہہ دی اسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ اسے لگا اس وقت اسے یہ کہہ دینا چاہیے۔ صنوبر اس کی بات سن کر جیسے نہال ہی ہوگئی وہ وارفتگی سے پلٹی اور آ کے سلمان کے سینے سے چمٹ گئی۔ ایک خبیث اور شیطان صفت انسان کو سلمان کو اس وقت صنوبر کا اس کے گلے لگنا اتنا اچھا لگا کہ اسے لگنے لگا جیسے اسے پتا نہیں کیا مل گیا ہے۔ کتنے عرصے سے وہ ایسی ہی کسی جپھی یا پیار کو جیسے ترسا ہوا تھا۔ لیکن پیار وہ احساس ہے جو کسی سے شراب کے گلاس کی طرح نہ تو خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی مانگا جا سکتا ہے۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ اور یہ چیز قدرت نے صنوبر کو دی ہوئی ہے وہ شاید سچ کہتی ہے اسے دولت اور بینک بیلنس سے زیادہ محبت کی پروا ہے اور محبت کے لیے وہ کتنی بھی دولت اور حیثیت کو ٹھوکر مار سکتی ہے۔

صنوبر کب کی جا چکی تھی اور وہ مسلسل اس نئے رونما ہونے والے واقعے کے حصار سے اب تک نکل نہیں سکا تھا۔ لیکن کب تک سلمان جیسے انسانوں کو ایسے احساسات اور جذبات ہمیشہ کے لیے اپنا نہیں بناتے۔ ویسے بھی جس قسم کی سرگرمیوں میں سلمان پڑا ہوا تھا ان میں اتنی طاقت تو ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی انسان کی روح کی تازگی کو نچوڑ کے پی جائیں۔ بالکل ایسے جیسے جسم کی راحت کا وزن ہمیشہ روح کی راحت اور خمار سے زیادہ ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں برے انسان زیادہ اور اچھے انسان اتنے کم نہ ہوتے۔

فارس سلمان کو وہ کچھ دے سکتا تھا جو شرجیل اسے نہ تو دے سکتا تھا اور نہ ہی سلمان اس کے بارے میں ایسا سوچ سکتا تھا۔ بکنے والی عورتوں میں سے کوئی ایک تو ہر ویک اینڈ پر فارس اور اس کے دوستوں کا دل بہلا رہی ہوتی اور اب تو فارس کے لیے سلمان کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ تھی سو صنوبر کی پیار کی جپھی کتنی دیر تک اپنا اثر قائم رکھ سکتی تھی!!!

حماد نے جتنی مرتبہ بھی صنوبر کے کمرے میں جانے کی کوشش کی اسے وہ کسی سے فون پر بات کرتی ہوئی ملی اور بات چیت روک کر وہ اسے اشارے سے کہتی کہ بعد میں آنا۔ حماد سمجھ چکا تھا کہ کوئی ایسی پریشانی والی بات ہے جو صنوبر اتنی دیر سے فون پر بات کر رہی ہے۔ ورنہ عموماً اتنی زیادہ دیر تک فون پر بات نہیں کرتی تھی۔

''اس کا مطلب ہے سلمان نے اب تک فارس کو کچھ نہیں بتایا؟'' شرجیل نے کہا۔

''ہاں مجھے یقین ہے سلمان سچ بول رہا ہے۔'' صنوبر نے تیقن سے کہا۔

''تب تو ہمیں جلد سے جلد کوئی فیصلہ کرنا ہوگا صنوبر کیونکہ اس بات کی ضمانت نہ تمہارے پاس ہے اور نہ میرے پاس کہ سلمان اور کتنی دیر تک فارس کو یہ بات نہیں بتائے گا۔'' شرجیل نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

''میں اپنے بھائی کو جانتی ہوں شرجیل۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ یہ بات فارس کو کبھی نہیں بتائے گا۔ اس لیے تم اس کی طرف سے مطمئن رہو وہ نہیں بتائے گا۔'' صنوبر نے اس کی تسلی کے لیے کہا۔ حالانکہ اندر ہی اندر وہ بھی اس وسوسے میں مبتلا تو تھی کہ پتا نہیں سلمان کو اپنا وعدہ یاد بھی رہے گا یا نہیں۔

☆☆☆

یہ اندیشہ غلط نہیں ثابت ہوا۔ اگلے ہی دن سٹرڈے نائٹ تھی اور فارس نے دوستوں کے لیے دلبستگی اور موج مستی کا وسیع پروگرام بنایا ہوا تھا۔ باہر سے اچانک آنے والی شراب نے یہ سب ہنگامہ کرنے پر اکسایا جو فارس کا ایک دوست دو دن پہلے ہی کافی مقدار میں لایا تھا۔ بڑے لوگوں کے لیے ایسے ملک کا قانون توڑنا کبھی بھی مشکل نہیں ہوتا جہاں قانون ہوتا ہی صرف چھوٹے اور کمزور لوگوں کے لیے ہے۔ اس لیے یہ سوچنا فضول ہے کہ شراب نے ممنوعہ سرحدیں کیسے عبور کیں۔ یہ اعلیٰ درجے کی شراب سلمان اور اس جیسے شریک سب ہی لڑکوں کے کمزور ایمانوں کو پلک جھپکتے ہوا میں اڑا لے گئی اور سلمان نے بھی فارس سے وہ سب کچھ کہہ دیا جس کے نہ کہنے کا اس نے وعدہ کیا تھا اپنی بہن صنوبر سے۔

کہتے ہیں شرابی کو ہر قسم کے وعدے اور قسموں کو توڑنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور شراب کے نشے میں بولا گیا کوئی بھی سچ نہ تو سچ ہوتا ہے اور نہ جھوٹ ہوتا ہے۔ لیکن جو یہ بات جانتا ہے وہ چاہے اس پر یقین نہ کرے لیکن مفاد ایک ایسی پھلجڑی ہے جو جل کر خاک بھی ہو جائے تب بھی انسان اس سے اپنے حصے کی روشنی حاصل کر ہی لیتا ہے۔ جن معلومات

کے لیے فارس کتنے ہی دن سے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا وہ اسے اس طرح مل جائیں گی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی اسے سلمان پر غصہ تھا جس نے کئی دنوں سے اپنے پاس یہ قیمتی معلومات دبا کر اور چھپا کر رکھی ہوئی تھیں اور اسے دانستہ نہیں بتا رہا تھا یہ تو شراب کا کمال تھا جس نے سلمان جیسے کمزور کھلاڑی کے سارے کس بل ڈھیلے کر دیے اور اس کی رگوں سے سارے راز ایک ایک کر کے بہہ کر باہر نکلتے چلے گئے۔

''سالا کمینہ۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے یہ مجھے اپنی بہن سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اور سامنے کہتا ہے کہ میں تو صنوبر کو سمجھا رہا ہوں کہ اسے مجھ سے اچھا کوئی اور رشتہ نہیں ملے گا۔'' فارس کو ایک دم ہی غنڈوں والا جلال آ گیا۔ اگر سلمان صنوبر کا بھائی نہ ہوتا تو وہ اسے اس وقت اس حرکت کے جواب میں ایسا سبق سکھاتا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتا۔ لیکن ساری دنیا ایک طرف اور جورو کا بھائی ایک طرف والی مثال کبھی کبھی واقعی درست ثابت ہوتی ہے ویسے بھی شادی سے پہلے ہونے والی بیوی کا ہر رشتے دار قابل عزت ہوتا ہے اور شادی کے بعد۔۔۔۔'' جہانی نے پوچھا۔

''شادی کے بعد تو بیوی قابل عزت نہیں ہوتی تو اس کا کوئی رشتے دار کیسے ہو سکتا ہے۔'' فارس یہ کہہ کر خباثت سے ہنسنے لگا اور جہانی بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے بلاوجہ ہنسنے لگا۔

''لیکن دیکھنا یہ بات سلمان سے مت کہنا۔۔۔ سمجھے۔'' فارس کو احتیاط کی ضرورت محسوس ہوئی۔

''کیوں فکر کرتے ہو، میں کسی سے نہیں کہوں گا۔''

لڑکیوں کی طرح نرم و نازک اور خوبصورت جہانی کا دل اور ہمت کسی توانا اور تنومند مرد سے بھی زیادہ وسیع اور مرنے مارنے جیسی تھی اسے کبھی یہ پروا نہیں ہوتی تھی کہ اس کے سامنے کون ہے حتیٰ کہ وہ فارس سے بھی جب کئی دفعہ بھڑ جاتا تھا اور فارس کو ہی اسے بعد میں ایکسکیوز بول کے منانا یا راضی کرنا پڑتا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ جہانی وہ تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جنگوں میں توانا جسم نہیں بلکہ حوصلے اور جذبات لڑا کرتے ہیں۔ جہانی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس قدر گھٹیا محفلوں کا شریک و شیدائی ہے۔ شکل و صورت اور اپنے رکھ رکھاؤ سے وہ ایک اچھے خاندان کا ایسا نوجوان دکھائی پڑتا تھا جیسے کہ خاندانی شریف لوگ ہوا کرتے ہیں۔ وہ کیسے فارس جیسے بگڑے ہوئے امیر زادوں کی صحبت کا شکار ہوا یہ ایک الگ داستان ہے۔ اور اب تو وہ بھی گھٹنوں گھٹنوں اس دلدل میں دھنس چکا تھا اس حد تک کہ اس نے ہی سلمان کو بھی اس آتش جہنم میں جھونک دیا تھا۔ محرومیوں کا شکار نوجوانوں کو ایسے کاموں میں گھسیٹنا جتنا آسان ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ ان نوجوانوں کا شکار کرنا ہوتا ہے جو دولت کی گنگا میں نہا رہے ہوتے ہیں اور انہیں کوئی اور بھی چاہیے ہوتا ہے ساتھ نبھانے کو۔ عموماً اس قسم کے طبقوں کے لڑکے غریب اور مڈل کلاس لڑکوں کو اپنا دوست نہیں بناتے کیونکہ مڈل کلاس لڑکوں کے پاس شرم، جھجک اتنی ہوتی ہے کہ اتنی دیر میں شیطانیت ایک جہان کو مسخر کر سکتی ہے۔ اصل میں مڈل کلاسیوں کے پاس شرم اور عزت ہی سب کچھ ہوتا ہے اور جس کے پاس جو کچھ متاع حیات کی طرح ہوتا ہے وہ اسے آسانی سے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ دولت والوں کے پاس دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے اور وہ اس پر جان دیتے ہیں۔ ان کا دین ایمان سب کچھ روپیا اور پیسا ہوتا ہے یا اقتدار اور اقتدار کے لیے تو تاریخ بھری پڑی ہے۔ لوگ اپنے سگے باپ بھائیوں تک کا گلا کاٹتے آئے ہیں تو دوست اور محفل کے شریک کار کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ سلمان بھی دراصل فارس کے لیے ایک اقتدار پر چڑھنے والی سیڑھی کی طرح ہی تھا۔ شاید یہ بات کم لوگ جانتے ہوں کہ عورت بھی مرد کے لیے ایک قسم کا اقتدار ہی ہوتی ہے جسے پانے کے لیے وہ کسی کا بھی خون کر سکتا ہے اور کسی کے بھی پاؤں میں گر سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو عورت جاہ و حشم والے اقتدار سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے اور یہ بات اس وقت فارس پر صادق آ رہی تھی۔ وہ صنوبر کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا مشکل یہ تھی کہ صنوبر خود اس کے ہاتھ آنے پر آمادہ نہیں تھی اس لیے اسے ہاتھ ذرا احتیاط سے رکھنا پڑ رہا تھا۔

☆☆☆

سلمان کو ہوش آنے پر بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ اس نے کیا حرکت کر دی ہے۔ صنوبر اسی دھوکے میں رہی کہ اس کا

بھائی کم سے کم یہ ایک وعدہ تو نبھا ہی دے گا۔ اسی لیے اس نے شرجیل کو ندا کے گھر ملنے کے لیے بلا لیا۔ جب وہ گھر سے نکلنے لگی تو حماد نے ہمت کر کے اس سے کہا۔

''صنوبر بی بی آپ بہتر سمجھیں تو مجھے بھی ساتھ لیتی جائیں''

صنوبر اس کی اس بات پر کوئی اور موقع ہوتا تو زور زور سے ہنستی کہ یہ اتنا سا لڑکا اس کی کیا مدد کر سکتا ہے مگر اس وقت تو اسے یہ سوچنے کی فرصت بھی نہیں تھی کہ حماد نے اتنی اچانک یہ بات کیوں اور کس لیے کہی۔ اسے کیا معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر عجلت سے بولی۔

''اچھا تم یوں کرو جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ'' حماد اس وقت گھر میں کام کرنے والے ملازموں کے حلیے میں تھا۔ حماد سرعت سے گیا اور دوسرے ہی لمحے واپس آ گیا صنوبر چونکی تو ضرور کہ اتنی جلدی وہ کیسے گیا اور چینج کر کے واپس آ گیا لیکن بولی کچھ نہیں۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' راستے میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے حماد نے اس خاموشی کو توڑنے کی خاطر کہا جو کتنی ہی دیر سے گاڑی میں موجود تھی۔ اس کی بات سن کر ایک صنوبر چونکی اور اس نے بنا پیچھے دیکھے ہوئے کہا۔

''اپنی ایک دوست کے گھر جا رہی ہوں'' حماد جانتا تھا کہ وہ ندا کے پاس جا رہی ہے اور وہاں شرجیل آنے والا ہے۔ اس نے صنوبر کی ساری باتیں سن لی تھیں یہ تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ سلمان تھا اور سلمان میں یہ شکتی موجود تھی کہ وہ موٹی اور ساؤنڈ پروف دیواروں کے پیچھے ہونے والی گفتگو بھی با آسانی سن سکتا تھا۔

''آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ کیا آپ مجھے اپنی پریشانی نہیں بتائیں گی؟'' صنوبر کو اس کی یہ بات بہت عجیب سی لگی۔

''چپ چاپ بیٹھو میں تمہیں پتا نہیں کیوں ساتھ لے آئی۔''

صنوبر کی بات حماد کے لیے توقع کے عین مطابق تھی وہ جانتا تھا کہ وہ حماد نہیں سلمان ہے۔ وہ سلمان جو صنوبر پر عاشق ہے لیکن صنوبر یا کوئی اور یہ بات نہیں جانتے تھے کہ وہ کون ہے۔ اور ایک گھریلو ملازم کو وہ بھی سولہ سترہ سال کے کمسن لڑکے کو کوئی بھی صنوبر جیسی حیثیت کی مالک لڑکی کیوں اپنی پریشانی یا باتیں بتانا چاہے گی۔

''ٹھیک ہے مت بتائیے۔۔۔ مگر میں آپ کے کام آ سکتا ہوں۔'' ایک دم ہی صنوبر کے پاؤں بریک پر پڑے اور گاڑی دور تک گھسٹ کر رک گئی۔ شکر ہے کہ آگے پیچھے کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی اور ویسے بھی یہ ایک سنسان سڑک تھی جو مین شاہراہ کی ذیلی سڑک میں شمار ہوتی تھی ندا کا گھر بس آنے ہی والا تھا۔

''تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ کیا جانتے ہو تم۔ میری کیا مدد کر سکتے ہو؟'' گاڑی روک کر وہ مڑی اور غصے سے پیچھے مڑ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے حماد پر برسنے لگی۔

''میں نے کہا تھا نا بچپن میں میں نے کچھ علم سیکھا تھا اسی علم کی وجہ سے میں یہ جانتا ہوں کہ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں اور اس وقت آپ ایک قسم کی مشکل میں ہیں۔''

حماد نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھ کر نظریں نیچے کرتے ہوئے کہا۔

''کیا۔۔۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو میں سمجھ نہیں پا رہی۔ صاف صاف کہو تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیا..... مگر مدد کر ضرور سکتا ہوں۔ میں یہ بات جانتا تھا اسی لیے میں نے آپ کے ساتھ آنے کی درخواست کی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ ضرور لے کر جائیں گی، چاہ کر بھی انکار نہیں کر سکیں گی۔'' حماد کی باتوں نے صنوبر کو الجھن میں ڈال دیا۔

''پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں تو تمہیں ساتھ لا کر پچھتا رہی ہوں'' صنوبر نے دوبارہ سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ حماد نے سوچا اس وقت کوئی بھی بات کہنا فضول ہے اس لیے وہ چپ ہو گیا۔

گاڑی ندا کے گھر کے پاس رکی اور صنوبر جلدی سے نیچے اتری حماد بھی اترنے لگا تو وہ بولی۔

"نہیں تم یہیں بیٹھے رہو سمجھے۔" وہ اترتے اترتے رک گیا۔ اور اس عالیشان گھر میں جو صنوبر کے گھر کی طرح اس کی کلاس کا آئینہ دار تھا۔ وہ اپنی ہی طرح ایک امیر کبیر لڑکی سے ہی ملنے آئی ہے۔ صنوبر گھر کے گیٹ کے باہر لگی ڈور بیل بجا کر کچھ ہی دیر میں اندر چلی گئی۔ نزدیکی غلام گردش میں ہی اسے ندا مل گئی جو اس کی آواز سن کر اسے لینے کے لیے ہی آرہی تھی۔

"کیا وہ شرجیل آگیا؟" صنوبر نے بے صبری سے پوچھا۔

"نہیں وہ تو ابھی نہیں آیا۔" ندا نے جواب دیا تو صنوبر نے جلدی سے گھڑی دیکھی۔

"کیا وقت ہوا ہے۔" گھڑی دیکھنے کے بعد وہ آپ ہی آپ بولی۔

"ارے ابھی تو آدھا گھنٹا باقی ہے میں ہی کچھ جلدی آگئی۔" یہ کہہ کر دونوں سہیلیاں ندا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔۔۔ آج ندا کے والدین اس کے بھائی کے ساتھ اس کی پسند کی لڑکی دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ اس کا بھائی عاطر بھی ساتھ گیا تھا۔ اس لیے گھر میں کوئی نہیں تھا۔

"مجھے پتا ہے تمہیں بھی اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ جانا تھا اور تم میری وجہ سے نہیں گئیں۔ میں تمہارا کس زبان سے شکریہ ادا کروں ندا" صنوبر نے اس کی کرم نوازی کے احساس میں ڈوب کر کہا۔

"ارے کیوں اس قدر فارمل ہو رہی ہو، وہ میری دوست ہے میں اس سے اکثر ملتی رہی ہوں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تم تو خوامخواہ اتنی فارمل ہو رہی ہو۔ میں نے شرمین کو فون کر دیا تھا وہ برا نہیں مانے گی۔ ہم دونوں میں کافی انڈرسٹینڈنگ ہے۔ اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔" ملازموں کو میں نے خود ہی چھٹی دے دی تھی۔"

صنوبر اس کی مزید ممنون احسان ہوگئی۔ جس کا اظہار اس نے اپنی آنکھوں اور چہرے سے کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چائے والے تکلف سے ندا کو روک دیتی لیکن اس وقت اسے شرجیل کا انتظار کرنا تھا اور وہ جانتی تھی انتظار کرنا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ وقت گزرتا گیا اور انتظار طویل ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ رات کے دس بج گئے اور ندا کے گھر والوں کے آنے کا وقت ہو گیا۔ صنوبر نے کئی بار فون لگانے کی کوشش بھی کی لیکن شرجیل کا فون مسلسل بند آتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر شرجیل وعدہ کر کے بھی آیا کیوں نہیں اور اب وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔ اسے تو آج اس سے کورٹ میرج کے بارے میں بات کرنا تھی۔ اور یہ آئیڈیا تو خود شرجیل کا ہی تھا پھر وہ اس بات سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

پریشانی دھیرے دھیرے غصے میں بدل گئی اور وہ ندا کے سامنے بار بار شرمندگی سے یہ کہتی رہی کہ شرجیل نے ایسا کیوں کیا؟ وہ ایسا کرتا تو نہیں ہے ایسا کیا کام آن پڑا کہ اس نے اپنا فون بھی بند کیا ہوا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے جب وہ پوری طرح تھک کر مایوس ہو گئی تو اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی یہ بات یاد آنے لگی کہ یہ لڑکا پہلے بھی بزدلی کا مظاہرہ کر چکا ہے اور اب بھی پتا نہیں کب تمہیں راستے میں چھوڑ کے چلتا بنے۔"

اسی قسم کے خیالات کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے چلنے لگی اسے تو یہ تک یاد نہیں تھا کہ اس کی گاڑی میں اس کا ملازم حماد بیٹھا ہوا ہے جسے وہ انتظار کرنے کا کہہ کر گئی تھی اور اب اس بات کو تین گھنٹے سے بھی زیادہ ہو چکے تھے۔

"وہ نہیں آئے؟" حماد کی آواز پر وہ بری طرح چونکی اور ایک بار پھر اس کی گاڑی ایک تناور درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"تم۔۔۔ اوہ میں تو تمہیں چھوڑ کر بھول ہی گئی تھی۔" پھر وہ سنبھلی اور بولی۔

"تم کس کے بارے میں بات کر رہے تھے؟"

"وہ ہی جن سے آپ ملنے آئی تھیں۔" حیرت کا ایک اور جھٹکا صنوبر کو محسوس ہوا۔

"میں کس سے ملنے آئی تھی۔ حماد تم کیا جانتے ہو؟ میں تو اپنی دوست کے گھر اسی سے ملنے آئی تھیں"

"یہ ٹھیک ہے کہ آپ اپنی دوست کے گھر آئی تھیں مگر آپ اپنی دوست سے نہیں کسی اور سے ملنے آئی تھیں۔ اور جس

سے آپ ملنے آئی تھیں وہ آئے نہیں۔''
''یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟'' صنوبر کو حیرت اور غصہ ساتھ ساتھ آنے لگا۔
''ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے آپ جلدی سے یہاں سے چلیں۔ صنوبر بی بی۔''
''کیوں کیا ہوا ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟'' صنوبر کو اس کی باتوں کی پراسراریت سے الجھن ہونے لگی۔
''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں جن سے آپ ملنے آئی تھیں اس وقت ان کو آپ کی ضرورت ہے!'' حماد نے کہا تو صنوبر کے اوسان خطا ہو گئے۔
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو حماد پلیز مجھے صاف صاف بتاؤ۔'' وہ جیسے بے بسی سے بولی۔
''آپ فی الحال گاڑی چلائیں نہیں تو بہت دیر ہو جائے گی۔ پلیز''
اور اس بار صنوبر نے اس کی بات مانتے ہوئے گاڑی چلانا شروع کر دی۔ پھر حماد کے کہنے پر ہی وہ گاڑی کی اسپیڈ ہی بڑھاتی نہیں رہی بلکہ جن راستوں سے وہ کہتا رہا وہ ان ہی راستوں کی طرف چلتی رہی کوئی ایک گھنٹے سے بھی زیادہ کی ڈرائیو کے بعد حماد نے گاڑی کو ایک سنسان ٹوٹی پھوٹی سڑک پر روکنے کو کہا تو صنوبر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دور دور تک کوئی آبادی تھی نہ کوئی انسان لق و دق ویرانہ اور کہیں گھنی جھاڑیاں ایستادہ تھیں۔
حماد ایک راستے کی طرف چلنے لگا۔ صنوبر کو ڈر محسوس ہوا اور اسے لگا یہ لڑکا اسے بہکا کر جانے کہاں لے آیا ہے اور اب شاید یہ کسی کو تلاش کر رہا ہے پتا نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ میں کیوں اس کی باتوں میں آ گئی۔ پتا نہیں اس کا کیا ارادہ ہے۔
بڑے گھروں کے نوکروں کی ملی بھگت سے ہونے والے کتنے ہی واقعات اسے یاد آنے لگے جن میں نوکروں نے گھر لوٹنے یا اغوا برائے تاوان کے لیے اپنی ایمانداری کا سودا کیا تھا۔ تو کیا وہ ایسے کسی جال میں پھنسنے والی ہے۔ یہ سوچ کر مارے خوف کے اس کی گھگی سی بندھ گئی دور دور تک پھیلا اندھیرا اس وقت اس کے خوف اور ڈر میں مسلسل اضافہ کر رہا تھا۔ اور جیسے ہی صنوبر نے خود اس طرف کو دیکھنا چاہا جہاں حماد گیا تھا تو اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ ڈر سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں یا خدا یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔ اور حماد...... وہ خود کہاں چلا گیا۔ کہیں وہ کسی کو لینے تو نہیں گیا۔ اس کا کوئی ساتھی جس کے ساتھ مل کر وہ اس قسم کی وارداتیں کرتا رہا ہو۔ اس قسم کی باتوں کے درمیان ہی اسے اچانک خیال آیا کہ اس وقت وہ گاڑی کے پاس اکیلی ہے اور چاہے تو یہاں سے بھاگ بھی سکتی ہے۔
حماد کو یوں اس طرح اس ویرانے میں اکیلا چھوڑ کر پہلے تو اس کا دل نہیں مانا مگر جب اس کا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ وہ ضرور کسی جرائم پیشہ گروہ سے ملا ہوا ہے تو اسے یہاں سے فی الفور بھاگ جانے میں ہی عافیت نظر آئی۔ وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھی اور جیسے ہی اس نے گاڑی چلانا چاہی تو گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس میں اسے کوئی اپنی گاڑی کے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ صنوبر نے ڈرتے ڈرتے توجہ سے دیکھا تو اس آدمی نما ہیولے کے کاندھے پر کوئی سامان لدا ہوا تھا۔ وہ اس کی گاڑی کے عین سامنے آ کے کھڑا ہو چکا تھا اور اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ گاڑی اس پر سے گزارتی ہوئی چلی جائے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس نے زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیے تاکہ گاڑی کے سامنے آنے والا سامنے سے ہٹ جائے۔ لیکن وہ تو چلتا ہوا خراماں خراماں الٹا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔
یا اللہ مدد! جتنی بھی دعائیں وہ مانگ سکتی تھی اس نے مانگنا شروع کر دیں لیکن کچھ بھی کام نہیں آیا اور وہ ہیولا اس کے عین نزدیک پہنچ گیا۔ ڈر خوف کے مارے صنوبر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تب ہی گاڑی کا گیٹ کھول کر کسی نے کچھ اندر رکھا اور عجلت سے بولا۔
''جلدی سے چلیے صنوبر بی بی انھیں ہوسپٹل پہنچانا ہوگا''
حماد کی آواز کو صنوبر پہچان گئی اور اس نے خوف کی عفریتوں کے چنگل سے نکل کر جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔
''تم کس کی بات کر رہے ہو کون ہے یہ؟''

یہ کہتے کے ساتھ ہی صنوبر نے گاڑی کے اندر کی لائٹ جلدی جلائی اور اور پھر مڑ کر پیچھے دیکھا تو اس کی چیخیں نکل گئیں جو اس ویرانے میں دور دور تک سنی گئیں۔

"یہ۔۔۔یہ۔۔۔۔۔۔تم۔۔۔" اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"اس وقت کوئی بھی سوال جواب چھوڑیں انھیں جلدی سے ہوسپٹل پہنچائیں نہیں تو بہت دیر ہو جائے گی صنوبر بی بی۔۔۔پلیز ہوش کریں اور گاڑی چلائیں۔"

حماد کی بات نے اس کے ہوش وحواس کسی حد تک بحال کر دیے اور وہ گاڑی کو ہوا کی اسپیڈ سے اونچے نیچے راستوں پر بھگائے چلی گئی۔

☆☆☆

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔میں نے اسے جان سے مارنے کو نہیں کہا تھا" فارس نے غصہ اپنے اندر دباتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب ایسا ہو جاتا ہے۔اب ہم کوئی ناپ تول کے تو کسی کو نہیں مارتے۔وہ بندہ تھا ہی اتنا نازک دو ہاتھ پڑے چکرا کے گرا اور اور پھر۔۔۔۔۔۔"

"تب تو وہ زندہ ہوگا۔مرا نہیں ہوگا۔" فارس کے ذہن میں امید نے سر اٹھایا۔

"ہوسکتا ہے زندہ ہو۔مگر جہاں ہم نے اسے پھینکا تھا وہاں دور دور تک کسی انسانی آبادی یا انسان کے گزرنے کی امید نہیں ہے۔اس لیے وہ وہاں پڑے پڑے مر بھی سکتا ہے۔"

اوباش قسم کے اس نوجوان نے جس کا نام صابو تھا، لاپروائی سے کہا۔

"اب آپ ہمارے پورے پیسے دے دو ہم نے تمہارا کام کر دیا ہے۔" صابو نے ایک تیلی کو دانتوں میں اِدھر اُدھر گھما کر بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

جہانی کو جو اس وقت بھی فارس کے ساتھ تھا یہ سب سن کر ایک جھرجھری سی آئی اور لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔فارس نے جیب سے چیک نکال کر خراب موڈ سے صابو کے حوالے کرنا چاہا تو وہ بولا۔

"لگتا ہے تم نے پہلی بار کسی کی سپاری دی ہے۔ان کاموں میں یہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں چلتا جناب۔۔۔کیش پیسے دینے ہوتے ہیں۔کیش۔۔۔"

"کیش۔۔۔وہ تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔اچھا تم کچھ دیر انتظار کرو میں بینک سے خود جا کر کیش لاتا ہوں" فارس کے ذہن میں اب بھی پریشانی کا سینسر کچوکے لگا رہا تھا اسے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ کہیں شرجیل مر نہ گیا ہو اگر ایسا ہوا تو کہیں کوئی مشکل نہ کھڑی ہو جائے۔اس نے تو صرف اسے کچھ سبق سکھانے کے لیے صابو بدمعاش کو سپاری دی تھی اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے جان سے ہی مار دے گا۔لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔

"اچھا میں ابھی آتا ہوں" فارس نے کہا۔"آؤ جہانی" لیکن جیسے ہی فارس کے ساتھ جہانی چلنے کے لیے مڑا تو اسے لگا جیسے کسی نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔یہ صابو کا ساتھی تھا۔

"یہ نہیں جاسکتا" صابو نے کہا۔

"کیوں۔۔۔کیوں نہیں جاسکتا؟" فارس کو ایک دم ہی غصہ آنے لگا۔

"تمہارا کام پورا ہو گیا مگر ہماری پیمنٹ ابھی باقی ہے۔پیسے پورے کر دو پھر اسے لے جانا۔" صابو کی یہ بات سن کر جہانی کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے فارس میں یہاں نہیں رکوں گا۔ویسے بھی اس سب سے میرا کیا لینا دینا" جہانی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔صابو کے بندے نے اب تک اس کا ہاتھ اسی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔اور جہانی جیسے امیر نرم ونازک لڑکے کے سفید سفید ہاتھوں میں خون جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔

فارس کو لگا کہ یہ لوگ کافی خطرناک ہیں اور اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ جہانی یہاں رکے یا وہ خود یہاں رکے

اور جہانی پیسے لے کر آئے۔
''اگر تم نہیں رکنا چاہتے تو کوئی بات نہیں جہانی۔ میں رک جاتا ہوں۔ تم بینک سے جا کر پیسے لے آؤ'' فارس نے دوستانہ انداز میں کہا۔
''نہیں۔۔۔۔ یہاں اسی کو رکنا ہوگا'' صابو کا ایک ساتھی جو بڑی دیر سے مسلسل جہانی کو دیکھ رہا تھا۔ بولا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف دیکھنے میں ہی خوفناک نہیں تھا اس کی آواز بھی ایسی تھی جیسے کوئی بھیڑیا بول رہا ہو۔ یہ سنتے ہی جہانی کے جسم کا سارا خون خشک ہونے لگا، حلق میں جیسے کانٹے سے پڑ گئے۔ صابو اس ساری صورت حال سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنے ساتھی سے مسخرے پن سے بولا۔
''کیوں بے وحشی تجھے اس لونڈے میں کیا دلچسپی ہے یہ رکے یا وہ دوسرا والا اس سے فرق کیا پڑتا ہے''
''فرق نہیں پڑتا تو استاد پھر اسی کو روک لونا۔ کبھی کبھی تو ہماری بات بھی مان لیا کرو'' وحشی نے کچھ عجیب سے انداز سے کہا تو جہانی کو اپنی روح قبض ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔
''نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ فارس میں یہاں نہیں رکوں گا۔ تم مجھے یہاں چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔'' بڑی مشکل سے جہانی نے اپنی بات مکمل کی۔
''ڈرتا کیوں ہے، ہم کوئی تجھے کھا تو نہیں جائیں گے۔ بس کچھ ہی دیر کی تو بات ہے'' صابو نے اس کا ہاتھ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے چھڑا کر خود جہانی کا ہاتھ آرام سے پکڑ کر اپنے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بٹھایا۔ جہانی میکانیکی انداز میں بیٹھ گیا مگر وہ مسلسل اس آدمی کو دیکھ رہا تھا جس کو صابو نے وحشی کہہ کر پکارا تھا۔ فارس کی آنکھوں میں جہانی نے بے بسی دیکھ لی تھی اور وہ جہانی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد فارس واپس لوٹا تو اسے وہاں جہانی پہلے کے مقابلے میں کافی مطمئن دکھائی دیا۔ فارس نے پیسے دیے اور جہانی کے ساتھ وہاں سے باہر نکل آیا۔
جہانی نے گاڑی میں بیٹھ کر ایک طویل پرسکون سانس لی اور فارس کو دیکھتے ہوئے بولا۔
''مجھے تمہارے ان چکروں میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میری عقل کو پتا نہیں کیا ہو گیا تھا جو میں تمہارے ساتھ یہاں ان غنڈوں کے ٹھکانے پر چلا آیا۔''
''اتنا ناراض کیوں ہو رہے ہو یار مجھے کیا پتا تھا کہ وہ چیک ریسیو نہیں کرے گا۔'' فارس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ''جو کچھ ہوا وہ سب اتفاق تھا میں نے کچھ بھی جان بوجھ کے نہیں کیا۔ تمہیں کچھ کہا ان لوگوں نے؟'' فارس نے جہانی کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں جہانی چپ رہا۔
''بتاؤ نا کیا کہا ان لوگوں نے ضرور تم سے کچھ پوچھ رہے ہوں گے'' فارس نے پھر اصرار کیا۔ اور جہانی کو یاد آیا کہ اس ایک گھنٹے میں ان لوگوں نے اس کی ہر طرح سے خاطر مدارات کیں۔ بس وہ وحشی اسے مسلسل گھورتا رہا۔ لیکن اس کی خون آلود آنکھوں میں اس کے لیے نفرت نہیں کوئی اور ہی جذبہ تھا۔ جسے جہانی سمجھ نہیں سکا۔ البتہ اس کے باقی ساتھی اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اور کہتے رہے کہ وحشی نے کبھی زندگی میں اتنا حسین لڑکا نہیں دیکھا اس لیے ٹکٹکی باندھ کر بس دیکھے ہی جا رہا ہے۔ تاہم اس نے پھر جہانی کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ کوئی اور بات کہی۔
''نہیں کچھ نہیں پوچھا۔ بس اتنا کہ میں تمہارا کون ہوں؟'' جہانی نے خیالات کے بھنور سے نکل کر جواب دیا۔
''تو تم نے کیا کہا؟''
''میں نے کیا کہنا تھا وہی کہا جو ہم ہیں یعنی دوست''
جہانی کا لہجہ اب بھی اکھڑا ہوا تھا اسے اس بات پر غصہ تھا کہ فارس اسے ان کے پاس گروی رکھ کر کیوں چلا گیا تھا۔ اسے نہیں جانا چاہیے تھا۔
''تم شاید میرے تمہیں یہاں چھوڑ کے جانے پر ناراض ہو؟'' فارس نے پوچھا۔
''ہاں اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہارے ان الٹے سیدھے کاموں میں کبھی ساتھ نہیں دوں گا۔''

”ایسے تو مت بولو یار۔۔۔ تمہیں پتا تو ہے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔تُو بول کیا کرتا میں۔ میں نے تو آفر کی تھی کہ میں رک جاتا ہوں اور تم پیسے لے کر آ جاؤ مگر وہ نہیں مانے تو اس میں میرا کیا قصور ہے تم خود ہی بتاؤ“ فارس کے رویے میں جہانی کو منانے اور مطمئن کرنے کی جو کوشش تھی وہ اس کے لہجے سے مترشح تھی۔

جہانی نے غور کیا تو اسے فارس کی بات غلط نہیں معلوم ہوئی۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ مجھے فارس کے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔گاڑی چلاتے ہوئے فارس مسلسل اس کے جواب اور ردعمل کا منتظر رہا۔وہ جہانی کا موڈ اچھا کرنا چاہتا تھا اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا کہ اب سب ٹھیک ہے اور جہانی اس سے ناراض نہیں ہے۔

”بس کر دے نا یار! اب ہم ہر کام میں تو ساتھ ہوتے ہیں ایک ذرا مختلف کام میں بھی ساتھ ہوئے تو کیا ہو گیا؟“ فارس نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”گاڑی سامنے دیکھ کر چلاؤ۔ میں ٹھیک ہوں اب۔“ جہانی نے بمشکل اپنے لہجے کو نرم اور روٹین کا بنانے کی کوشش کی۔

”تو اب تم مجھ سے ناراض نہیں ہو؟“ فارس کو جیسے اب بھی اطمینان نہیں ہوا تھا۔

”کہا ناہاں اب ٹھیک ہے“ جہانی نے بڑی مشکل سے مسکرانے کی کوشش کی۔

”ویسے میں بہت ڈر گیا تھا۔ پوری زندگی میں پہلی بار مجھے اتنا ڈر محسوس ہوا۔ سارا وقت بس یہی سوچتا رہا کہ پتا نہیں وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں شکر ہے یار کہ سب خیریت رہی۔“ فارس کا اطمینان اب واپس آنے لگا۔

”اچھا یہ بتاؤ انھوں نے تم سے شرجیل کے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا؟“

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ مجھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں بلاوجہ کی کھوج میں نہیں پڑتے۔“ جہانی کا اعتماد بھی واپس آ چکا تھا۔

”لیکن اب ذرا یہ سوچو اگر شرجیل مر گیا تو کیا ہوگا؟“

کتنی ہی دیر سے یہ بات کہیں اندر گم ہو گئی تھی اور جہانی کی ناراضگی میں وہ اس بات کو جیسے بھول گیا تھا اب جو جہانی

نے اسے یاد دلایا تو اس کے چہرے پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ کیا جواب دے۔ اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

"تم تو جانتے ہو میں نے ایسا نہیں کہا تھا اور نہ ہی میں اسے جان سے مارنا چاہتا تھا مگر ان لوگوں نے پتا نہیں کیا سمجھا۔"

"دعا کرو کہ وہ زندہ ہو"

جہانی نے ایسے کہا کہ اگر وہ زندہ نہیں ہوا تو سمجھو تمہاری خیر نہیں ہے۔ فارس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

ہوسپٹل کس طرح پہنچے یہ صنوبر کو سمجھ نہیں آیا۔ اسے لگا جیسے کوئی ان دیکھی طاقت تھی جو اسے ہوسپٹل تک لے کر آ گئی تھی۔ ورنہ اس کے تو اوسان خطا ہو چکے تھے۔ حماد نے شرجیل کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا اور ایمرجنسی میں پہنچایا تو پہلی بار اسے خیال آیا کہ حماد نے ٹھیک ہی کیا جو اس کے ساتھ چلا آیا۔ ورنہ یہ سب کون کرتا؟ وہ تو کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لمحے اسے اس لڑکے کی پوشیدہ قوتوں کا بھی احساس ہوا۔ حماد کو کیسے پتا تھا کہ شرجیل کو کسی نے وہاں زخمی کر کے پھینک دیا ہے۔ وہ کس طرح سیدھا اسی مقام پر پہنچا اور شرجیل کی جان بچانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ وہ سوچتی رہی اور ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ڈاکٹر ز شرجیل کو تو آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں یہ حماد کہاں چلا گیا۔ کہیں کوئی دوا وغیرہ لینے نہ گیا ہو۔ پریشانی میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کے پاس تو پیسے بھی نہیں ہوتے۔ وہ اسے پیسے ہی دے دیتی۔ نا ہی اسے یہ خیال آیا کہ شرجیل کے گھر والوں کو اس کے بارے میں اطلاع کر دیتی۔ اس نے ادھر حماد کو دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ شرجیل کے اور اپنے گھر والوں کو خبر کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کسی ڈاکٹر یا نرس کے آپریشن تھیٹر سے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ جو کوئی بھی اس سے شرجیل کی حالت کے بارے میں پوچھے تو وہ اسے تسلی بخش جواب دے سکے۔ کچھ دیر پریشانی سے وہ ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ دل ہی دل میں شرجیل کی زندگی کی دعائیں بھی مانگ رہی تھی۔ "آخر شرجیل کے ساتھ یہ سب کس نے کیا؟ اگر یہ ایکسیڈنٹ تھا تو شرجیل کی گاڑی کہاں چلی گئی۔ وہاں تو کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ جس کسی نے بھی شرجیل کے ساتھ یہ ظلم کیا تھا وہ یقیناً شرجیل کی گاڑی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر کوئی شرجیل کے ساتھ اتنا سب کیوں کرے گا۔ وہ سوچتی رہی۔

"فارس رحمن" پہلا خیال اسے فارس کا ہی آیا۔ ہو نہ ہو یہ اسی کا کام ہے ورنہ شرجیل اس ویرانے میں کیوں جانے لگا۔ ندا کے گھر کے راستے میں تو وہ سڑک آتی ہی نہیں تھی۔ کتنے ہی سوال تھے جو اس وقت جب وہ آپریشن ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی تو خود بخود اس کے دماغ میں گھسے چلے آ رہے تھے اور وہ خود ہی ان سوالوں کے جواب بھی سوچ رہی تھی۔

"کیا فارس اس حد تک بھی گر سکتا ہے؟ اس نے شرجیل کو جان سے مارنے کی کوشش کی!" اس کا دماغ سلگ اٹھا۔ اس کا تو مطلب تو یہ ہوا کہ فارس نے شرجیل کی نقل و حرکت پر نظر رکھی ہوئی تھی اور جب شرجیل گھر سے نکلا تو اس نے شرجیل کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔

انہی سوچوں کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی وہ اکیلی ہوسپٹل کے کوریڈور میں لگی ہوئی بنچ پر کبھی بیٹھ جاتی اور کبھی رونے لگتی۔ ہاتھوں کو مسل مسل کے دعائیں مانگنے لگتی۔ پھر اس نے شرجیل کے گھر والوں کو فون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس سے پہلے اس کے دل میں اس سوال نے سر اٹھایا کہ وہ کہے گی کیا۔ جو بھی ہوا سے بتانا تو ہوگا۔ اس نے ہمت کر کے شرجیل کی امی کو فون ملایا اور انہیں شرجیل کے ایکسیڈنٹ کا بتایا ساتھ ہی اس ہوسپٹل کا نام و پتا بھی بتایا جہاں وہ تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی ماں کو فون کیا اور انہیں جلدی سے ہوسپٹل آنے کو کہا۔ درشہوار کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آپریشن جاری تھا اور اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ شرجیل کی حالت کیسی ہے۔ کچھ دیر بعد ایک نرس آئی اور اس نے جلدی سے اس کے ہاتھ میں دوا کا ایک پرچا تھماتے ہوئے کہا کہ یہ لا دیں۔"

صنوبر نے اسی تیزی سے پرچا پکڑا اور بولی۔ "وہ پیشنٹ کیسا ہے اب؟"

"اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ان کی حالت کافی نازک ہے آپ جلدی سے یہ دوا لے کر آئیں پلیز۔" نرس کی بات سن کر صنوبر کے پیروں میں پہلے سے طاری لرزش میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ اندر سے ٹوٹنے لگی۔ اسے اپنی دنیا

تاریک ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مشکل سے اس نے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور دوا لینے فارمیسی تک پہنچی۔ دوا کا پرچا میڈیکل اسٹور والے کے ہاتھ میں تھما کر اس نے سہارے کے لیے ایک ستون کو تھام لیا ورنہ اسے ڈر تھا کہ وہ گر سکتی ہے۔ پتا نہیں حماد اس وقت کہاں ہے اس نے اتنی مدد کی تھی تو اب وہ اسے یوں تنہا چھوڑ کے کہاں جا سکتا ہے۔ دوا لے کر وہ واپس آئی اور نرس کے حوالے کر کے وہیں بینچ پر جیسے ڈھے سی گئی۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ شرجیل کے پیرنٹس کوریڈور میں داخل ہوئے۔

''کہاں ہے میرا بیٹا؟ کیسا ہے وہ؟'' ایک ہی سانس میں شرجیل کی ماں نے دو سوال کیے۔

''جی آپریشن چل رہا ہے'' صنوبر نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں'' یہ کہہ کر شرجیل کے والد آگے بڑھ گئے۔ اور شرجیل کی ماں وہیں بیٹھ کر لرزتے ہاتھوں سے دعا مانگنے لگیں۔

''کیسے ہوا یہ سب؟'' انھوں نے صنوبر سے پوچھا۔

''پتا نہیں آنٹی'' صنوبر نے مختصر جواب دیا۔

''کیا مطلب پتا نہیں بیٹا۔۔۔ کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں تھا؟'' وہ حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات میں بول رہی تھیں۔

''نہیں وہ میرے ساتھ نہیں تھا'' صنوبر کوئی تفصیلی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس کی حالت دھیرے دھیرے خراب ہوتی جا رہی تھی۔ شرجیل کی ماں کو اندازہ ہو گیا کہ صنوبر زیادہ بات کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔ مگر یہ پیچیدگی ان کے دماغ میں کلبلانے لگی کہ اگر شرجیل صنوبر کے ساتھ نہیں تھا تو وہ یہاں کیسے پہنچی۔ اسے اس ایکسیڈنٹ کے بارے میں کیسے پتا چلا۔ سوچوں کی الجھاوؤں میں انھوں نے صنوبر کو پانی لا کر دیا۔ اور صنوبر کو لگا کہ پتا نہیں وہ کب سے پیاسی تھی اسے پانی پینے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ جلدی جلدی ایک دو گھونٹ لے کر اس نے شرجیل کی ماں کو احسان مندی سے دیکھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا بیٹے کہ تمہیں شرجیل کے ایکسیڈنٹ کا کیسے پتا چلا۔ تم تو کہہ رہی ہو تم اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ کیا اس نے تمہیں فون کیا تھا؟'' صنوبر کو محسوس ہوا کہ ان سوالوں کے جواب اگر وہ دے بھی دے تو اس کی باتوں پر یقین کون کرے گا۔ یہ تو حماد کی ان دیکھی صلاحیتوں کا چمتکار ہے لیکن یہ حماد کا بچہ پتا نہیں کہاں غائب ہو چکا ہے۔ صنوبر خالی خالی آنکھوں سے شرجیل کی ماں کی طرف دیکھتی رہی کیوں کہ اس کے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے رہ رہ کر حماد پر طیش آ رہا تھا جو اس وقت اسے یوں اکیلا چھوڑ کر غائب ہو چکا تھا وہ تو کسی کو یہ یقین بھی نہیں دلا سکے گی کہ وہ شرجیل کو سڑک سے اٹھا کر اکیلی یہاں ہوسپٹل تک لائی ہے۔ اسی وقت درشہوار سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی اور صنوبر جیسے بے پناہ تکلیف سے اور ایک ایسی کیفیت میں جب مصیبت کی کسی گھڑی میں کوئی اپنا اچانک آ جائے تو اس کے ملنے سے جو کیفیت ہوتی ہے ایسے ہی والہانہ جذبے سے وہ اپنی ماں کے سینے سے لگی اور کچھ ہی لمحوں کے بعد ذہن میں بوس ہونے لگی تو درشہوار کی چیخ نکل گئی۔ شرجیل کی ماں نے جلدی سے سہارا دیا اور دونوں نے مل کر اسے ہسپتال کے فرش پر گرنے سے بچاتے ہوئے بنچ پر لٹا دیا۔ صنوبر کمزوری اور سرد پڑتے احساسات کی شدت سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

''آپ ذرا اس کا خیال کریں میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں'' درشہوار اندر کی طرف بھاگی اور کچھ ہی دیر بعد صنوبر کو ہسپتال کے ایک کمرے میں بیڈ پر لٹا کر ڈرپ چڑھائی جانے لگی۔

شرجیل کی امی کمرے میں داخل ہوئیں تو درشہوار اپنی بیٹی کے ماتھے پر پیار کر رہی تھیں۔

''مسز کریم اب آپ کی بیٹی کیسی ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔ شرجیل کی ماں کا نام رخسانہ سرفراز تھا۔

''جی اب کافی بہتر ہے'' درشہوار نے انھیں بیٹھنے کا کہا۔

''آپ کا بیٹا کیسا ہے آپریشن ختم ہو گیا؟'' درشہوار کو اپنی بیٹی کے یوں اچانک بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے رخسانہ ملک سے یہ پوچھنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔

''پتا نہیں۔۔۔ ابھی تو ڈاکٹر کچھ نہیں بتا رہے۔۔۔ شاید ابھی آپریشن ختم نہیں ہوا۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔ آپ کی

بیٹی کی خیریت پوچھنے آ گئی تھی۔ چلتی ہوں‘‘ اتنا کہہ کر وہ چلی گئی اخلاقاً درشہوار نے ان سے کہا کہ جیسے ہی کچھ پتا چلے انھیں بھی ضرور بتادیں۔۔۔۔

’’کیا کہا ڈاکٹرز نے؟‘‘ جیسے ہی سرفراز ملک دکھائی دیے تو شرجیل کی ماں نے ان سے پوچھا۔

’’آپریشن تو ختم ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ ابھی کچھ بھی کہنا مشکل ہے اگر شرجیل کو۔۔۔۔ چوبیس گھنٹوں میں ہوش آ گیا تو کچھ یقین سے کہا جا سکتا ہے۔ بس دعا کرو وہ جلدی سے ہوش میں آ جائے۔‘‘ سرفراز ملک نے بیوی کو جو کچھ انھیں معلوم تھا اس میں سے یہ ایک بات نہیں بتائی کہ ڈاکٹرز نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان کی حالت کافی سیریس ہے اس لیے چانسز بہت کم ہیں۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہونے والی پریشانی کو بھی وہ بیوی پر ظاہر ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

’’میں ابھی آتی ہوں‘‘ شرجیل کی ماں نے کہا۔

’’تم کہاں جا رہی ہو رخسانہ؟‘‘ سرفراز ملک کو بھی جیسے اکیلے ہونے سے ڈر لگنے لگا۔

’’نماز پڑھنے۔۔۔۔ بیٹے کی زندگی کی دعا مانگنے‘‘ انھوں نے ایسے کہا کہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

’’میں بھی چلتا ہوں‘‘ اور یوں وہ بیوی کے ساتھ نماز پڑھنے اور شرجیل کے لیے دعا مانگنے چلے گئے۔

ساتھ ہی کمرے میں لیٹی ہوئی صنوبر کو ہوش آ گیا۔ اور اس نے ماں کو اپنے قریب دیکھ کر کچھ اطمینان محسوس کیا۔

’’اب کیسی ہو؟‘‘ درشہوار نے محبت سے پوچھا۔

’’کافی بہتر ہوں۔ شرجیل کیسا ہے؟‘‘

’’اس کی ماں آئی تھی تمہیں دیکھنے۔ تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ بتا رہی تھیں کہ ابھی شرجیل کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں پتا چل رہا شاید آپریشن چل رہا ہے ابھی۔‘‘ درشہوار نے چائے نکالی اور صنوبر سے پوچھا کہ وہ چائے پیے گی۔ صنوبر نے منع کر دیا۔

’’کیا آپ کو حماد کہیں نظر آیا؟‘‘ صنوبر کو لگا کہ اب اگر وہ شرجیل کے بارے میں اپ ڈیٹ لینے کی کوشش میں جانا چاہے تو اس کی ماں اسے کسی قیمت پر جانے نہیں دے گی۔ اس لیے اس نے حماد کے بارے میں پوچھا وہ ہی اسے ساری معلومات لا کر دے سکتا تھا۔

’’نہیں کیوں؟ وہ تو آج پھر شام سے ہی غائب ہے اور اس وقت رات کے بارہ سے بھی زیادہ بج چکے ہیں پتا نہیں یہ لڑکا کن چکروں میں رہتا ہے۔ میں اب اسے نہیں رکھوں گی نکال دوں گی۔‘‘ درشہوار کو دھیرے دھیرے غصہ آنے لگا۔

’’وہ میرے ساتھ تھا اسی نے مدد کی میری شرجیل کو یہاں تک لانے میں۔‘‘

’’کیا!! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟‘‘ درشہوار کو جیسے شاک لگا۔

’’ٹھیک کہہ رہی ہوں وہ نہ ہوتا تو شرجیل۔۔۔۔‘‘ اس سے زیادہ صنوبر کچھ اور نہیں کہہ سکی۔

’’تو تم کہاں لے گئی تھیں اسے اپنے ساتھ؟‘‘ درشہوار کا دماغ گھومنے لگا۔ وہ بھی شرجیل کی ماں کی طرح اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ صنوبر شرجیل کے ساتھ تھی۔

’’میں اپنی دوست ندا کے گھر گئی تھی شرجیل بھی وہاں آنے والا تھا مجھ سے ملنے مگر وہ نہیں آیا۔ رات کو دس بجے تک جب وہ نہیں آیا تو ہم وہاں سے چل دیے اور راستے میں ہمیں شرجیل زخمی حالت میں ملا۔‘‘

’’حماد تمہارے ساتھ تھا اور میں پتا نہیں کیا سوچتی رہی۔‘‘ درشہوار کا غصہ فوراً ہی کافور ہو گیا۔

’’تو اس وقت وہ کہاں ہے مجھے تو کہیں نظر نہیں آیا؟‘‘ درشہوار نے بات پوری کی۔

’’یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں کہ وہ مجھے ہوسپٹل میں چھوڑ کے پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ شروع میں تو یہیں تھا۔‘‘ صنوبر نے جواب دیا۔

صنوبر نے شکر ادا کیا دل ہی دل میں کہ اس کی ماں نے یہ نہیں پوچھا کہ حماد کو ندا کے گھر لے جانے کی کیا ضرورت

تھی۔ اس سوال کا خود اس کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔ آج سب کچھ بہت عجیب عجیب ہو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد صنوبر کو شرجیل کے بارے میں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے اگر شرجیل کو چوبیس گھنٹے میں ہوش نہیں آیا تو........" اس کے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی ڈیرا ڈال چکی تھی۔ آنسو پتا نہیں کیسے خود بخود خشک ہو چکے تھے۔ اس وقت کوئی بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا کہ شرجیل کے ساتھ یہ حادثہ کیسے ہوا۔ کون تھا جو اسے اس طرح زخمی کر کے اس کی گاڑی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ دوسروں کے مقابلے میں صنوبر تو مزید یہ بھی جانتی تھی کہ یہ ایکسیڈنٹ نہیں تھا بلکہ شرجیل کو مارنے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ اس کا زخمی جسم جھاڑیوں میں چھپا دینا اور اس کی گاڑی بھی ساتھ لے جانا اسی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ جو کوئی بھی تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ شرجیل کو کوئی مدد نہ ملے اور وہ وہیں پڑے پڑے جان سے چلا جائے۔ لیکن اس وقت صنوبر یہ بات کسی کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ اسے اس وقت صرف شرجیل کی زندگی کی پروا تھی۔ شرجیل بچ جائے تو وہ باقی باتوں کے بارے میں اس کے بعد فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس اضافی بات کا ایک گواہ البتہ حماد تھا اور اس کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ بھی جب صنوبر کو حماد کا خیال آتا تو وہ سوچنے لگتی کہ اس بہت ہی عجیب لڑکے کو پتا نہیں کیا کیا معلوم ہے۔ وہ ایسی قرآنی آیات کے بارے میں بھی جانتا ہے جن کے اثر سے بہت سے کام لیے جا سکتے ہیں۔ اسے کسی واقعے کے بارے میں بھی شاید پہلے سے یا واقعہ رونما ہونے کے بعد پتا چل جاتا ہے۔ ایکا ایکی صنوبر کو خیال آیا کہ حماد اس کے ساتھ ندا کے ہاں اصرار کر کے گیا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہو سکتا ہے آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑ جائے...... تو کیا وہ پہلے سے جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے!!!

یہ خیال آتے ہی وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور زور زور سے سانس لینے لگی۔

☆☆☆

شرجیل کے آپریشن کے پورے وقت میں حماد جو دراصل سلمان تھا آپریشن تھیٹر میں موجود رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شرجیل کی جان کتنی خطرے میں ہے۔ وہ اسے بچانا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھا البتہ وہ پل پل بدلتے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جس وقت صنوبر نے شرجیل کے بارے میں سوچ کر ہمک ہمک کر رونا شروع کیا تو وہ چند لمحوں کے لیے صنوبر کو دیکھنے آیا تھا۔ درشہوار کو وہاں دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا کہ صنوبر اکیلی نہیں ہے۔ وہ دوبارہ آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔ آپریشن طویل تھا اور کافی دیر میں ختم ہوا۔ ڈاکٹروں نے جو کچھ آپس میں کہا وہ سب سلمان نے سن لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ شرجیل کو کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔۔۔ اس لیے وہ اس معجزے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اس وقت بھی شرجیل کے پاس موجود تھا۔ کچھ دیر بعد ایک وارڈ بوائے اور ایک نرس شرجیل کی کنڈیشن دیکھنے آ رہے تھے۔ اور پھر آخر میں ڈاکٹر آیا۔۔۔ اس نے مشینوں کی طرف دیکھ کر شرجیل کا معائنہ کیا۔ اس کے چہرے پر پھیلتی مایوسی کو سلمان نے دیکھ لیا اور اسے پتا چل گیا کہ شرجیل ایک آخری ہچکی لے کر اس جہان فانی سے کوچ کر چکا ہے۔۔۔ ڈاکٹر نے اس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانک دیا اور افسردگی سے باہر نکل گیا شرجیل کے ماں باپ کو یہ دلدوز خبر دینے کہ شرجیل اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ابھی ڈاکٹر منہ کھولنے ہی والا تھا سرفراز ملک اور شرجیل کی ماں کے ستے ہوئے چہروں پر وہ مزید دکھوں کی بارش کرنے والا تھا کہ ایک نرس بھاگتی ہوئی آئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر صاحب پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے!"

"کیا.........!" ڈاکٹر جلدی سے آئی سی یو کی طرف چل دیا۔ شرجیل کو واقعی ہوش آ چکا تھا۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جو زندہ ہے وہ شرجیل نہیں سلمان ہے۔ شرجیل مر چکا تھا۔ سلمان اس کے مردہ جسم میں حلول کر گیا تھا!!!

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے
سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ مئی میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپرد ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپرد ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

میرے بچوں اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میں اپنے ان بچوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جو نہایت پابندی سے ضرورت مند خاندانوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ کسی ایک انسان کا بھی بھلا ہو جائے تو اس سے بڑی کوئی نیکی نہیں۔ میرے پاس تم لوگوں کے لیے صرف دعائیں ہیں اور یقیناً اللہ کے پاس بہترین اجر۔ میں شاہدہ آسٹریلیا کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جس نے میرے کہنے پر ضرورت مند خاندانوں کے لیے چھت کا بندوبست کیا۔ بیٹی اللہ تمہیں دین اور دنیا کے خزانے عطا فرمائے۔ آنے والا مہینہ رجب کا ہے۔ میں تمام پڑھنے والوں کو نصیحت کروں گا کہ اس ماہ میں خوب صدقہ خیرات کریں۔ روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ اور چڑیوں کو دانا پانی ضرور ڈالیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اس کے بندوں کے کام آتے ہیں۔

☐ ثمینہ قریشی۔ مقام نامعلوم

o: محترم بابا جی! السلام علیکم! میں "سچی کہانیاں" بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور آپ کا کالم مسئلہ یہ ہے بھی بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ خط لکھنے کی جرأت پہلی بار کر رہی ہوں۔ آپ سب کے مسئلے بڑی خوش اسلوبی سے حل کرتے ہیں۔ مجھے بھی ایک مسئلہ درپیش ہے۔ میری عمر 23 سال ہے۔ رشتے بہت آتے ہیں۔ لیکن کہیں پر بھی بات نہیں بنتی۔ آپ جو تعویذ رشتوں کے لیے دیتے ہیں۔ میں بھی وہ تعویذ لینا چاہتی ہوں۔ اچھے اور شریف گھر میں میرا رشتہ طے پا جائے۔ تعویذ کس طرح لیا جائے گا۔ طریقہ بتا دیں میں بہت زیادہ پریشان ہوں مجھے جلد از جلد جواب دے۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کو صحت اور سکون عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے رہے۔

o: بیٹی ثمینہ! تعویذ لینے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو۔

☐ نظر علی برہانی۔ کراچی

o: محترم بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوش رکھے۔ آپ کو اور زیادہ توفیق عطا فرمائے تاکہ آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ آمین۔ بابا جی ہم ماشاء اللہ چھ بھائی ہیں۔ سب سے بڑے تین بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ میرا تیسرا نمبر ہے اس لیے میری بھی ہو چکی ہے۔ چوتھے نمبر والا جو بھائی ہے میرے بعد والا اس کی ابھی نہیں ہوئی لیکن اس سے چھوٹا جو پانچویں نمبر پر ہے اس کی شادی کو اللہ کے فضل و کرم سے ایک سال ہو چکا ہے۔ بابا جی اس کی بیوی کے ساتھ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے کہ کبھی کھڑے کھڑے اور کبھی بیٹھے بیٹھے اس کو چکر آ جاتے ہیں اور وہ گر جاتی ہے اور اس کے سر میں بہت چوٹ لگتی ہے اور کہیں نہیں صرف سر میں چوٹ آتی ہے اور اتنی زیادہ چوٹ آتی ہے کہ بہت خون نکلتا ہے۔ بابا جی شادی سے پہلے بھی اس کو ایک دو بار چکر آ چکے تھے۔ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا بیماری ہے اور یہ چکر کیوں آتے ہیں۔ بہت سے پیروں، فقیروں کو دکھایا ہے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا ہے۔ بابا جی اگر کوئی زمین پر بیٹھے بیٹھے گر جائے تو اس کو زیادہ چوٹ تو نہیں آتی لیکن یہ بیٹھے بیٹھے گر جاتی ہے پھر بھی اس کو سر میں بہت چوٹ

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرما لیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

لگتی ہے اور بے تحاشہ خون نکلتا ہے۔ بابا جی ہم سب بہت پریشان ہیں کہ آخر یہ مسئلہ کیا ہے اور ہم اس کا علاج کہاں سے کرائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بابا جی برائے مہربانی آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور پلیز ہمیں بتائیں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے اور اس کا کوئی حل بھی بتائیں۔

○: بیٹے نظر! جو صورتحال تم نے تحریر کی ہے وہ مجھے سمجھ آ رہی ہے مگر مکمل وضاحت سے میں تعویذ دینے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔ تعویذ دینے کے بعد بچی کو حصار میں لے لوں گا۔ تم سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے تعویذ منگوانے کا طریقہ معلوم کر لو۔ انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

□ س۔م۔ا۔ حیدر آباد

○: محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی امید کرتی ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی آپ نے مجھے تعویذ دیا تھا دو مہینے پہلے اور سورۃ فاتحہ کا ورد بھی کہا تھا۔ بابا جی میرے شوہر کے رویے میں تھوڑا بہت فرق آیا ہے۔ بابا جی جس کے لیے اللہ کا بہت شکر ہے اور بابا جی میں نے آپ کو اولاد نرینہ کے لیے بھی کہا تھا تو بابا جی آپ نے کہا تھا خاموشی اختیار کرو سب اچھا ہوگا۔ بابا جی میں اپنی ساس سسر کی بہت خدمت کرتی ہوں۔ بابا جی اب جو ایک مسئلہ ہو گیا ہے وہ میری بڑی نند کو طلاق ہو گئی ہے۔ بابا جی وہ ہمارے گھر آ گئی ہے۔ بابا جی شروع سے ہی ان کی مجھ سے نہیں بنی۔ بابا جی اب میرے شوہر کا رویہ پھر مجھ سے خراب ہو رہا ہے۔ بابا جی میں سارا دن کچن کا کام کروں۔ بابا جی میری نند کا بیٹا جو کہ 5 سال کا ہے بہت گالیاں دیتا ہے۔ بابا جی گھر کے اس ماحول کی وجہ سے میری بیٹی جو کہ 4 سال کی ہے اس پہ بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ بابا جی میں بہت پریشان ہوں۔ بابا جی سارا دن بچے آپس میں کھیلتے رہتے ہیں بابا جی مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ بابا جی ہے تو وہ پھر بھی لڑکا۔ مجھے کیا پتا کون سے کھیل کھیل رہے ہیں۔ بابا جی یہ سوچ کے دن رات مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ بابا جی میری مدد کریں اللہ کوئی اسباب نکالے۔ آپ کو اپنا مسئلہ بتا رہی ہوں مجھے سچی کہانیاں میں جواب دیجیے گا۔ بابا جی میرے لیے اولاد نرینہ کے لیے بھی دعا کریں۔ بابا جی گھر کا ماحول بہت خراب ہے امید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

○: بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ مثبت تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ ورد جاری رکھو۔ معاملات میں خاموشی رکھنے میں ہی کامیابی ہے۔ اس وقت تمہاری نند اور اس کے والدین شدید مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ طلاق بہت دکھ دینے والا فعل ہے۔ بہرحال تم سب کا خوش اسلوبی سے خیال رکھو۔ اپنی نند کا خاص طور سے بہت خیال رکھنا۔ 5 سال کا بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے تم بلاوجہ کی فکر میں مت آؤ۔ اولاد نرینہ کے لئے تعویذ منگوالینا خبر ہو تو۔

□ افضالہ ناز۔ منڈی واربرٹن

السلام علیکم بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش اور سلامت رکھے۔ بابا جی میرا مسئلہ بڑا شدید ہے۔ میں جس لڑکے کو پسند کرتی ہوں وہ مجھ سے کسی بات سے ناراض ہو گیا ہے اور ناراض ہونے کی وجہ بھی نہیں بتاتا۔ پلیز بابا جی! میری مدد کریں میں اُس سے شادی کرنا چاہتی ہوں پر وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرتا۔ مجھے کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیں جس سے اُس کی ناراضگی بھی دور ہو جائے اور اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر رشتے کے لیے بھی بھیج دیں۔ اور ہماری جلد شادی ہو جائے۔ پلیز بابا جی میرا مسئلہ حل کر دیں میں زندگی بھر آپ کو دعائیں دوں گی اور مارچ شمارے میں جواب دے دیں گے تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔

○: بیٹی افضالہ! ناراضگی تو دور ہو جائے گی مگر شادی میں مسئلہ ہے تم مجھ سے تعویذ منگوا لو تا کہ رکاوٹیں دور ہوں۔ تفصیل سچی کہانیاں کے دفتر سے حاصل کر سکتی ہو۔

□ شاہانہ۔ جہلم

○: پیارے بابا جی! السلام علیکم! میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکی ہوں۔ مسئلہ وہی شادی کا ہے۔ آپ نے ایک وظیفہ ہم تینوں بہنوں کے لیے ارسال کیا تھا جس کو پڑھ کر میری ایک بہن اللہ تعالیٰ کے کرم سے اپنے گھر کی ہو گئی۔ اسی وظیفے کو پھر میں نے پڑھا۔ اسی دوران ایک رشتہ آیا لیکن ذات پات کے چکر کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ شادی کے وقت قرضہ چڑھ جاتا ہے۔ اس کو

اتارنے میں دو سال لگ جاتے ہیں۔ اس دوران کوئی شادی کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتا ہے۔ اگر رشتہ اچھا اور قابل قبول ہو تو منگنی وغیرہ تو ہو جائے۔ لوگوں کے اتنے اچھے رشتے طے ہو جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور حیرت کی کیا بات ہے، دینے والا اللہ ہے۔ خیر! اب آپ مجھے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ابھی میری ایک اور بڑی بہن ہے اور میں ہوں۔ ہماری عمریں بھی زیادہ ہو رہی ہیں۔ آپ برائے مہربانی ہمارے لیے دعا کیجیے۔ ہم لوگ آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔

☆: بیٹی شاہانہ! اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر اور عشاء کے بعد ۴۱۔ ۴۱ بار الحمد اللہ شریف پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور حاجت بیان کرو۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! اپنی بہن سے کہو کہ نماز فجر کے بعد یارحمن یا رحیم کی ۷ تسبیحات پڑھ کر حاجت بیان کرے۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ اور ہو سکے تو فوراً مجھ سے تعویذ منگوالو۔ کرم ہوگا۔

☐ نگہت۔ چارسدہ

○: باباجی! السلام علیکم! میں بہت لمبا چوڑا خط لکھنا نہیں چاہتی اس لیے مختصر انداز میں لکھ رہی ہوں۔ جو کچھ میں لکھوں گی، اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر لکھوں گی۔ اس سے زیادہ سچائی کا ثبوت میرے پاس نہیں ہے۔ بابا! مجھے ایک ایسا دکھ ملا جو کہ بظاہر کچھ نہیں مگر اس دکھ کی وجہ سے میں اذیت کا شکار رہی۔ میں بہت حساس ہوں۔ میں وہ دکھ کس طرح بیان کروں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میرے اپنے ہی میرے لیے اذیت کا سامان کرتے گئے۔ میرے وہ اپنے جن کو میں نے ٹوٹ کر چاہا، وہ رشتہ جو کہ ایک مقدس رشتہ تھا۔ بس یوں سمجھیں کہ اس کو شدت سے چاہا تھا۔ کبھی بچپن میں لیکن اب اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ نہ صرف میں نے اپنے اس مقدس رشتے کے ہاتھوں تکلیف سہی بلکہ مجھے اس گناہ کا احساس ہوا۔ بابا جی! اب میری دنیا میں ویرانی ہی ویرانی ہے اور میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ انسانیت کی خدمت میں گزارنا چاہتی ہوں اور دوسروں کے دکھ درد کو شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن ایک لڑکی اس معاشرے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میری آپ سے التجا ہے کہ میرے لیے دعا کریں۔ بابا! میرا یہ خط شائع کیجیے گا۔ مجھے ایک ایسے انسان کے سہارے کی ضرورت ہے جو حساس ہو اور اس میں انسانیت ہو اور جو میرے ساتھ مل کر میرے اس کام میں شریک ہو سکے جو کہ میں کرنا چاہتی ہوں۔ اگر میری زندگی کا کچھ حصہ کسی اچھے کام میں گزر جائے تو میں سمجھوں گی کہ میرا دکھ کچھ نہیں ہے۔ شاید میں ان معصوم لوگوں کو خوشیاں دے سکوں جو ''خوشی'' کے لفظ سے واقف نہیں ہیں۔

☆: بیٹی نگہت! تمہارا خط پڑھا۔ تم نے حالات کچھ مبہم سے تحریر کیے ہیں۔ لہٰذا اندازے کی بنیاد پر جواب دے رہا ہوں۔ بیٹی! کبھی کبھی انسان کو زندگی میں بہت دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ اللہ پر بھروسا رکھو اور اس سے مدد مانگتی رہو۔ دنیا میں جہاں برے لوگ ہیں، وہاں اللہ کے نیک بندے بھی ہیں مگر انسان کی نیت اچھی ہو تو وہ سب کچھ پالیتا ہے۔ جس کی خواہش رکھتا ہے۔ تم نماز فجر کے بعد ایک مرتبہ سورۃ الطارق پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلیا کرو۔ وظیفہ دو ماہ تک کرو۔

☐ غوثیہ۔ میرپور خاص

○: محترم باباجان! السلام علیکم! آپ نے میرا خط شائع کیا۔ بہت مہربانی آپ کی۔ ایک بات اور پوچھنی ہے کہ وظیفے کی زکواۃ کیسے نکالی جاتی ہے اور وظیفے کا کفارہ کیسے ادا کیا جاتا ہے؟ کیوں کہ کچھ عرصے پہلے میں نے آپ سے اجازت لیے بغیر ایک وظیفہ شروع کیا تھا جو آدھا کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ اس کا کفارہ کیسے ادا کروں؟ وظیفہ مکمل ہونے کے بعد زکواۃ کیسے نکالی جاتی ہے؟ میں موسیقی سے کس طرح پرہیز کروں کیوں کہ ہمارے گھر تو صبح شام گانے سنے جاتے ہیں۔ میں کسی کو منع تو نہیں کر سکتی۔ وہ وظیفہ جو آپ نے بتایا تھا میں نے شروع کر دیا ہے۔ مکمل ہونے کے بعد آپ کو اطلاع دوں یا نہیں؟

☆: بیٹی غوثیہ! زکواۃ حسب استطاعت رقم ہوتی ہے جو وظیفہ مکمل کرنے کے بعد کسی بھی جائز ضرورت مند کو دے دینی چاہیے۔ کفارہ بھی ایسے ہی نکال دینا

چاہیے۔ کوشش کیا کرو کہ وظیفہ نامکمل نہ چھوڑو۔ اس طرح حاجت بھی نامکمل رہ جاتی ہے۔ وظیفہ مکمل کرنے کے بعد مجھے نتائج سے ضرور آگاہ کیا کرو۔ اللہ تمہارا حامی وناصر ہو۔ (آمین)

□ امیر خان۔ واشنگٹن

○: جناب بابا جی! السلام علیکم! تقریباً دو ماہ پہلے میں نے اپنی مشکلات کے سلسلے میں آپ سے براہِ راست رابطہ کیا تھا۔ آپ نے تعویذ ارسال فرمایا تھا۔ ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ میرے تینوں مسائل بخیر وخوبی حل ہوگئے۔ مجھے پہلے سے بھی اچھی ملازمت مل گئی ہے اور گھریلو مشکلیں بھی ختم ہوگئی ہیں۔ میں آپ کا بہت بہت مشکور ہوں۔ بابا جی! آپ جس طرح مشکلات میں پھنسے ہوئے لوگوں کے کام آتے ہیں، خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆: بیٹے امیر خان! مشکلوں سے نجات دلانے اور مسائل حل کرنے والی ذات تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے اس لیے میرا شکریہ نہیں بلکہ اس رحیم وکریم کا شکر ادا کرو۔ اور اس کے نام پر خیرات بھی کرتے رہو۔ نماز کی پابندی کبھی نہ بھولنا۔

□ ثمر۔ مرید کے

○: محترم جناب بابا جی! السلام علیکم! آپ مجھے پہچان گئے ہوں گے۔ کیوں کہ میں آپ سے پہلے بھی رابطے میں رہ چکی ہوں اور آپ کے بتائے ہوئے وظیفے سے مستفید ہو چکی ہوں۔ دُکھی انسانیت کی جو خدمت آپ کررہے ہیں، خدا آپ کو اس کا اجر عطا کرے۔ (آمین) میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں رات کو سوتے وقت دانت بہت زیادہ چباتی ہوں۔ یعنی دانت پیستی ہوں۔ میں پچھلے کئی سال سے اس طرح کررہی ہوں جس کی وجہ سے میرے دانتوں میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میرا یہ مسئلہ حل ہوجائے۔

☆: بیٹی ثمر! خوش رہو! (آمین) نماز کی پابندی کے ساتھ کثرت سے یا مقیم کا ورد کرتی رہو۔ دانتوں پر رات کو سوتے وقت سرسوں کا تیل اور نمک اچھی طرح لگالیا کرو اور بغیر کلی کیے سوجاؤ۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ دو ماہ کرو پھر مجھے مطلع کرو۔

□ امینہ۔ کراچی

☆: بیٹی امینہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ (آمین)۔ نماز کی پابندی رکھو۔ وظیفہ تحریر کررہا ہوں۔ ۱۴ دن کرنے کے بعد مجھے مطلع کرو۔ نمازِ عصر اور مغرب کے بعد ۷۔ ۷ بار سورۃ فلق، سورۃ الناس اور آیت الکرسی پڑھ کر دم کرو اور گھر کے تمام افراد ایک ایک گھونٹ یہ پانی پی لیں۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک مرتبہ سورۃ جن پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ یہ عمل ۱۴ دن تک نہایت پابندی کے ساتھ کرو۔ جمعرات کے دن کچھ رقم ضرور خیرات کردیا کرو۔ کرم ہوگا۔

□ انیلا۔ بستی ملوک

☆: بیٹی انیلا! تمہاری ہدایت پر مسئلہ شائع نہیں کیا جارہا۔ تمہارا خط پڑھا۔ بے انتہا دکھ ہوا۔ اللہ تمہاری والدہ کو راہِ راست پر لائے۔ (آمین) بیٹی! تم معاملات اللہ کے سپرد کردو۔ ٹی بی قابلِ علاج مرض ہے۔ تم اپنے والد کا علاج کراؤ۔ وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔ بیٹی! تم نماز کے ساتھ ساتھ، قرآن بھی پڑھتی ہو۔ بہت اچھی بات ہے۔ روزانہ رات کو اور صبح میں آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گرد حصار کرلیا کرو۔ نمازِ عصر کے بعد ۷، ۷ بار سورۃ توبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور حاجات بیان کرو۔ اللہ ضرور کرم کرے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ بشیر احمد۔ ساہیوال

○: بزرگوار بابا جی! السلام علیکم! میں نے اپنے بیٹے کے علاج کے لیے آپ کو خط لکھا تھا اور آپ سے کسی دوا کی درخواست کی تھی۔ اس کے جسم پر داد نہ ڈاکٹری علاج سے ختم ہوئی تھی نہ ہومیوپیتھی اور دیسی علاج سے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے جو مرہم بھیجا تھا، اس سے داد بالکل ختم ہوگئی ہے۔ خدا آپ کو عمر دراز عطا کرے تاکہ آپ اسی طرح مایوس ضرورت مند لوگوں کے کام آتے رہیں۔ (آمین)

☆: بیٹے بشیر! شفا دینے والا تو رب العزت ہے۔ اسی کا شکر ادا کرتے رہو جس کا سب سے بہترین طریقہ پنج وقتہ نماز کی ادائیگی ہے۔ اپنے بیٹے کا صدقہ

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کے نام کی خیرات ضرور دیتے رہنا مگر مستحق لوگوں کو۔

☐ روشن۔ جلال پور پیر والا

○: السلام علیکم! محترم بابا جی! میرا مسئلہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ہے۔ میری عمر بڑھتی جارہی ہے مگر ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا جس کی وجہ سے میں اور میرے گھر والے بہت پریشان ہیں۔ میں تقریباً مایوس ہو چکی ہوں۔ آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں اور وظیفہ بتادیں جس سے میرا رشتہ بھی آئے اور بات بھی طے ہوجائے۔

☆: بیٹی روشن! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ (آمین) مایوسی کا مطلب ہے، نا امیدی اور جو لوگ اللہ پر بھروسا رکھتے رہیں، وہ کبھی نا امید نہیں ہوتے ہیں۔ تم فوری طور پر تعویذ منگوالو۔ تفصیلات آفس فون کرکے معلوم کرلو اور ہاں بیٹی تمہیں ایک نہایت سہل وظیفہ بھی دے رہا ہوں۔ ہر نماز کے بعد 100 مرتبہ یا حبیب کا ورد کرو اور حاجت بیان کرو۔ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ 14 دن تک کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ خیال رہے، اس دوران نماز بالکل قضا نہ ہو۔ تعویذ کا اسی لیے کہتا ہوں چونکہ مجھے پتا ہے کہ اکثر وظیفہ پابندی سے نہیں ہوتا اور ناغہ آجاتا ہے۔

☐ حمیدہ۔ صادق آباد

○: بابا جی السلام علیکم! آپ دکھی انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ میرے بھی کچھ مسائل ہیں۔ بابا جی! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بہت تیزی سے گرتے ہیں۔ بالوں میں خشکی بھی ہے۔ بال اتنے اترتے ہیں کہ گھر والے بھی پریشان ہیں۔ بالوں میں زیادہ تیل بھی نہیں لگا سکتی۔ زیادہ تیل لگانے سے بال اور زیادہ اترنے لگے۔ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرے بال گرنا بند ہوجائیں۔ ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر اتنی کشش نہیں ہے۔ میں چہرہ پر کشش کرنے کے لیے کیا کروں پلیز بتائیں! میں بہت پریشان ہوں۔

☆: بیٹی حمیدہ! بالوں کے لیے مجھ سے تیل منگوالو۔ تیل بالوں کی جڑوں میں لگاؤ۔ آملہ اور ریٹھا پیس کر گیلے بالوں میں لگاؤ اور آدھے گھنٹے کے بعد سر دھولو۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔ چہرے کے لیے دوا تیار ہے۔ آفس فون کرکے تفصیلات لے لو۔

☐ عروبہ۔ لاڑکانہ

○: بابا جی! السلام علیکم! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ امید ہے آپ میرا مسئلہ بھی حل کردیں گے۔ بابا جی! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر جنھوں نے دو حج کیے ہوئے ہیں، عمرے بھی کیے ہیں مگر وہ نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے شوہر نماز پڑھنا شروع کردیں۔ میری دو بیٹیاں قرآن پاک حفظ کررہی ہیں۔ میرا بیٹا بھی ماشاء اللہ نمازی ہے اور میں خود بھی نماز پڑھتی ہوں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے دونوں چھوٹے بچے بیٹا اور بیٹی بہت تنگ کرتے ہیں۔ بیٹا سات سال کا ہے۔ وہ ذہن کا تیز ہے مگر پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا۔ بہت ضدی ہے اور بہت بدتمیز بھی ہے۔ کسی کا کہنا بھی نہیں مانتا اور بیٹی جو گیارہ سال کی ہے، ماشاء اللہ حفظ کررہی ہے۔ وہ بھی بہت ضدی اور بدتمیز ہے۔ کسی کا کہنا نہیں مانتی۔ انھیں نماز بھی میں ڈانٹ کر پڑھواتی ہوں۔ بابا جی! کوئی اپنا تعویذ بھی دے دیں جس کی برکت سے میرے شوہر نماز پڑھنا شروع کردیں اور بچے نیک سیرت ہوجائیں۔

☆: بیٹی عروبہ! خوش رہو! نماز کی تلقین کرنا تمہارا فرض ہے۔ وہ کرتی رہو۔ بچوں پر چاروں قل پڑھ کر دم کرتی رہا کرو۔ گھر کا ماحول خوش گوار رکھو۔ نماز نہ پڑھنے پر کسی کو بھی برا بھلا مت کہو۔ تم خود پابندی سے نماز پڑھو۔ بچے جب والدین کو عبادت کرتا دیکھتے ہیں تو خود بھی عمل کرتے ہیں۔ زبردستی سے بعض اوقات مقصد تو حاصل ہوجاتا ہے۔ مگر وہ مستقل نہیں ہوتا ہے اور مذہب میں تو بہت نرمی اور محبت سے چلنا چاہیے۔ بچوں کو خود وقت دو اور نماز عصر کے بعد سورۃ کافرون 21 بار پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ مدت 21 روز ہے۔ شوہر اور بچوں کے لیے مجھ سے تعویذ بھی منگوالو۔ اللہ کرم کرے گا۔

☐ رخشندہ۔ ڈسکہ

○: بابا جی! آداب و نیاز! میں نے جس کام کے لیے براہ راست آپ سے تعویذ منگوایا تھا، خدا کے

فضل وکرم سے وہ پورا ہوگیا ہے۔ آپ نے اطلاع دینے کو کہا تھا لہٰذا اطلاع بھی دے رہی ہوں اور شکریہ بھی ادا کررہی ہوں۔ خداوند کریم آپ کو اجر دے کہ آپ نے دو گھروں کو برباد ہونے سے بچالیا ہے۔

☆: بیٹی رخشندہ! بگڑے کام تو وہی رحیم وکریم اور قادر مطلق ہی بناتا ہے۔ میں تو اس کا ناچیز بندہ ہوں اس لیے میرا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اسی کا شکر ادا کرو اور نماز کی پابندی کرتی رہنا۔

□ شہناز۔ پنڈی

☆: بیٹی شہناز! اللہ تمہاری دعائیں قبول فرمائے۔ (آمین) زندگی بے شک بہت مشکل ہے اور بعض اوقات تو بہت تلخ حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر کامیابی صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو ہمت اور صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتے ہیں۔ تم بہنیں ہر نماز کے بعد 222 مرتبہ پڑھو۔ ''اَللّٰہُ اللَّطِیْفُ الرَّحِیْمُ۔'' مدت 41 دن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھ سے تعویذ بھی منگوالو۔ حسب استطاعت خیرات کیا کرو۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

□ جنید۔ خیر پور

☆: بیٹے جنید! تمہارا خط طوالت کے باعث شائع نہیں کیا جارہا۔ انسان کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو باہر آنا چاہیے اور اس کے لیے مخلص دوست بہت ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ دوست کوئی ہم عمر ہی ہو۔ تمہارے والد، بھائی، بہن یا والدہ کوئی بھی تمہارا اچھا دوست بن سکتا ہے۔ اصل دوستیاں وہی ہوتی ہیں جو بچپن سے چلی آرہی ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ صرف ضرورت کے تحت دوستی کرتے ہیں۔ لوگوں سے خوش اخلاقی سے ملا کرو اور ایک فاصلہ رکھا کرو کہ انھیں یہ احساس نہ ہو کہ تم ان پر مسلط ہورہے ہو۔ ہنسا بولا کرو۔ اگر کوئی بات اچھی نہ لگے تو ضروری نہیں ہوتا کہ کھل کر مخالفت کی جائے۔ سب سے بہتر طریقہ خاموش ہوجانے کا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور صرف یا حمید کا کثرت سے ورد کرو۔ اچھی کتب کا فرصت میں مطالعہ ضرور کیا کرو۔ فارغ وقت کا اس سے اچھا مصرف اور کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ اپنی سوچ مثبت رکھو۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

□ انعم۔ ڈیرہ غازی خان

☆: بیٹی انعم! میں صرف ایک وقت میں دو مسائل کے جواب دیتا ہوں۔ بے شمار سوالات کے جواب دینا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال وظیفے کے بارے میں جو تم نے پوچھا ہے تو اس کی مدت 41 دن ہے۔ ایک وقت میں ایک جامع وظیفہ کئی مسائل کے لیے ارسال کیا جاتا ہے۔ میں خط پڑھ کر جواب دیتا ہوں لہٰذا وظیفہ مکمل ہونے پر مجھے حالات سے آگاہ کیا کرو۔

□ پروین۔ کراچی

o: محترم بابا جی! السلام علیکم! بہت سے لوگ مسائل کے سلسلے میں آپ کے تحریر کردہ وظائف وعملیات سے مستفید ہورہے ہیں اس لیے میں بھی آپ سے رجوع کررہی ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرا بھائی بیرون ملک جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس کا کام جلدی نہیں ہورہا۔ کوئی ایسا تعویذ دیں بابا جی کہ بیرون ملک جانے کا کام جلدی ہوجائے۔ بابا جی! اس کے علاوہ ہمارے گھر میں برکت نہیں ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتائیں کہ گھر کے حالات اچھے ہوجائیں۔ ابو جتنے بھی پیسے کما کرلاتے ہیں۔ جلد خرچ ہوجاتے ہیں۔ آپ جلد از جلد میرا مسئلہ حل کردیں۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔ (آمین)

☆: بیٹی پروین! انسان کو اپنے ہاتھوں سے راہ خدا میں ضرور کچھ نہ کچھ نکالنا چاہیے۔ اس عمل سے برکت رہتی ہے۔ نماز فجر کے بعد ایک مرتبہ سورۃ رحمان پڑھ کر رزق میں کشادگی اور برکت کی دعا کرو۔ نماز عصر اور نماز مغرب کے بعد 41-41 بار سورۃ النصر پڑھ کر اپنی حاجت بیان کرو۔ یہ عمل بھائی کرے تو بہتر ہے۔ مدت 41 دن ہے۔ اور ہوسکے تو فوری طور پر بھائی کے لیے تعویذ منگوالو۔

□ ارم۔ کراچی

☆: بیٹی ارم! نماز کی مکمل پابندی کرو اور ان تمام افعال سے پرہیز کرو جنھیں اللہ جل شانُہٗ، اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے۔ بعد نماز فجر ''سورۃ

آل عمران کی آیت نمبر 14 سے 18 تک ایک مرتبہ ضرور تلاوت کرلیا کرو۔ اگر بعد نماز فجر موقع نہ ملے تو مجبوراً بعد نماز عشاء بھی ان آیات کی تلاوت کرسکتی ہو۔ ان آیات مبارکہ کو مستقل طور پر اپنا ورد بنالو۔ جب دل زیادہ گھبرائے یا مایوسی کا غلبہ ہوتو ان آیات جلیلہ کو بلند آواز سے تین مرتبہ پڑھ لیا کرو کیونکہ دل میں مختلف قسم کے وسوسے اور مایوسی شیطان پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل عمل بھی کرلو۔

بعد نماز عشاء دو رکعت نماز نفل نماز حاجت کے طور پر ادا کرو۔ نماز حاجت کے بعد ایک مرتبہ ''تسبیح فاطمہؓ '' پڑھو پھر اسی جگہ قبلہ رخ بیٹھ کر ''سورۂ آل عمران'' کی آیات نمبر 26-27 کا 40 مرتبہ ورد کرو۔ جب چالیس مرتبہ پڑھ چکو تو ایک سفید کاغذ پر خوش خط انداز میں لفظ ''نجوم'' لکھو اور اسے اس جگہ پر چسپا کردوں جہاں تم نماز ادا کرتی ہو۔ ایک بات کا دھیان رکھنا کہ اس کمرے میں کسی بھی جاندار کی تصویر نہیں ہونا چاہیے۔ یوں تو گھر کے کسی بھی حصے میں تصویر کا ہونا جائز نہیں ہے لیکن اس کمرے میں خاص طور پر اس بات کا دھیان رکھنا۔ اب آئندہ سے اس لفظ ''نجوم'' کے حروف کو غور سے دیکھو اور سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیات مبارکہ کا ایک مرتبہ ورد کرو۔ اسی طرح اس لفظ کے حروف کو 40 مرتبہ دیکھو اور ہر مرتبہ سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیات مبارکہ کا ورد کرتی رہو۔ اس سریع الاثر عمل کی مدت چالیس روز ہے۔ ناغے کے دن شمار کرکے بعد میں پورے کرلینا۔ چالیس روز کے بعد تم خود اس رب رحیم کی رحمت کے نظارے دیکھوگی۔ وہ مہربان آقا ایسی رحمتیں نازل فرمائے گا کہ تمہارے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا۔ بس اس رب رحیم کی ذات برکات پر پختہ یقین اور اعتماد شرط ہے۔ (وہ تمام احباب جو تنگ دستی میں مبتلا ہیں یہ عمل کرسکتے ہیں، میری طرف سے اجازت ہے، بس نماز کی مکمل پابندی اور دروغ گوئی، حسد، غیبت اور دوسروں کا دل دکھانے سے پرہیز کریں)

☐ فاطمہ۔ لاہور

☆: بیٹی فاطمہ! ہر نماز کے بعد ایک تسبیح ''اِیاک نعبد وایاک نستعین'' پڑھنے کے بعد انتہائی خضوع وخشوع اور خلوص نیت سے اپنی حاجت اس مہربان آقا کے حضور پیش کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ ''سورۂ طٰہٰ'' کی آیات نمبر 131-132 ہر نماز کے بعد بکثرت پڑھو۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری جائز دلی خواہش ضرور پوری ہوگی۔ اس عمل کی کوئی مدت نہیں۔ جب تک حالات میں بہتری کے آثار پیدا نہ ہوں، یہ عمل کرتی رہو۔ دو ماہ بعد مجھے نتائج سے مطلع کرنا۔ دوسرے مسئلے کے لیے تمھیں تعویذ منگوانے کا کہوں گا۔

☐ سرور۔ اٹک

o: بابا جی! السلام علیکم! میں نے دو ماہ قبل آپ سے اپنے مسئلے کا حل دریافت کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ کی دعاؤں کے طفیل میرا مسئلہ حل ہوگیا ہے اور مجھے بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ بابا جی! میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں۔ جن سے آپ کا شکریہ ادا کرسکوں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق خیرات بھی دے رہا ہوں۔

☆: بیٹے سرور! شکریہ میرا نہیں بلکہ اس مالک حقیقی کا ادا کرو جس نے مجھ عاصی وگناہ گار کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہر دم اسی رب رحیم کا شکر ادا کرتے رہنا اور نماز سے غفلت کبھی مت برتنا۔ اپنی جائز آمدنی میں سے حسب استطاعت خیرات ضرور کرتے رہنا اور اس بات کا دھیان رکھنا کہ خیرات مستحقین تک پہنچے۔

☐ ارشد خان۔ KPK

o: محترم ومکرم بابا جی! السلام علیکم! آپ نے اب تک لاکھوں افراد کے مسائل حل کیے ہیں۔ میں بھی اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گزشتہ کئی سال سے بے روزگاری کا عذاب جھیل رہا ہوں۔ صرف ایک بہن اسکول میں پڑھاتی ہے، اسی سے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ مکان بھی کرائے کا ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نفسا نفسی کے اس دور میں اپنا پرایا کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا اور کوئی بھلا کب تک ساتھ دے سکتا ہے۔ بابا جی! کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی اس فضول اور ناکارہ زندگی کا خاتمہ کرلوں مگر پھر ماں اور بہن بھائیوں کا خیال آجاتا ہے۔ میرے بعد تو وہ بالکل بے آسرا ہوجائیں گے۔ بابا جی! اب آپ ہی میری آخری امید ہیں۔ اللہ

کے واسطے مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ مجھے بے روزگاری کے اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔

☆: بیٹے ارشد! زندگی میں اس قسم کے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے یہ گویا بندے کی آزمائش ہوتی ہے۔ انسان کو کسی بھی صورت میں مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ مایوسی کا شکار ہونا کفر کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ تم نے نماز بھی ترک کر دی ہے۔ اس غفور الرحیم سے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگو اور نماز کی پابندی کرو۔ یہ ایسی فرض عبادت ہے جو کسی بھی حال میں ترک نہیں کی جاسکتی۔ اسی کے ذریعے اللہ اور بندے میں تعلق قائم ہوتا ہے۔ تم اپنے دل میں یقین تو پیدا کرو کہ سب کچھ اسی کے در سے اور اسی کے حکم سے ملتا ہے اور ہر مانگنے والے کو ملتا ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ تم مجھ سے مانگو، میں تمہیں دوں گا اور یہ بات ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو کہ اللہ رب العزت اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ میں تمہارے لیے انتہائی زود اثر اور آزمودہ وظیفہ تحریر کر رہا ہوں مگر نماز کی مکمل پابندی اور مکروہات سے پرہیز شرط اولین ہے۔

دو رکعت نماز حاجت اس طرح پڑھو کہ چاروں سجدوں میں (سجدہ کے بعد) چالیس چالیس مرتبہ آیت مبارکہ ''لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔'' پڑھو۔ یہ عمل کسی بھی فرض نماز کے بعد کر سکتے ہو مگر نماز عشاء کے بعد کرو تو بہتر ہے۔ چاند کی اولین جمعرات (نوچندی جمعرات) سے شروع کرنا۔ اس عمل کی مدت سات دن ہے۔ اس عرصے میں انشاء اللہ تمہارے حالات میں خوش گوار تبدیلیوں کی ابتدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ بعد نماز عشاء کے بعد ایک مرتبہ ''سورۂ واقعہ'' کی تلاوت کر لیا کرو اور ہمیشہ کرتے رہو۔ باری تعالیٰ کے فضل و کرم سے کبھی رزق کی تنگی نہ ہوگی۔ سات دن بعد مجھے نتائج سے آگاہ کرنا۔ ان سات دنوں میں کثرت سے ''یاحی یاقیوم برحمتک استغیث'' کا ورد کرتے رہنا اور کوشش کرنا کہ ہر نماز جماعت کے ساتھ ادا ہو۔

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

کنکری سونا ہوگئی

حضرت خالد بن عبدالعزیزؒ سے روایت ہے کہ پرانے وقت میں ایک حافظ الحدیث بہت ہی مفلوک الحال اور تنگدست تھے۔ اور خوف خداوندی سے دن رات رویا کرتے تھے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عالم تنہائی میں انتہائی گریہ زاری کے ساتھ دعا مانگ رہے ہیں۔ مجھے ان کی غریبی پر بڑا ترس آیا تو میں نے عرض کیا کہ کیوں نہیں آپ خداوند عالم سے دعا مانگتے کہ وہ آپ کو اتنی دولت عطا فرمائے کہ آپ کی تنگ دستی دور ہو جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت نے دائیں بائیں مڑ کر دیکھا اور زمین سے کچھ کنکریاں اٹھائیں تو وہ سونا بن گئیں اور انھوں نے ان کو میری طرف پھینک دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ان سونے کے ٹکڑوں کو کیا کروں۔ تو فرمایا کہ تم ان کو اپنے اہل وعیال پر خرچ کر ڈالو۔ خالد بن عبدالعزیزؒ کا بیان ہے کہ میں اس حال اور اُن کے جلال سے اس قدر خائف ہوگیا کہ مارے ڈر کے ان کے فرمان کو ٹال نہ سکا۔ اور میں ان سونے کے ٹکڑوں کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔ ان واقعات سے ان متکبرین کو عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ جو اولیاء اللہ کے خداداد کرامات کے انکار اور بزرگان دین کی توہین کرتے ہیں۔ ان کو کیا خبر کہ وہ لوگ جو اپنی ایک نظر ڈال کر مٹی کو سونا بنا دیتے ہیں۔

مراسلہ: ملک علی رضا۔ اسلام آباد

اعتبار و خلوص

اعتبار و خلوص کا راستہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اس میں انسان آنکھیں بند کیے دوسرے شخص پر اپنا اعتبار و خلوص لٹا رہا ہوتا ہے۔ پر یہ آنکھیں جب کھلتی ہے جب وہی شخص دور کھڑے آپ کے خلوص کا مذاق اڑاتے ہوئے آپ کے اعتبار کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے تو ایسے میں افسردہ نہ ہو وہ شخص تو اپنا ظرف دکھا کر چلا گیا۔ آپ اپنے خلوص و اعتبار کو سنبھال کر رکھیے اور اس اعتبار و خلوص کو وہاں لٹائیں۔ جو اس کے قابل ہے۔

زور قلم: فرح انیس۔ کراچی

حکمت کی باتیں

☆ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو اُسے نیک لوگوں کی عیب جوئی میں مشغول کر دیتا ہے۔

☆ اگر تمہارے اعمال اور کردار سے اللہ کی مخلوق خوش ہو تو سمجھ لو کہ تمہارا رب بھی تم سے راضی ہے۔

☆ زندگی تب بہتر ہوتی ہے جب آپ خوش ہوتے ہیں لیکن زندگی تب بہترین ہوتی ہے جب آپ کی وجہ سے کوئی دوسرا خوش ہوتا ہے۔

☆ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھلا دے پر کسی کی دی ہوئی محبت اور عزت کبھی نہ بھلائے۔

☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھائی کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

☆ زندگی میں اچھے لوگوں کی تلاش مت کرو خود اچھے بن جاؤ شاید کسی کی تلاش پوری ہو جائے۔

☆ خوبصورتی ایک نعمت ہے لیکن سب سے خوبصورت آپ کی زبان ہے چاہے تو دل جیت لے اور چاہے تو دل چیر دے۔

انتخاب: ممتاز احمد۔ سرگودھا

یاد آتے ہو

ہمیں ایسا کیوں لگتا ہے
بہت مصروف رہنا ہے
تمہارے واسطے نعمت
کہ یوں مصروف رہنے سے
تمہیں پچھلی کوئی باتیں
کوئی قصہ کوئی یادیں
اذیت دے نہیں پاتیں
بہت مصروف رہتے ہو
صبح سے شام ہونے تک
کبھی ہم کہہ نہیں پاتے
بہت تم یاد آتے ہو
قسم سے یاد آتے ہو......

شاعر: عماد حسین انصاری۔ کراچی

پرہیزی مہمان

مہمانوں کی جان لیوا قسم تو وہ ہوتی ہے۔ جو پرہیزی غذا کھاتی ہے اور یہ کہتی نظر آتی ہے کہ نا جی چائے تو میں نہیں پیتا۔ آدھا سیر دہی کی لسی اور دو قلچے تو میرے لیے زہر ہیں۔ لقمہ اندر گیا اور انتڑیاں سوجی۔ کھچڑی اور دلیے کے سوا کچھ کھا ہی نہیں سکتا۔ رات سونے سے پہلے دودھ تو میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ہر کھانے کے بعد دو سیب...... میرے لیے کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔ میں کہاں یہ مرغن کھانے ہضم کر سکتا ہوں؟

پھر یہ کہتے ہی نظر آتے ہیں کہ میں مہمان تھوڑا ہی ہوں۔ یہ تو میرا اپنا گھر ہے۔ آپ تکلف نہ کریں میں تو صرف دو وقت دودھ پیتا ہوں۔ ناشتے کے ساتھ ڈبل روٹی، مکھن اور دو ہاف بوائل انڈے...... البتہ شام کو بکرے کے گوشت کی یخنی ضرور پیتا ہوں اور دوپہر کے کھانے کے ساتھ دہی ضرور ہو۔ بس آپ کوئی تکلف نہ کریں۔ مجھے ڈاکٹر نے سختی سے پرہیز کا کہہ رکھا ہے۔''

(عنایت اللہ خان کے مضمون ''کلیم کے سلسلے میں''

حجامت

سے جواد انور، اسلام آباد کا انتخاب)

فوجی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی تقریر شروع کی۔ چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا۔ ''بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔'' لمبے بال رکھنے والے فوجیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

کمانڈر نے کہا۔ ''آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں مگر ان کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ نہ ہو۔''

اس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سولجر کٹ حجامت دکھائی۔ ''اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔''

سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی، وہ گنجا تھا۔

ایک وعدہ

مرسلہ: شاہانہ احمد۔ کراچی

کتنے وعدے کیے تھے اس نے
یاد دلایا تو چونک گیا
اتنے وعدوں سے کیا نباہ کرتا
جو ایک وعدے کی آس رکھ نہ سکا
اپنے کہنے کا پاس رکھ نہ سکا

دفاع

شاعرہ: نوشابہ صدیقی

مقدمے کی ساعت آخری مراحل میں تھی ملزم نے مطالبہ کر دیا کہ وہ اپنے وکیل صفائی کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے۔ اس لیے اسے وکیل تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے۔

جج صاحب بولے۔ ''پولیس نے تمہیں ڈاکا ڈالتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ دکان دار نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے۔ زیورات بھی تمہارے قبضے سے برآمد

ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تم آٹھ مرتبہ کے سزا یافتہ ہو۔ تمہارے خیال میں اب کوئی دوسرا وکیل تمہارے دفاع میں کیا کہہ سکتا ہے۔"

ملزم نے جواب دیا۔ "یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔"

وقت

مرسلہ: اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

ایک مسافر نے اسٹیشن پر کھڑے گارڈ سے پوچھا۔
"گارڈ صاحب! کیا گاڑی چلنے میں اتنا وقت ہے کہ میں چائے پی کر آجاؤں۔" گارڈ نے مسافر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"گاڑی آنے میں ابھی وقت ہے اور اس بات کا یقین دلانے کے لیے میں خود آپ کے ساتھ چائے پینے کے لیے جا سکتا ہوں۔"

غزل

مرسلہ: ممتاز اقبال اعوان۔ داروغہ والا لاہور

ابھی تو رات باقی ہے یہ ڈھل جائے تو سو جانا
میرے ہمدم دلِ ناداں سنبھل جائے تو سو جانا
سناؤں تم کو جی بھر کے میں اپنی داستانِ غم
یہ ہے ارمان اِس دل کا نکل جائے تو سو جانا
تسلسل ہچکیاں، جینے کی حسرت، ٹوٹتی سانسیں
گھڑی یہ سخت ہے کتنی یہ ٹل جائے تو سو جانا
ستارے مسکرائیں چاند کی سرگوشیاں سن کر
میری جاں یہ حسیں منظر بدل جائے تو سو جانا
مرے دلبر مرے جانی ہمارے وصل کا لمحہ
یہ تنہائی کی ناگن کو نگل جائے تو سو جانا
بہت سہما ہوا رہتا ہے خالد یہ دلِ ناداں
یہ دل اِک لمحہ بھر کو بھی بہل جائے تو سو جانا

اولاد کی پرورش کرنے کے چند اصول

شاعر: خالد یوسفی۔ سرگودھا

بچپن میں جو عادت بھلی یا بری پختہ ہوجاتی ہے وہ عمر بھر نہیں جاتی۔ لہٰذا اس لیے چند باتوں کا خیال رکھیں۔

☆: عورتوں کی عادت ہے کہ بچوں کو کہیں سیاہی سے ڈراتی ہیں کہیں ڈراؤنی چیزوں سے۔ سو یہ بری بات ہے...... اس سے بچے کا دل کمزور ہوتا ہے۔

☆: دودھ پلانے اور کھانا کھلانے کا وقت مقرر رکھیں۔ اس سے صحت پر اگہرا اثر پڑتا ہے۔

☆: بچوں کے ہاتھوں سے غریبوں کو کھانا، پیسہ اور دیگر ایسی چیزیں دلایا کرو۔ نیز بہن بھائیوں کو آپس میں چیزیں تقسیم کروایا کرو۔

☆: وقت نکال کر نیک لوگوں کی حکایتیں اور قصے سنایا کرو۔

☆: جب بچہ کوئی بات یا خوبی ظاہر کرے تو اس پر خوب شاباش دو بلکہ حتیٰ الامکان انعام بھی دو۔ اس سے صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔

☆: ماں کو چاہیے کہ بچہ کو باپ سے ڈراتی رہے۔

میل کچیل

حسنِ انتخاب: محمد ندیم عباس میواتی۔ پتوکی

خلیل جبران کا ایک دھوبی گھاٹ سے گزر ہوا۔ وہاں ایک دھوبی کپڑے دھونے میں مصروف نظر آیا۔ خلیل جبران نے اس سے پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو؟"

دھوبی نے جواب دیا۔ "میں کپڑوں سے میل کچیل نکالتا ہوں۔ دھوبی نے خلیل جبران سے پوچھا آپ کیا کرتے ہو؟

خلیل جبران نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم کپڑوں کا میل کچیل نکالتے ہو اور میں دلوں کا میل کچیل نکالتا ہوں۔

دیر آید

مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

میکسیکو سٹی کا ایک رومانی جوڑا جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ ہر کام بہت غور و خوض کے بعد کرنا چاہیے۔ لہٰذا وہ دونوں منگنی کے بعد 62 برس تک شادی کے سوال پر غور کرتے رہے اور آخر جب وہ ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے تو انھوں نے شادی کر لی۔ شادی کے وقت ان کی عمر 82 برس تھی۔

مرسلہ: کاشف عبید۔ بٹ گرام



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

الفت جہاں..........کراچی

دعا نہ مانگو تو غم سے رہائی دیتا نہیں
سنائی دیتا ہے لیکن دکھائی دیتا نہیں

فہد نسیم..........کویت سٹی

اگرچہ پیار کا قصہ ہے دو دلوں کا مگر
ہے ایک تیسرا کردار بھی کہانی میں
پھر اس کے بعد یہی دھجیاں بکھیریں گے
ابھی جو لوگ لگے ہیں قصیدہ خوانی میں

نسیم شفیق..........اسلام آباد

ہوا سے کوئی تو کرتا ہے مخبری جاکر
چراغ جب بھی جلاتا ہوں روشنی کے لیے
کہ دشمنی تو ہماری سرشت ہی میں نہیں
ہمیں خدا نے بنایا ہے دوستی کے لیے

ایم افضل آزاد..........ساہیوال

کہاں تک بے ارادہ خوش رہیں گے
بچھڑ کر ہم زیادہ خوش رہیں گے
یہ سوچا تھا کہ اگلے شہر میں جب
مکاں ہوگا کشادہ، خوش رہیں گے

رضوانہ کوثر..........لاہور

کھلتا نہیں آنکھوں پر افلاک گردش سے
سورج ہے کہ شعلہ ہے، تارا ہے کہ چنگاری
یہ بزمِ غزالاں ہے ہشیار ذرا رہنا
اک چشمِ گرفتہ ہے مصروفِ طرحداری

شمائلہ اختر..........لاہور

کبھی چراغ بجھائے گا راستوں کے تمام
کبھی ہواؤں میں روشن چراغ کردے گا
شکستِ شیشۂ محبت سے دل لہو ہے مرا
وہ کون ہے جو مرا ساتھ عمر بھر دے گا؟

ارم اظہر..........کراچی

صبح ہوتے ہی چلے جاتے ہیں
خواب تعبیر کو کھا جاتے ہیں

احمر عبدالغنی..........کراچی

رائیگانی ہی سہی، اس کا حوالہ تُو ہے
میں تو خوش ہوں کہ مرا شہر تمنا تُو ہے
کیوں نہ جھک جائے محبت سے مرے دل کی جبیں
یہ ترا نقشِ کفِ پا بھی تو گویا تُو ہے

نبیل جاوید..........سرگودھا

ہم اہلِ عشق بہت بدگمان ہوتے ہیں
اسی طرح کا کوئی وصف تیری ذات میں تھا
ہوائے ہاتھ میں جیسے چراغ جل اٹھیں
یہی کمال تری جستجو کی رات میں تھا

معاویہ عنبر وٹو..........ہڑپہ

بستر سے کروٹ کا رشتہ ٹوٹ گیا اک یاد کے ساتھ
خواب سرہانے سے اٹھ بیٹھا تکیے کو سرکانے میں

نگہت منیر..........اوکاڑہ

ترتیب الٹ کر جو دیکھیے حروف کی
بارش سے ربط کوئی تو ہوگا شراب کا

اُم حبیبہ..........اسلام آباد

اب دل کی وحشتوں سے مرا واسطہ نہیں
اک نبض رازداں تھی، سو وہ بھی خموش ہے

کاشف نبی خان.........کراچی

جیسے دھاگہ ہو کوئی تسبیح کا
میری سانسوں کے درمیاں تو ہے

شعبان کھوسہ.........کوئٹہ

تو نے اے عشق یہ سوچا کہ ترا کیا ہوگا
میں ترے سر سے اگر ہاتھ اٹھا لیتا ہوں؟

عادل گلزار.........فیصل آباد

بخت جب سازگار ہوتا ہے
زرد موسم بہار ہوتا ہے

کرن شہزادی.........راولپنڈی

میں ہوں اخبار، محبت مری پیشانی پر
روز اک آس کے مرنے کی خبر لگتی ہے

زینب علی.........ملتان

اب تو بس تیرا خیال آتے ہی
صرف احساسِ زیاں ہوتا ہے
یوں تو چھوڑ آئے ہیں ماں کا آنگن
دل مگر اب بھی وہاں ہوتا ہے

مقصود بلوچ.........دادو

طوفاں کے باوجود سمندر ہے پرسکوں
کشتی سے بادباں کا تعلق کچھ اور ہے

فائزہ ناز.........پپری

بے حسی کا علاج کون کرے
آدمی بھی مشین جیسا ہے

سلمان عمرانی.........سجاول

جو زندہ لوگ ہیں، وہ دھیان رکھیں
نگر آباد اک زیرِ زمیں ہے
زمانہ شہر کی رونق میں ہے گم
بس اک شادابؔ ہی گوشہ نشیں ہے

نعمان الطاف.........کراچی

اتنی ساری ضرورتوں کے بیچ
کیسے ہوتا ہے خود کفیل کوئی
کھنچ رہا ہے دل اس کی جانب کیوں
پاس اپنے نہیں دلیل کوئی

شاہدہ سعید.........پسرور

محدود کر نہ ذہن کی ہنگامہ خیزیاں
وہ آئینہ تراش کہ دنیا دکھائی دے

عابدہ بیگم.........کراچی

دردِ دل میں اٹھا تھا اچانک
کچھ نہ کچھ ہو رہے گا اچانک
میں ہوں راہِ عدم کا مسافر
ہار جائے گی دنیا اچانک

جمیلہ کنول.........لیاری ایکسپریس، کراچی

بغیر ہار جیت کے اگر کوئی فریق بھی
شکست اپنی مان لے تو پھر فساد کیسے ہو؟
نصابِ عشق کے سوا کچھ اور یاد کیسے ہو؟
ہمارے قول و فعل میں بھلا تضاد کیسے ہو؟

حاصم وقاص.........لاہور

ہم بے خبر تھے اور وہ زمانہ شناس تھا
ہر بار جیتنے کا ہنر اس کے پاس تھا

شازیہ رضوی.........کراچی

خواب ہی خواب ہتھیلی پہ لیے پھرتی ہوں
میرا یوسف کوئی تعبیر بتاتا ہی نہیں
خیمہ زن ہونے کو ہے پھر کسی صحرا میں حسن
میرا دل میرے قبیلے میں سماتا ہی نہیں

کوپن برائے

تیر نیم کش

اپریل 2016ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا: